گارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے اُفق
کراچی

ابتدائیه

سچی کہانیاں

ناول

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 نئے افق پبلی کیشنز کے مطبوعات ای میل Info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

جیسی روح ویسے فرشتے......!!

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب نظام کائنات اور کائنات تخلیق فرمائی تو اپنی ہر مخلوق کو ایک خاص فطرت عطا فرمائی۔ جس طرح انسان کی اولاد انسان ہی پیدا ہوتا ہے ایسے ہی ہر جانور کی اولاد اس کی ہی نسل سے ویسا ہی جانور پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر بیج کی پیداوار وہی ہوتی ہے جس کا وہ بیج ہوتا ہے یعنی گندم سے گندم' کیکر سے کیکر' گلاب سے گلاب' آم سے آم ہی پیدا ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ بیج تو آپ نے زمین میں گندم کا بویا ہو اور فصل جو کی اگے اور یہ تو ارشاد الٰہی ہے کہ جس طرح کے انسانوں کے اعمال ہوں گے ان پر اسی طرح کے حکمران مسلط کیے جائیں گے۔ اگر ہم بحیثیت مسلمان اس حکم الٰہی پر غور وفکر کریں تو بات بہت آسان اور سیدھی بچی ہے۔ جو آسانی سے ہماری سمجھ میں آسکتی ہے' لیکن شاید ہم سمجھنا نہیں چاہتے اور شیطان کے بہکاوے میں پھنسے رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارے حکمران ہوں یا تمام کے تمام سیاسی لیڈر وہ سب بھی ہماری طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہی مخلوق ہیں وہ بھی ہم آپ کے درمیان سے ہی اٹھ کر ہماری رہنمائی کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ ہم میں جو ہم سب سے زیادہ تیز طرار ہوتے ہیں وہ ہماری رہنمائی کے نام پر ہم پر حکمرانی کرنے لگتے ہیں۔ ان میں سے جو کچھ کم بدمعاش یا کم تیز وطرار ہوتے ہیں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں اور مخالفین حکومت یا اپوزیشن کہلاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنے حریفوں کو اقتدار سے ہٹا کر تخت کو حاصل کرلیں۔ عوام جن کی رہنمائی رہبری کا انہوں نے بیڑا اٹھایا ہوتا ہے وہ کہیں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں گو کہ عوامی نمائندگی کے یہ سارے دعویٰ دار خود عوام کا ہی حصہ ہوتے ہیں لیکن اصل میں عوام سے بالاتر ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان سے زیادہ چالاک' ہوشیار اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔ عوام ان کی بے اعتنائیوں اور اپنی محرومیوں کا سارا الزام اپنے ان ہی لیڈروں اور حکمرانوں پر ڈالتے ہیں جو ان کی بھیڑ چیر کر ان سے آگے نکل گئے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تیزی میں اتنے آگے نکل جاتے ہیں کہ انہیں نہ تو پلٹ کر دیکھنے کا موقع ملتا ہے نہ ہی ایسا کرنے کا ان کے پاس وقت ہوتا ہے۔ لیکن عوام خصوصاً غریب عوام اپنے سے آگے نکل جانے والوں سے بہت سی توقعات وابستہ کرلیتے ہیں حالانکہ آگے جانے والے کسی نے انہیں کوئی خاص امید نہیں دلائی ہوتی لیکن عوام پرامید ہوتے ہیں کہ یہ جو ہماری رہنمائی رہبری کا دعویٰ کررہے ہیں ضرور ہماری قسمت پلٹ دیں گے۔ ہاں وہ قسمت تو پلٹ دیتے ہیں لیکن اپنی اپنی اگر عوام کی قسمت کسی طرح ان کے ہاتھوں میں آجاتی ہے تو وہ اسے بھی پلٹ دیتے ہیں اپنے مفادات کے حصول کے لیے یہ اور بات ہے کہ وہ عوام کی قسمت کا تختہ ہی کردیتے ہیں۔

دراصل جو کام ہم خود نہیں کرنا چاہتے اس کی امید اور توقع ہم ان سے کرتے ہیں جو ہماری رہنمائی اور حکمرانی کے دعوے دار ہوتے ہیں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ شخص جو خود تو کوئی نیک یا اچھا کام نہیں کررہا ہوتا لیکن اپنی اولاد اپنے ماتحت کو نصیحت کررہا ہوتا ہے کہ وہ اچھا کام کرے نماز پڑھے' اطاعت گزاری' فرمانبرداری کرے۔ ہر وہ کام جو میں خود نہیں کرتا یا نہیں کرسکتا اسے کرنے کی امید میں دوسروں سے رکھتا ہوں۔ اگر انسان خصوصاً

مسلمان اللہ کے احکام کو سمجھ لے غور وفکر کرلے اور سب سے پہلے خود اپنی اصلاح کرلے خود کو ہر طرح سے درست کرلے اور اپنے ساتھ ساتھ اپنے گھر کے افراد کی اصلاح وفلاح پر توجہ دے خود کو اپنے گھر کے افراد کے لیے مثال بنا کر پیش کرے یہ سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے کہ اللہ کی محبوب ترین شخصیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر قول وفعل کو خود عملی طور پر کرکے دکھایا سمجھایا ہے کیسا ہی کوئی کام کوئی فعل وعمل رہا ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کردار اپنے عمل سے واضح کیا ہے اور یہی سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی ہے۔ اگر آج ہم اپنی اصلاح کا بیڑا اٹھالیں اور کسی دوسرے پر انگلی اٹھانے اور اسے نصیحت کرنے اس کی اصلاح کی خواہش کرنے کے بجائے ہم خود اپنی اصلاح کی کوشش شروع کردیں تو یہ معاشرہ یہ نظام حکومت یہ نظام حیات خود بخود درست ہوجائے گا۔ پہلے ہم خود اپنی اصلاح کرلیں تب ہی ہم کسی کی اصلاح وفلاح کی بات کرسکتے ہیں۔ ہمارے ہادی برحق ہمارے رہنمائے حق نے تو ہر ہر طرح ہمیں سکھایا' بتایا' سمجھایا ہے۔ اپنے عمل اپنے قول سے لیکن ہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

ایک واقعہ تاریخ اسلام میں درج ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خاتون اپنے بچے کو لے کر حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا یہ بیٹا گڑ بہت کھاتا ہے آپ اسے نصیحت فرمادیں کہ یہ گڑ نہ کھایا کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کی طرف دیکھا تبسم فرمایا اور خاتون سے فرمایا کہ اس بچے کو لے کر دو روز بعد آنا خاتون حیران پریشان لوٹ گئیں۔ جب دو روز گزرنے پر وہ دوبارہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بچے کو لے کر حاضر ہوئیں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی شفقت محبت سے بچے کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا کہ گڑ نہ کھایا کرو ایسا تمہاری ماں کی خواہش ہے۔ خاتون حیران رہ گئیں اور انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ یہ بات تو آپ اس وقت بھی فرماسکتے تھے۔ جب میں پہلے آپ کے پاس حاضر ہوئی تھی تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرماتے ہوئے فرمایا کہ بی بی اس وقت تو میں خود بھی گڑ کھاتا تھا پھر میں کیسے اس بچے کو گڑ کھانے سے روک سکتا تھا۔ اللہ اکبر نبی کریم صلی اللہ علیہ نے کیسی عظیم مثالیں قائم فرمائی ہیں۔ اپنے ہر قول کو اپنے عمل سے ثابت فرمایا ہے اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بحیثیت مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں تو ہمیں صرف نبی کریم کی سنت کے مطابق خود کو ڈھال لینا چاہیے۔ پھر دیکھیں کہ مسلمان کس طرح دنیا کی سپر پاور بن جاتے ہیں۔ اللہ بھی ان کی ہی مدد فرماتا ہے جو خود اپنی مدد آپ پر کمر کس لیتے ہیں اور یہ تو اللہ کا فرمان ہے کہ اگر میرا کوئی بندہ میری طرف ایک قدم بڑھتا ہے تو میں خود اپنے بندے کی طرف دس قدم بڑھتا ہوں اگر ہم اپنی اپنی انفرادی اصلاح کرلیں تو پھر از خود معاشرے کی اصلاح ممکن ہوسکے گی کیونکہ افراد سے ہی ملت اور قوم وجود پاتی ہے اور جب کوئی قوم اللہ کی راہ پر چل پڑے تو پھر اس کا راستہ روکنے والا کوئی اس روئے زمین پر نہیں رہتا جو اسے روک سکے۔ ورنہ تو یہی ہوتا ہے جیسی روح ویسے ہی فرشتے اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام کی سمجھ عطا فرمائے صحیح معنوں میں مومن بنائے اور اپنی اصلاح کرنے اور سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہماری ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے آمین۔

گفتگو

عمران احمد

"حضرت انسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اسے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔" (البخاری، باب حلاوۃ الایمان)

عزیزان محترم...... سلامت باشد

اس وقت جب ہم آپ سے گفتگو کر رہے ہیں عام چناؤ برائے 2013ء کو دو دن باقی ہیں جب تک نئے افق آپ کے ہاتھوں تک پہنچے گا وطن عزیز میں ایک نیا سویرا طلوع ہو چکا ہوگا۔ امید ہے پرانے چہرے ہی نئے میک اپ کے ساتھ منتخب ہوئے ہوں ہو گے ایسا ہم مختلف سروے کے نتائج کو مدنظر رکھ کر کہہ رہے ہیں البتہ ہمیں ایک بات جان کر بہت خوش گوار حیرت ضرور ہوئی ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی اس پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک سروے کے مطابق پاکستانی نوجوانوں کی اکثریت ملک میں شرعی قوانین کی حامی ہے سبحان اللہ۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ابھی ہم سے مایوس نہیں ہوا بلکہ اسے توقع ہے کہ ہم ٹھوکریں کھا کر اس کے راستے پر ضرور آ جائیں گے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اور شرعی قوانین میں ہی ہمارے ہر مسئلے کا حل موجود ہے ہماری آج کی نسل جو نام نہاد ملاؤں کے کردار اور الٹی سیدھی تاویلوں کے باعث دین سے دور ہو گئی تھی اب اپنی زندگی میں اسلام کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کرنے لگی ہے، یقیناً ہم اس کے راستے پر ضرور آئیں گے جب ہم ابلیس ملعون کو ٹھکرائیں گے تو یہی دنیا ہمارے قدموں میں ہوگی ان شاء اللہ۔

بہت سے قارئین نے پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی پر تنقید کرتے ہوئے ان پر سرقہ کا الزام لگایا ہے تحقیق پر یہ الزام درست ثابت ہوا ہے لہٰذا آج کے بعد پروفیسر صاحب کی کوئی تحریر نئے افق کے صفحات کی زینت نہیں بنے گی۔

شہناز بانو...... کراچی۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم اور دعائیں۔ سارے کراچی والوں کے لیے خصوصی خیریت اور باقی ساتھیوں کی بھی خوشیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ آج کل ملک کے حالات خصوصاً کراچی کے حالت بہت زیادہ خراب ہیں۔ روزانہ بم دھماکے اور فائرنگ کے واقعات میں کتنے ہی گھروں کے چراغ گل ہو رہے ہیں۔ اللہ پاک ہم سب پر رحم کرکے ہماری خطاؤں اور کوتاہیوں کو معاف کرے اور ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے ملک میں آج کل الیکشن کی گہما گہمی ہے۔ ہر سیاسی لیڈر دوسروں کو برا کہہ کر خود بلند و بانگ دعوے کر رہا ہے لیکن الیکشن جیتنے کے بعد سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے ہمیشہ کی طرح اور ہمارا حال وہی رہے گا۔ سب سے پہلے گفتگو کے صفحات کی جانب آتی ہوں۔ میں سب سے پہلے اور بے قراری کے ساتھ ساتھیوں کے خطوط پڑھتی ہوں اور ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی کئی بار پڑھتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ سب میرے اپنے ہیں لو بھئی شبنمی بھی حاضر ہو گئیں تمام لڑکیوں کے لیے میری "خصوصی" دعا کے لیے شکوہ کناں ہیں اللہ کرے اور بھی لڑکیوں کی مجھے اچھی اچھی خبریں سنائی دیں۔ اس مرتبہ گفتگو میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ عبداللہ شاہد خوش ہو جائیں آج تو محفل میں رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ نازش بھئی کیا بات ہے تمہارے اوپر میرے سمجھانے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ پریشانی چھوڑو اور خوش رہو۔ سب ٹھیک ہوگا میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ تمہاری اسٹوریز ہی کیوں گم ہوتی ہیں؟ باقی کوئی اور تو یہ شکوہ نہیں کرتا اور ہاں تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے میری ناول پڑھنے کی تم صرف کہانیاں لکھو...... کیونکہ تم ٹھہریں ایک مصروف رائٹر، تمہیں لکھنے سے فرصت ملے گی تو کچھ پڑھو گی نہیں پڑھتیں تو نہ پڑھو۔ یہ بات مجھے جتا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ بیٹا جتنی آپ کی عمر ہے اس سے زیادہ مجھے لکھتے ہوئے وقت گزر گیا ہے اللہ تمہیں زندگی کے ہر قدم پر کامیابی اور خوشیاں عطا کرے۔ ماہنامہ ریشم کی جانب سے ایوارڈ ملنے پر بہت مبارک ہو۔ این شاہین کافی دنوں کے بعد آئیں کہہ رہی ہیں کہ "انجان شخص کہاں سے ٹپک پڑا۔" تو جناب میرے دماغ سے ٹپک پڑا اور سناؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے تم نے گھر آنے کا کہا تھا۔ کیوں نہیں آئیں میں انتظار کر رہی ہوں۔ دیکھو ریاض بٹ بھائی کو یہ قسط دوسری قسطوں سے زیادہ اچھی لگی ہو سکتا ہے اس کی وجہ اس نئے کردار کا اضافہ ہو۔ ریاض بھائی آپ کی پسندیدگی کے لیے

بہت شکریہ۔ ریاض حسین قمر بہترین تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ اس شمارے میں موجود آپ کی غزل اچھی لگی۔ محمد اسلم جاوید کم کم آتے ہیں آپ کی آمد اچھی لگی۔ آتے رہا کریں۔ سلمٰی غزل آپ پراسرار کہانیاں لکھ کر بھجوائیں اس کے لیے پراسرار نمبر کا نکلنا ضروری تو نہیں ہے مجھے پراسرار کہانیوں سے بہت دلچسپی ہے جیسے ریاض بٹ تفتیشی کہانی لے کر آتے ہیں آپ پراسرار کہانی بھیجا کریں۔ ویسے میرا بہت دل چاہ رہا ہے کہ نئے افق کا پراسرار نمبر نکلے۔ عمران بھائی کو مشورہ بھی دیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں انہوں نے سنجیدگی سے نہیں لیا اگر اور لوگ بھی چاہتے ہوں تو ضرور لکھیں۔ سوئٹ طاہرہ جبیں اتنا مختصر سا خط بھائی فقیر لنگاہ اللہ آپ کو صحت دے خرابی صحت کے باوجود آپ نے خط لکھا بہت اچھا لگا۔ عبداللہ شاہد اس مرتبہ بہت مشکل الفاظ منتخب کرکے خط لکھا ہے۔ بھائی ہر ایک کی تو سمجھ میں بھی نہیں آتے ہوں گے تم بھائی جاوید صدیقی سے گلے مل لیے ہم سب بھی خوش ہو گئے مبارک ہو مٹھائی کھلاؤ اس ملن پر...... او دیکھو تم نے جن خواتین کو دل سے یاد کیا تھا اس مرتبہ ساری کی ساری حاضر ہو گئی ہیں مبارک ہو ڈیئر عالیہ کیسی ہو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم نے ہماری غیر حاضری کو اتنا زیادہ محسوس کیا بھئی ہم تو کہتے ہیں کہ دفتر سے ہمارا نمبر لے لو اور فون پر بات کر لو مجھے یقین ہے تمہیں بہت اچھا لگے گا۔ تم نے اپنے ایک خواب کا ذکر کیا ہے جس میں اپنی مرحومہ والدہ کو دیکھا انہوں نے تمہیں خبردار کیا اور بھائی کا خیال رکھنے کا کہا تو میری بہن حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا سے جانے والی روحوں کا دنیا سے رابطہ نہیں رہتا البتہ خواب ایک وحی کی شکل ہے اور اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے پر رحم کرتے ہوئے اسے کسی پریشانی سے بچاتا ہے یا کوئی خوش خبری دیتا ہے تو اس کے کسی اپنے کی شکل میں اس بات سے آگاہ کر دیتا ہے۔ ورنہ تمام روحیں تو عالم برزخ میں ہیں اچھی روحیں گہری نیند سو رہی ہیں اور بری روحیں عذاب میں مبتلا ہیں جیسے غیر مسلموں کی۔ خیر یہ کافی تفصیل طلب موضوع ہے کبھی ملاقات ہوئی تو تفصیل سے بات ہو سکتی ہے۔ تمہارا تفصیلی تبصرہ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے میں نے تمہارے لیے حج میں دعا کی تھی تم کب خوش خبری سنا رہی ہو اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور تمہاری ہر پریشانی دور ہو آمین۔ یہ تو ہوئی ساتھیوں سے ملاقات اب آتے ہیں اپنے سب سے پیارے ساتھی نئے افق کی جانب جو اس مرتبہ بھی بہترین کہانیوں کے ساتھ سج دھج کر آیا ہے مفرور اس مرتبہ اختتام پذیر ہوئی۔ اچھی رہی لیکن بہت اچھی نہیں کہہ سکتے۔ گنگا کا پجاری اچھی جا رہی ہے۔ قلندر ذات کی پہلی قسط زیادہ متاثر کن تھی دوسری میں زیادہ مزہ نہیں آیا ہو سکتا ہے آگے چل کر مزید اچھی ہو جائے۔ مغربی ادب سے انجم فاروق کی شاطر زبردست رہی۔ احمد سعید کی طفل مکتب بھی شاندار تھی۔ آخری سطروں میں ایک بہترین پیغام تھا۔ ریاض بٹ کی کینہ پرور، خلیل جبار کی آتش انتقام، جویریہ سلیم کی ضابطہ، ہنی کی جلاد مسیحا بہترین رہیں۔ خوشبوئے سخن میں ہمیشہ کی طرح عبداللہ شاہد کا گیت اچھا لگا۔ کیا بات ہے عبداللہ بہت خوش ہیں کیا دوستی کی خوشی میں؟ سلمٰی غزل کی غزل بھی اچھی لگی اور سوئٹ سی طاہرہ کی "بند لفظ بند کتابیں" بہت ہی شاندار رہی۔ اقرأ میں ریاکاری کے متعلق حدیث پڑھی۔ ذہن کو ایک بار پھر جھٹکا لگا اور اپنے عمل کا جائزہ لیا اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ریاکاری سے ہمیشہ بچائے کہ ریاکار آخرت میں بالکل خالی ہاتھ رہ جائے گا۔ خط کافی طویل ہو گیا ہے اس لیے اب اجازت چاہوں گی آپ سب سے التماس ہے کہ مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے۔

امجد جاوید...... حاصل پور۔ اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پہلی بار گفتگو کی محفل میں آپ سب سے ہم کلام ہوں۔ "قلندر ذات کا" کی دو قسطیں پیش کر چکا ہوں۔ اب اس شمارے میں تیسری قسط حاضر خدمت ہے۔ خط کا آغاز محترمہ عالیہ انعام الٰہی کے شکریے سے کرتا ہوں جو آپ نے اگرچہ مختصر سا ہی سہی، لیکن بہت ہی جاندار تبصرہ کیا ہے۔ محترمہ عالیہ، ابھی تو کہانی کی شروعات ہیں۔ کہانی کے پرت کھلتے کھلتے کھلیں گے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ کی امیدوں پر پورا اتروں گا۔ "ہوم ورک" کے بارے میں آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں نے ہمیشہ جب بھی کوئی کہانی لکھی ہے۔ تحقیق اس کا بنیادی عنصر رہا ہے۔ کہانی کا لینڈ اسکیپ اور کردار حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ چلیں لگے ہاتھوں میں آپ کے توسط سے قارئین کو یہ بھی بتا دوں کہ اس کہانی کی کہانی کیا ہے۔ یہ کہانی مجھے کیسے ملی؟ ہوا یوں کہ مجھے چولستان کے دور افتادہ علاقے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس صحرا نوردی کا مقصد کچھ اور تھا۔ کہانی یا اس سے متعلق کسی دوسری معلومات کی تلاش میں سرگرداں ہرگز نہیں تھا۔ اسی صحرا نوردی میں وہ جگہ ہمارے راستے ہی میں تھی۔ ایک چھوٹی سی بستی سے ذرا ہٹ کر درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس کے ساتھ ہی گوپا (مقامی انداز کی جھونپڑی) جس کے آگے کچے تھڑے پر خس کی صفیں پڑی ہوئی تھیں۔ درختوں کے نیچے چارپائیاں، قریب ہی ایک کنواں تھا۔ اچھی خاصی صاف ستھری جگہ تھی، جیسے صحرا میں کوئی نخلستان ہو۔ صحرا میں یہ نظارہ دلفریب تھا ہی لیکن سراب کے جیسی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہاں دو مہنگی فور وہیل جیپیں، تین چار کاریں اور چند موٹر سائیکل کھڑے تھے۔

"کیا خیال ہے کچھ دیر آرام کرنا چاہیں گے؟" ہمارے گائیڈ نے پوچھا

"یہاں......؟" میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا

"جی...... اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسے بندے سے ملواؤں گا جو اپنی ذات میں بہت عجیب شے ہے"

"کون ہے؟" مجھے تجسس ہوا۔ "سمجھیں اس چولستان کا تحفہ ہے۔ باقی آپ مل کر ہی اندازہ لگا سکیں گے۔۔۔ اگر اس کے پاس وقت ہوا تو۔۔۔ مہر اللہ یار نام ہے اس کا۔" ہمارے گائیڈ نے میرے تجسس کو ابھارا۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ہمارے گائیڈ نے گاڑی رکوادی۔ کچھ دیر بعد ہم اس گوپے کے اندر تھے۔ وہ اُدھیڑ عمر کا تنومند انسان تھا۔ گہرا سانولا رنگ، سفید کرتا، نیلی دھوتی، سفید رنگ کا پگڑ۔ نسواری رنگ کا پرنا گلے میں، خشخشی داڑھی، بھاری مونچھیں اور بڑی بڑی نشیلی آنکھیں۔ اس نے ہماری طرف گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ہمارے گائیڈ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔ "آپ ہیں میر اللہ یار خان۔۔" وہ بہت تپاک سے ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم ان کی باتوں میں مخل ہوئے ہیں۔ تبھی اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "آپ چند منٹ بیٹھو، میں ان سے اپنی بات مکمل کرلوں تو بات کرتے ہیں۔" ہم باہر درختوں کے جھنڈ میں آکر بیٹھ گئے۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ کے بعد مہر اللہ یار ہمارے پاس آگیا، وہ ہمیں لے کر گوپے میں چلا گیا۔ تعارف تمہیدی باتوں اور جدید مشروبات سے تواضع کرنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کوئی بات پوچھنا چاہتے ہیں؟"

میں اس کے چہرہ پڑھنے کی صلاحیت کا معترف ہوگیا کہ میرے اندر ایک نہیں کئی سوال "اُبل" رہے تھے۔ میں نے ان سے یہ سوال کیا "اس دور افتادہ علاقے میں، جنگل بیابان میں دو طرح کے لوگوں کا ڈیرہ ہوتا ہے۔ چور یا درویش۔۔۔ آپ کیا ہیں۔۔ جو اس طرح کے لوگ آپ کے پاس۔۔۔"

وہ کھلکھلا کر ہنستے دیا ہوئے بولا۔ "بیٹا، میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں چور یا سادھو، ہاں مگر اتنا جانتا ہوں کہ کس ریچھ کو کہاں سے پکڑنا ہے، کس بندر کو کیا اشارہ دینا ہے اور کس کتے کو کیا ڈالنا ہے۔"

"مہر صاحب یہ کیا بات کررہے ہیں آپ، اشرف المخلوق کو آپ ایسے کہہ رہے ہیں؟"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "سورۃ التین کو سمجھا ہے آپ نے۔۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا پھر بولا "آج رات میرے مہمان بن جاؤ، ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔"

اور میں رات وہاں پر رہا اور یہ کہانی مجھے مل گئی۔ تاہم میں پھر بھی "قلندر" کے بارے میں جاننے کے لئے تین سال تک سرگرداں رہا ہوں۔ الحمد اللہ میری مراد پوری ہوئی ہے۔ اب اس کی کیا کیا تفصیلات ہیں، میرے سوال کا جواب کیا ملا۔ یہی "قلندر ذات کا" کا موضوع ہے۔ محترم سید عبداللہ شاہد آپ نے محض ایک جملے میں تبصرہ کیا، معنی خیز، اچھا لگا۔ محترمہ این شاہین اب تک تین اقساط آگئی ہیں امید ہے آپ کو کہانی کی سمت کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ محترم شہنی ارشاد، اور شہناز بانو آپ کا شکریہ۔ قارئین سے التماس ہے کہ اگر وہ کہانی پر بھرپور تبصرہ کریں تو لکھاری کے لئے بہت ساری آسانیاں پیدا ہوجاتی ہیں، وہ بہتر انداز میں لکھتا چلا جاتا ہے۔ بشرط زندگی، آئندہ ماہ ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم! امید کرتی ہوں آپ اور نئے افق کے سارے احباب بالکل خیریت سے ہوں گے۔ مئی کا نئے افق پوری آب و تاب سے جگمگا رہا ہے جہاں تک ٹائٹل کی بات ہے تو خوب صورت ٹائٹل میں لڑکی کی ٹانگیں تو داخل ہوچکی ہیں اب دیکھیے وہ پوری کب داخل ہوتی ہے دستک میں جناب مشتاق احمد صاحب نے موجودہ حالات خصوصاً کراچی کے حالات پر روشنی ڈالی یہ ایسے حالات ہیں جسے پڑھ کر اور الیکٹرانک میڈیا پر دیکھ کر ہر محب وطن شہری کا دل خون کے آنسو دیتا ہے۔ کہانیوں کی طرف آتی ہوں تو کہانیوں میں کینہ پرور، آتش انتقام، دوراہا اور دیوانگی پسند آئیں۔ مغرب سے انتخاب میں جنگ امن اور شاطر خوب تھیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں ایسے شاطر لوگوں کی کمی نہیں ہمارے معاشرے میں جس چیز کا فقدان نظر آتا ہے وہ محنت اور ایمانداری ہے محنت کی عادت ہمارے معاشرے سے آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہے لوگ شارٹ کٹ کے ذریعے راتوں رات دولت اور شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کے میدان میں کچھ ایسی کالی بھیڑیں ہیں جو دوسروں کی چرائی ہوئی تحریریں مختلف رسالوں میں اپنے ناموں سے شائع کرواکے سستی شہرت حاصل کرلیتی ہیں۔ مثال کے طور پر میری ایک غزل جو فروری 2013ء کے شمارے میں چھپی وہ غزل ماہنامہ ڈر کے اپریل 2013ء کے شمارے میں پروفیسر واجد نگینوی نے اپنے نام اور تخلص سے شائع کروائی۔ واجد نگینوی یہ کام کافی عرصہ سے کررہا ہے ستم تو یہ ہے کہ وہ مشہور شاعروں کا کلام بڑی ڈھٹائی سے اپنے تخلص کے ساتھ مختلف رسالوں میں چھپوا رہا ہے لیکن میں یہاں نئے افق کی بات کروں گی۔ مارچ کے شمارے میں موصوف نے احمد فراز کی غزل اور اپریل کے شمارے میں محسن نقوی کی غزل اپنے نام اور تخلص سے شائع کروائی اگر پچھلے کئی شماروں کا جائزہ لیا جائے تو فہرست طویل ہوجائے گی۔ اب قارئین کو معلوم ہوچکا ہوگا موصوف کس کام کے پروفیسر ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ موصوف کی پروفیسری کسی بھی رسالے کو نظر نہیں آئی۔ عمران بھائی آپ سے گزارش ہے کہ ایسے نام نہاد شاعروں کا محاسبہ کیا جانا چاہیے جو دھاندلی کے ساتھ ساتھ رسالے کا امیج بھی خراب کرتے ہیں تاکہ لکھنے والوں کا رسالے پر اعتماد بحال رہے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ خدا حافظ۔

انجم فاروق ساطی...... لاہور۔ امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب والہانہ بخیر و خوبی ہوں گے۔ کراچی کے حالات بگڑنے پر تشویش لاحق ہوجاتی ہے۔ مئی کا نئے افق بڑے خوب صورت مناظر سرورق پر لیے منظر عام پر آیا۔ پہاڑی ماحول آبشار کی صورت میں پانی کا مختلف مقامات سے جھیل میں گرنا جھیل کی سطح پر پھیلے مختلف رنگوں کے قوس قزح اور جینز پہلے زنانہ شوز کے ساتھ ایک لڑکی چہرہ چھپائے نئے افق کے لیے کہانی لکھنے میں مگن تھی۔ ادارتی گفتگو ملکی حالات میں ایک تازیانے کی مانند متاثر کن ہوتی ہے۔ شاطر شائع کرنے کا شکریہ۔ امید ہے نظر کرم جاری رہے گا۔ کہانیوں میں مفرور، کینہ پرور، جلاد مسیحا، دوراہا، جنگ امن اچھی اور معیاری تحریریں تھیں۔ گردش اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے بعض حصے کافی متاثر کن تھے۔ گنگا کا پجاری اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھی تخلیق ہے۔ جن احباب نے خطوط میں تذکرہ قلمبند فرمایا میں ان کا ازحد مشکور ہوں۔ محترمہ شہناز بانو ریاض بٹ اور سید عبداللہ شاہد کی حوصلہ افزائی کا ممنون ہوں۔ (بھائی سید عبداللہ شاہد صاحب آپ کے الفاظ کا شکریہ مگر جناب میں کسی اقلیم پر نہیں ہوں۔ مزدور آدمی ہوں ابھی جدوجہد جاری ہے چھوٹی چھوٹی تعریفوں پر اکتفا کیجیے) آخر میں فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب کی صحت وتندرستی کے لیے دعا گو ہوں۔ نئے افق کے قارئین اچھے اور مخلص ساتھی ہیں خدا انہیں دکھوں سے دور اور خوشیوں سے مالا مال کرے۔ مہنگائی کے خلاف عمران صاحب کا جہاد قابل تعریف ہے ورنہ دوسرے ادارے صرف تجارتی نقطہ نگاہ زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ شاطر شائع کرنے کا شکریہ۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم عمران احمد صاحب۔ سلام مسنون امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ماہ مئی میں بھی نئے افق کے ٹائٹل کی انفرادیت قائم ہے کوہساروں سے گرتے آبشاروں کا منظر دلربا ہی نہیں جاں فزا بھی ہے۔ جس کے لیے مصور بہت مبارک باد کے مستحق ہیں۔ دستک میں محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے کاش ہم ان کا کچھ سدباب کرسکیں اور اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنا چھوڑ دیں۔ اے کاش عمران بھائی گفتگو کے آغاز میں آپ نے بہت ہی پیاری حدیث بیان فرمائی ہے۔ گفتگو میں اس بار شہناز آپی کرسی صدارت سنبھالے ہوئے ہیں ان کا خط ان کی بہت اچھی سوچ کی ترجمانی کررہا تھا وہ اپنے دل میں نئے افق کے ہر قاری کے لیے نیک جذبات اور نیک تمنائیں رکھتی ہیں بے شک یہ اچھے لکھاری کے اوصاف میں شامل ہے اور یہ اوصاف ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ خداوند کریم انہیں مزید کامرانیوں سے ہمکنار فرمائے آمین۔ آپی نے پروفیسر واجد نگینوی صاحب کے انتخاب کو پسند فرمایا ہے تو گزارش ہے کہ پروفیسر صاحب انتخاب نہیں بھیجتے بلکہ دوسرے شاعروں کی غزلیں اپنے نام اور تخلص کے ساتھ بھیجتے ہیں۔ اس ماہ ان کے نام سے چھپنے والی غزل جناب محسن نقوی کی بہت مشہور غزل ہے اور پروفیسر صاحب نے مقطع میں محسن کی جگہ اپنا نام واجد لکھ کر بھیجی اور ان کے نام سے چھپ گئی۔ کسی بھی میگزین کی مجلس ادارت کے لیے یہ سمجھنا بالکل ہی ناممکن ہے کہ کس شاعر نے اپنا کلام بھیجا ہے اور کس نام نہاد شاعر نے دوسروں کی محنت پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ کسی نام نہاد شاعر کے لیے ایسا کرنا بہت بڑا اخلاقی جرم ہے اور ایسے جرم کی سزا یہ ہے کہ اگر ثابت ہوجائے کہ کسی شاعر نے دوسرے کا کلام چرا کر بھیجا اور اپنے نام سے شائع کروالیا تو آئندہ کے لیے اس شخص کا داخلہ اس میگزین کے لیے بند ہوجانا چاہیے۔ موصوف نے نہایت دیدہ دلیری سے کام لیتے ہوئے منگلا ڈیم کی معروف شاعرہ اور مصورہ عصمت اقبال عین کی غزل جو نئے افق کے فروری 2013ء کے شمارے میں شائع ہوئی نہایت ڈھٹائی کے ساتھ ڈر ڈائجسٹ کے اپریل کے شمارے میں اپنے نام اور تخلص کے ساتھ چھپوادی ایسے پروفیسروں سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا بھلا کتنے ایمان دار اور فرض شناس ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ جناب پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی کو سمجھ اور شعور عطا فرمائے آمین۔ محترمہ نازسلوش ذشے آپ پر دوسرے ناول کے گم ہونے کی افتاد آپڑی۔ انشاء اللہ وہ بھی ہماری دعاؤں سے مل جائے گا۔ عمران بھائی ایسا جان کر تو نہیں کرتے بس چیز مس پلیس ہوجاتی ہے ڈاک کا بہاؤ بھی تو ان کی طرف بہت رہتا ہے۔ محترمہ این شاہین صاحبہ بڑے اچھے خیالات کے ساتھ تشریف لائیں۔ محترم ریاض بٹ صاحب یاد فرمائی کا شکریہ آپ نے میری غزل کو پسند فرمایا جس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ اس ماہ بھی آپ کینہ پرور لے کر تشریف لائے۔ بہت اچھی رہی آپ کی کہانی۔ تسلسل کے ساتھ آپ کی کہانیوں کا اشاعت کے لیے انتخاب ان کے معیاری ہونے کا ثبوت ہے۔ محترم شجاع جعفری صاحب نہایت مختصر نامہ کے ساتھ شریک گفتگو ہوئے بھائی خط کا سائز ذرا بڑھا دیں جعفری صاحب بہرحال شمولیت کا شکریہ۔ اسلم جاوید بھائی بھی بھاگتے بھاگتے محفل گفتگو میں تشریف لائے اور جلدی جلدی کچھ باتیں کہیں اور باقی کو آئندہ پر چھوڑ دیا۔ محترم فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب اس دفعہ خلاف معمول مختصر خط کے ساتھ تشریف لائے۔ خداوند کریم انہیں صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائے آمین۔ سید عبداللہ شاہد بھائی میں نے تو اپنے خط میں آپ کی بے اعتنائی کا شکوہ کیا مگر آپ نے اپنے خط میں سارے گلے شکوے دور کردیے۔ عبداللہ شاہد و آپ نے میرا مان رکھ لیا بے حد شکر گزار ہوں اور اپنے سارے گلے شکوے واپس لیتا ہوں خدا آپ کو دائمی خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ آپ کا بھرپور تبصرہ بہت پسند آیا۔ آخر میں عالیہ انعام کا جاندار تبصرہ محفل گفتگو کی رونق کو دوبالا کررہا تھا۔ اس دفعہ قابل احترام جناب مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب گفتگو میں تشریف نہیں لائے

خدا خیر کرے۔ اقرا میں جناب طاہر احمد قریشی نے ریا جیسی قبیح عادت سے احادیث کی روشنی میں پردہ اٹھایا ہے خداوند کریم اپنے فضل سے ہمیں اس عادت سے محفوظ رکھے آمین۔ خوشبوئے سخن میں جناب عمر اسرار اچھا انتخاب لائے سوائے پروفیسر واجد نگینوی کے جو محسن نقوی کی غزل چرا کر لائے ہیں۔

صدر...... حسن ابدال۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم! امید ہے رب کریم سے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ اللہ آپ پر اور ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے اور مصائب و ناگہانی آفات سے محفوظ فرمائے آمین۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے جس طرح کراچی اور پورے ملک کی صورت حال کا تجزیہ لیا ہے وہ قابل ستائش ہے درست کہا انہوں نے کہ ٹارگٹ کلنگ کا لنک بھتہ خوری اور لوٹ مار کا جو سلسلہ وہاں ہے اور جس طرح وہاں کے لوگ شہید کیے جاتے ہیں بہت افسوس ناک بات ہے۔ نجانے یہ کیسے لوگ ہیں جن کو خدا کا ذرا بھی خوف نہیں ہے۔ آپ لوگ جو کراچی جیسے شہر میں رہتے ہیں ہم آپ کی زندگی اور سلامتی کے لیے دعائیں کرتے ہیں ان حالات میں آپ لوگ جس طرح ظلم اور ناانصافی کے خلاف اپنے پرچے میں لکھتے ہیں وہ آپ کی بے خوف اور نڈر ہونے کی دلیل ہے دعا ہے پاک ذات سے کہ وہ آپ کو آپ کے اہل و عیال کو آپ کے اسٹاف کو اور کراچی میں بسنے والے ہر انسان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے الیکشن کے دن ہیں اور ہر طرف بلند و بانگ دعوے ہو رہے ہیں جون کا پرچا آنے تک الیکشن ہو جائیں گے اور ہمارے ملک میں کوئی ایسا حکمران آئے جو حضرت عمر فاروقؓ کی طرح انصاف کر سکے آمین۔ اس بار کرسی صدارت پر شہناز آنٹی براجمان تھیں ان کا تبصرہ خوب رہا اور جاندار بھی ٹھیک کہا انہوں نے جب ہم اپنے ضمیر اور عوام کے مفاد میں فیصلہ کریں گے اور اپنے اعمال کا احتساب کریں گے تو اللہ تعالیٰ بہترین حکمران دے گا۔ سید عبداللہ شاہد صاحب کا تبصرہ بھی جاندار رہا۔ شمنی ارشاد صاحبہ آپ کو سلام اور محمد بخش صاحب آپ کو بھی سلام ناز سلوش صاحبہ نے اپنے حالات کے بارے میں بہت کچھ کہا۔ میری بہن میں آپ کے حالات جانتا تو نہیں ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا لیکن میں آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ آپ کی ہر مصیبت اور مشکل دور ہو جائے۔ ریاض بٹ سلام بھائی کیسے ہیں کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی آپ اپنا پتا شائع کر دیں تاکہ آپ سے رہنمائی لے سکوں اور ان سب سے پیاری اور سب سے جدا میری فیوریٹ جن کی وجہ سے میں نئے افق باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں این شاہین صاحبہ بھی اس ماہ تشریف لائیں ہیں بہت افسوس ہوا آپ کی علالت کا سن کر اللہ آپ کو صحت کاملہ اور تندرستی عطا فرمائے۔ آپ کی نظم بہت پسند آئی لیکن کسی سے بچھڑ کر کیسے جیا جاتا ہے یہ کوئی مجھ سے پوچھے میں آپ کے لیے دعا گو ہوں آپ ہمیشہ اسی طرح لکھتی رہیں۔ گنگا کا پجاری پڑھ کر بہت مزہ آیا ہے اگلے پرچے میں شاید پاروتی انسانی روپ میں آ جائے۔ ریاض بٹ صاحب کی کینہ پرور، بہت پسند آئی آپ کو مبارک بھائی جو آپ اتنی اچھی اسٹوری لکھتے ہیں میں ایک بار پھر محترم عمران بھائی اور ان کے اسٹاف کے لیے دعا گو ہوں کہ وہ اسی طرح نئے افق کی اشاعت کرتے رہیں جس طرح وہ عرصہ دراز سے کر رہے ہیں اور میرے جتنے بھائی اور بہنیں رہ گئی ہیں جن کے بارے میں نہیں لکھ سکا ان سب کو سلام کہتا ہوں میں اپنی بہن ناز سلوش صاحبہ اور خصوصی طور پر این شاہین کے لیے دعا گو ہوں آپ کی ذات آپ کو خوشیاں عطا فرمائے۔ آمین

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی ہمیشہ مسکراتے رہو جناب مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں اس بار پرچے کے لیے کافی چکر شہر کے لگائے تب جا کر ماہنامہ نئے افق کا دیدار ہوا۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے یہ ایک معیاری جریدہ ہے ہر ماہ کے آخر میں پرچہ کا بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں ایسا پرچہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے میں اس کا بہت ہی پرانا قاری ہوں آپ جس خلوص اور محبت سے ہمیں نئے افق کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں ماہ مئی کے شمارے میں خط اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ پرچہ کا ہر عنوان اپنی اپنی جگہ پر بہترین ہے۔ گفتگو اور خوشبوئے سخن اس بار بہت خوب تھا ہر ایک کی تحریر اچھی تھی۔ موسم بدل چکا ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے قمر حسین منگلا ڈیم اور تمام قارئین کی خدمت میں آداب عرض ہو چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں بشرطیکہ آپ کا تعاون ساتھ ہو۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں آپ کی زندگی میں رنگ برنگے پھول کھلتے رہیں۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ نئے افق کی دن دگنی رات چوگنی ترقی کی دعا کرتا ہوں۔ خط کے لیے بڑی مشکل سے وقت ملا اور کوئی قابل ذکر بات نہیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں اب اجازت چاہتا ہوں۔ اللہ حافظ

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ مئی 2013ء کا شمارہ 20 اپریل کو مل گیا منفرد سرورق کی بدولت دل کو بھا گیا۔ صفحہ الٹا ساتھ ساتھ آنچل بھی پڑھا جاتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے۔ فہرست میں اپنی کہانی دیکھ کر سیروں خون بڑھ گیا۔ اس عنایت اور مہربانی کا جتنا

شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک ہمیں ہمارے حکمرانوں کے اصل چہرے دکھا رہی ہے۔ اس کے بعد اپنی پیاری محفل گفتگو میں قدم رکھا۔ سب سے پہلا خط بہن شہناز بانو کا ہے۔ حسب معمول بڑی موثر اور خوب صورت باتوں سے خط کا آغاز کر رہی ہے آپ کی ایک ایک بات موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ ہم دونوں بہن بھائی مہرے کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ لیکن قارئین کی حوصلہ افزائی ہمارے لیے پین کلر کا کام دے رہی ہے اور ہم چاہے وقتی طور پر ہی سہی اپنا درد بھول کر لکھ رہے ہیں۔ شمنی ارشاد بہن میری کہانی چوڑی فروش پسند کرنے کا شکریہ۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے آمین۔ بہن میں نے شہناز بہن کے مشورے کو پلے سے باندھ لیا ہے۔ نئی کہانیوں میں آپ کو کافی بہتری نظر آئے گی۔ ارے اس بار ناز سلوش ذشے بہن بھی موجود ہیں بہن مایوسی گناہ ہے خدا آپ کی مشکلیں آسان کرے اور آپ کے دل میں خوشی کے دیپ جل اٹھیں۔ انسان کو ہر حال میں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ میں دعا گو ہوں کہ پہلی کہانی کی طرح آپ کی خواب کہانی بھی مل جائے۔ این شاہین بہن میری کہانی چوڑی فروش پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ نے آدھا تیتر آدھا بٹیر تو سنا ہوگا دراصل میری کہانی (جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے) کا نام آدھی تیتری تھا جو "ت" سے تھا کمپوزنگ یا کسی وجہ سے آدھی پٹڑی چھپ گیا۔ ریاض حسین قمر صاحب ذوق آگہی میں میرا انتخاب پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ چوڑی فروش کی پسندیدگی کے لیے آپ نے جن الفاظ کا استعمال کیا ہے میرے لیے قیمتی سرمایہ ہیں اور آپ کے اعلیٰ ذوق کے مظہر ہیں۔ طاہرہ جبیں تارا اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر محفل میں حاضر ہوئیں شکریہ۔ محترم محمد بخش صابر لنگاہ صاحب خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین اور آپ بھرپور تبصرے کے ساتھ شامل ہوں۔ اس محفل کی رونق آپ ہیں۔ ہمت جوان رکھیں سید عبداللہ شاہد بھائی حسب سابق آپ کا مدلل اور جامع تبصرہ یقیناً تعریف کے قابل ہے۔ آپ اچھا لکھتے ہیں اور اچھے کو اچھا ہی کہا جائے گا۔ عالیہ انعام الٰہی بہن آپ کا تفصیلی خط میرے سامنے ہے ہمیشہ کی طرح بہت گہرائی لیے ہوئے ہے۔ لفظوں کا استعمال تمہیں خوب آتا ہے۔ ہر تحریر پر بھرپور تبصرہ اچھا لگتا ہے۔ بہن میری کہانی آپ کو پسند آئی جس کے لیے شکریہ کا لفظ چھوٹا لگتا ہے۔ خدا تمہیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی میرے لیے اکسیر کا کام دیتی ہے اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ یہ بات شاید میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بہن شہناز بانو گردش کی صورت میں ایک اچھی کہانی لکھ رہی ہیں۔ تحریر جاندار ہے اور کہانی پر گرفت مضبوط ہے اس ماہ کی قسط بھی خوب ہے۔ بہن شمنی ارشاد تمہاری کہانی جلاد مسیحا کے کیا کہنے بات سمجھانے اور قاری کو کہانی کے سحر میں جکڑنا تمہیں خوب آتا ہے ویل ڈن۔ باقی سچ بیانیوں میں دوراہا (محمد سلیم اختر) دیوانگی (محمد اعظم خان) آتش انتقام (خلیل جبار) بہت اچھی اور دل میں اترنے والی کہانیاں رہیں۔ اس بار انجم فاروق ساحلی مغرب سے انتخاب شاطر لے کر آئے اور خوب آئے اسرار احمد کی جنگ امن کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی اے حمید (مرحوم) کی گنگا کا پجاری ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اب بات ہو جائے چند دوسرے سلسلوں کی۔ خوشبوئے سخن میں یوں تو سارا انتخاب قابل تعریف ہے لیکن این شاہین کی نظم، عصمت اقبال مبین کی کوئل ریاض حسین قمر کی غزل سید عبداللہ شاہد کا گیت، طاہرہ جبیں تارا کی بند لفظ بند کتابیں نمبر لے گئیں۔ ذوق آگہی میں ایک سے بڑھ کر ایک انتخاب ہے۔ کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی کترنیں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس طرف توجہ دیجیے اور مجھے اجازت دیجیے اگلے ماہ انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔

شجاع جعفر...... تلہ گنگ۔ السلام علیکم! عمران بھائی امید ہے کہ آپ اور آپ کی ساری ٹیم نئے افق کے تمام قارئین بخیریت ہوں گے گفتگو میں سب کے تبصرے اچھے تھے۔ نئے افق کا ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ اقرا طاہر قریشی صاحب نے بہت اچھی احادیث کا انتخاب کیا جنہیں پڑھ کر ایمان تازہ اور مضبوط ہو گیا۔ کہانیاں تمام ہی اچھی تھیں تمام رائٹرز کو مبارک باد۔ گنگا کا پجاری میری فیوریٹ ہے وہ اچھی جا رہی ہے۔ طفل مکتب کی کچھ کچھ سمجھ آئی اور کچھ کچھ......! خوشبوئے سخن میں تمام شعراء کی غزلیں نظمیں اچھی تھیں۔ این شاہین کی نظم اور راشد ترین کی غزل پسند آئی بہت اچھی تھیں۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں پر سایہ رحمت رکھے۔

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ہمارے پیارے ملک پاکستان پر اللہ پاک رحم و کرم کی بارش عطا فرمائے۔ سرورق مئی 2013ء پر مصور نے اپنی طرف سے بھرپور محنت کی دل خوش کر دیا۔ اشتہارات کی کوئی ترقی و کامیابی نظر نہ آئی۔ اشتہارات کے لیے محنت و لگن کی ضرورت ہے جس کے کرنے سے ماہنامہ کی آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اللہ پاک آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ بس مقدر کی بات ہے مجھ جیسے فقیر کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور میری ارسال کردہ کسی بھی تحریر کو اشاعت میں شامل نہیں کیا گیا اور محبت نامہ کی بھی بس چند لائنیں شامل کی گئیں ارے بھائی عمران احمد صاحب و بزرگوار قریشی صاحب ہم پھر بھی خوش ہیں کہ چلو ٹھیک ہے جیسے آپ خوش ویسے ہم خوش۔ دستک کراچی کے لوگو ایاز بزرگوار مشتاق احمد قریشی کی دل سے لگائی گئی دستک نے دل پر بہت اثر کیا اور آواز آئی کہ اللہ پاک ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ گفتگو میں عمران احمد صاحب نے حدیث بہت خوب صورت انداز میں پیش کر کے ایمان کو تازگی بخشی اور بھرپور سبق دیا۔ اس کے بعد اعلامیہ بھی سبق آموز رہا۔ گفتگو میں صدارتی

کرسی کا اعزاز شہناز بانو صاحبہ نے حاصل کیا مبارک باد ہو بہن خوش رہو مع تمام اہل وعیال کے۔ دعا ہے اپنی تحریر میں آپ نے خوب پھول بکھیرے لیکن ہم جیسے فقیر کو نظر انداز کر دیا خوش رہو بی بی دعا ہے۔ محترمہ شبنمی ارشاد صاحبہ نے دوسرا نمبر حاصل کر کے مختصری تحریر میں اپنی مصروفیت کا اظہار کر کے محبت نامہ ختم کر دیا۔ اللہ پاک آپ کو کامیابی دے باقی یاد کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی تحریر جلاد مسیحا ایک سبق آموز تحریر رہی اس پر مبارک باد قبول کیجیے۔ تیسرے نمبر پر ناز سلوش ذشے نے بھرپور محبت نامہ میں اپنے قلم کے جادو جگائے خوش رہو۔ باقی شادی کے تو مرد ہو یا عورتیں سب ہی امیدوار ہوتے ہیں اور تب ہی جا کر سفر مکمل ہوتا ہے ریشم کے ایوارڈ کی مبارک باد اور دعا کہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرو۔ باقی ہمارا نام تو آپ کو یاد نہ تھا۔ باقی خطوط میں این شاہین صاحبہ خوش رہو فقیر کو یاد کرنے کا شکریہ۔ ریاض بٹ صاحب، ریاض حسین قمر صاحب نے اپنے اپنے خطوط میں گلاب کی خوشبو بکھیری اور فقیر کو دل سے یاد کیا۔ دلی شکریہ اللہ پاک آپ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے دعا گو ہوں۔ شجاع جعفری صاحب، محمد اسلم جاوید صاحب، سلمٰی غزل صاحبہ طاہر جبیں تارا صاحبہ نے اپنے اپنے مختصر محبت کے پھول بکھیرے خوش رہو دعا ہے۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کو بھی مختصری جگہ گیارہویں نمبر پر ملی لہٰذا عمران صاحب کا بہت بہت شکریہ کہ فقیر کو یاد رکھا گیا۔ سید عبداللہ شاہد صاحب اور صاحبزادی عالیہ انعام الٰہی صاحبہ نے اپنے اپنے محبت ناموں میں خوب سے خوب تر رنگ بکھیر کر رکھ دیے اور فقیر کو یاد رکھا اللہ آپ کو خوشیاں دے باقی کافی بہن بھائی محفل سے غیر حاضر تھے ان سب کو میری طرف سے دلی طور پر سلام محبت اور دعاؤں کا نذرانہ پیش ہے۔ فقیر کو بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اللہ حافظ۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد۔ نئے افق مئی 2013ء اپنے خوب صورت طلسماتی حسین دلکش ٹائٹل سے مزین پہاڑوں کی خوبصورتی اور ان کے اوپر اڑتے پرندوں کی اڑان اور اس پر صاف وشفاف بہتی آبشار اور اس کے نیچے جمع ہوتا شیشے کی طرح چمکتا پانی کسی خواب کا سا منظر پیش کر رہا تھا مگر اتنے حسین منظر میں آپ نے لڑکی کے خطرناک بوٹوں کی نمائش تو پیش کر دی اگر وہ خود دکھائی دیتی تو اس منظر کو چار چاند لگ جاتے۔ مشتاق احمد قریشی اپنی قابل فہم گفتگو کے ساتھ حاضر تھے دستک میں اور ہم نے اپنی ناقص عقل کم علمی پر قابو پانے کے لیے قریشی صاحب کے لکھے کو بہت غور سے پڑھ کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کراچی میں جرائم کی شرح میں اضافہ وقت پر جرم کی روک تھام نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ قابل اور فرض شناس نوجوان دھکے کھانے پر مجبور ہیں سیاسی عاملوں نے اپنے اپنے اعمال غنڈہ گردی، بے دریغ خون بہا کر کسی کو خریدنا، کسی کی مجبوری بے بسی سے فائدہ اٹھانا وغیرہ سے کراچی کیا پورے پاکستان کے حالات کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے اور اب یہ شعبدہ باز پھر نئے سرے سے نئے وعدوں کے ساتھ پھر اسی عوام کو سبز باغ دکھانے کے لیے اپنے اپنے حجروں سے نکل کر پاکستان کے گلی کوچوں میں نکل آئے ہیں اور لوٹ مار میں ان سیاستدانوں نے یاجوج ماجوج کو بھی مات دے دی ہے۔ اللہ انہیں ہدایت بخشے۔ یہ سب سوچتے ہم دوستوں کی دکان میں داخل ہوئے جہاں پر نئے افق کی دعوت میں آئے ہوئے خواتین وحضرات اپنے اپنے علم کی سمجھ بوجھ کے مطابق میٹھی کڑوی باتیں لیے حاضر تھے۔ مطلب تشریف فرما تھے ان سے گفتگو کا آغاز کیا سب سے پہلے جناب محترم عمران احمد قریشی صاحب کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی انہوں نے ملک کے حالات پر گفت وشنید کی اور ایک مہربان کی طرح پیش آئے اس کے بعد صدارتی کرسی پر بیٹھی ہماری ہر دلعزیز محترمہ شہناز بانو صاحبہ نے بھی نئے افق کے لیے عقیدت کا جذبہ لے کر اچھے انداز میں تبصرہ کیا۔ کیف کے لیے اچھے جذبات کا شکریہ۔ ان کی دیکھا دیکھی شبنمی بہن بھی شریک ہوئیں۔ مصروفیت کے باوجود آ کر محفل کی شان میں گستاخی...... اوسوری میرا مطلب ہے شان میں اضافہ کیا۔ آپ صرف آپ کی گردش کو پسندیدگی کی نگاہ سے مت دیکھیں کبھی ہم غریبوں کی تحریروں پر بھی عزت کی کی نگاہ پھینک دیا کریں خوش رہیں۔ تیسرے نمبر پر ناز سلوش ذشے، بہن آزاد کشمیر جیسی خوب صورت جنت سے رونق افروز ہوئیں محترمہ نوجوان نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے کسی انجان این جی اوز سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم سمجھے وہ اپنی خوب صورت باتوں سے ہمارے اندر جو انتشار خلفشار ہے زمانے سے نفرت کا جو لاوا ابل رہا ہے وہ کم کریں گی مگر انہوں نے تو ہم ہی سے مشکلات کم کرنے کی دعا کروالی بڑی چالاک ہیں۔ اللہ آپ کو آپ کی محنتوں، محبتوں کا بہت جلد ثمر عطا کرے۔ بہت خوب صورت تبصرہ تھا۔ ویسے ناز سلوش ذشے کا شکوہ بجا ہے عمران بھائی آپ ذرا دیکھیں تو کہیں محلہ کی کوئی بکری تو نہیں جو ہماری کہانیاں بھوک سے مجبور ہو کر چپکے سے کھا جاتی ہے۔ شہروں میں گھاس تو اگتی نہیں میری بھی دو تین کہانیوں کے کھرے نامعلوم مقام کی جانب گم ہو گئے ہیں۔ چوتھا تبصرہ محترمہ این شاہین جی کراچی سے لکھ کر لائی بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنے اس چھوٹے بھائی کو بھی اپنے تبصرے میں یاد رکھا۔ اسی طرح لکھتی رہو اور شامل بزم رہا کرو۔ تبصرہ بہت ہی سوئٹ تھا۔ اس کے بعد ریاض بٹ صاحب کو تبصرہ کرنے کے لیے اشارہ کیا۔ بٹ صاحب آپ نے شاپ کی مبارک باد دی اس کے لیے بڑی نوازش پھر ریاض حسین قمر صاحب جو منگلا ڈیم سے تشریف لائے جس کی طرف اک اور کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ ہمارے نئے افق کے دو لکھنے والوں کے درمیان بہت دنوں سے جاری نوک جھونک کو اپنی کوشش سے محبت میں بدل دیا۔ ریاض

صاحب دو روٹھے دوستوں کو منانا بھی عبادت ہے اور ریاض بھائی میری تو کوشش یہی ہوتی ہے کہ شامل بزم رہوں۔ بلکہ ہمیشہ کرسی صدارت سے چمٹا رہوں، مگر حسرتیں...... حسرتیں ہی رہیں۔ شجاع جعفر اور محمد اسلم جاوید مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ مسز سلمٰی غزل نے بھی کراچی سے شامل ہو کر نئے افق کی خوب صورت بزم کو نکھار دیا۔ کہانی ''ندامت'' خوب صورت لفظوں پر مشتمل لاجواب کہانی تھی۔ طاہرہ جبیں تارا لاہور سے سفر کر کے آئیں اور تھکاوٹ کی وجہ سے تھوڑا سا مگر بہت خوب صورتی سے اپنے لفظوں کے موتی اس محفل افق میں نچھاور کیے اور ہمارے پرانے لکھنے والے بزرگ ساتھی خانیوال سے آئے اور میٹھی میٹھی باتیں کیں شکریہ۔ جناب اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ اب باری ہے ہمارے نئے افق کے ایسے ساتھی جو نہایت باریک بینی سے پورے میگزین پر تبصرہ بہت ہی خوب صورت انداز میں کرتے ہیں۔ جناب سید عبداللہ شاہد اسلام علیکم بگ بی امید ہے خوش وخرم ہوں گے تبصرہ میں محترم صدیقی صاحب کے لیے لکھے گئے جذبات طمانیت کا احساس دلا گئے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔ عمران بھائی سے میری گزارش ہے کہ جانے کتنی محنتوں، ٹائم نکال کر سوچ سوچ کر مغز ماری کر کے کتنے مہینوں کے بعد اک کہانی لکھ کر پھر ارسال کرنے تک کے مراحل سے گزر کر آپ کے پاس پہنچتی ہے اور سالوں لکھاری اس ٹینشن میں رہتا ہے کہ اس کی کہانی کا کیا پوسٹ مارٹم ہوا یا بے کار سمجھ کر کہیں پھینک دی گئیں۔ اتنا بھی نہ پتا چل سکے کہ آیا کہانی پہنچی کہ نہیں شامل اشاعت ہو سکتی ہے کہ نہیں اور اتنی کوششوں کے بعد پتا چلے کہ کہانی گم ہو گئی ہے تو بندے کا کیا حال ہوتا ہے وہی جانے۔ میری بھی تین کہانیوں کا کچھ پتا نہیں اگر نا قابل اشاعت ہوں تو بندہ پھر سے محنت کرے۔ اب ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ آخری تبصرہ پڑھنے کی باری عالیہ انعام الٰہی کراچی کو ملی۔ جنہیں اپنے انداز تکلم، تبصرہ کرنے پر عبور حاصل ہے اور جیسے پھونک پھونک کر لفظ استعمال کرنے پر مہارت ہو۔ بھائی کے لفظوں کو سمجھنے کے لیے شکریہ۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کی ہر مشکل آسان ہو۔ سب سے پہلے گردش میں جا گھسے دلارے کا نقاب جو اترنے والا تھا۔ کہانی بہت شاندار انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ سرمئی اور حشام کی محبت کیا کہنے، ادی شہناز بانو کا قلم خوب جادو جگا رہا ہے۔ اس کے بعد سچی کہانیاں دیکھیں اور شبنمی ارشاد کی جلاد مسیحا پڑھی جو بہترین سچی کہانی تھی۔ ریاض بٹ کی کینہ پرور بھی مزہ دے گئی۔ دیوانگی اور آتش انتقام دونوں ہی اپنی جگہ بہترین تھیں۔ باقی پرچہ زیر مطالعہ ہے۔ خوشبوئے سخن میں عصمت اقبال کی کوئل، این شاہین کی نظم دونوں اچھی رہیں۔ رانا حنیف عاطر کی غزل، عاطر بھائی سلام قبول کریں۔ بشریٰ علوی، طاہرہ جبیں تارا کی نظم اور راشد ترین کی غزل اچھی لگی۔ ذوق آگہی میں جاوید بٹ اور حسن اختر پریم کی تحریریں پسند آئیں۔ اس کے ساتھ ہی اللہ حافظ۔

سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ بھائی عمران احمد اس بار آپ کا بے حد شکریہ کہ نئے افق قدرے جلدی موصول ہو گیا یعنی 17 یا 18 تاریخ کو رسالہ ملا تو طمانیت سے گہری سانس کا ہلکورہ لیا کہ مطالعہ اب کچھ ریکور ہو سکتا ہے۔ تھینک یو سر نئے شمارے کا سرورق گرمی کے موسم کے لحاظ سے متاثر کن تھا۔ پہلے دستک قبلہ وکعبہ مشتاق احمد قریشی کے مدبرانہ جائزے سے مستفید ہوا اور اس کے بعد جناب عالی طاہر احمد قریشی کی بیان کی گئی احادیث کی بصیرت افروز تاویلیات سے آگہی حاصل کی۔ آپ نے شرک کی جو اقسام اپنی تحریروں سے گفتگو فرمائی انہیں جان کر اپنے احوال کی اصلاح کی۔ اب مغربی ادب سے منتخب تراجم پر رائے زنی کرتا چلوں۔ اس مرتبہ بھائی عمران احمد نے لاہور کے چہیتے شہزادے انجم فاروق ساحلی کی انگریزی سے ترجمہ اسٹوری شاطر کو پہلے نمبر پر شائع کیا بدخواہ قسم کے لوگ ان القاب کو پروفیشنل ہٹ گردانے گے لیکن میں ساحلی کو موسٹ لکی سمجھتا ہوں ''شاطر'' ایک تکنیکی جاسوسی کہانی تھی اور انہوں نے خوبی سے اسٹوری کو اس طرح ٹرانسلیٹ کیا تھا کہ پڑھنے کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ ویلڈن انجم ساحلی، تم تراجم کی طرف آئے ہو تو امید کرتا ہوں کہ اچھی تکنیکی کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔ تیسری ترجمہ کہانی جسے بھائی اسرار احمد نے جنگ امن کے ٹائٹل سے قلم بند کیا ایسے دیرینہ انتقام کے گرد گھومتی تحریر تھی جس کا مرکزی کردار وقت کے گرد وغبار میں دفن ہو کر ناپید ہو چکا تھا۔ اس تلخ حقیقت سے ایک طرح کا دکھ محسوس ہوا کہ ریڈ مرے جیسے تشنہ کام اور سوختہ دل لوگ جو برسوں اپنی خوشیوں کے قاتل اور گناہ گار سے حساب چکتا کرنے کے جہد مسلسل میں خود کو بدلے کی آگ میں جلاتے ہیں لیکن جب ہزار ہا صعوبتوں اور صبر آزما ذاتی مشقتوں کو لٹانے کے بعد وہ قاتل کے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو یہ پتا چلتا ہے کہ اس پر ظلم وجبر کرنے والا قاتل تو مر چکا ہے بقول کسی فاشسٹ کے اب کیا ہو سکتا ہے؟ جناب مدیر محترم اس دفعہ آپ نے ذوق مطالعہ کے لیے بچوں کی نفسیات پر بھی تحاریر کو شائع فرمایا ہے جن میں طفل مکتب، جوڑ توڑ قابل ذکر ہیں۔ بچوں کی خود آموزی اور عملی تربیت کے حوالے سے لکھی گئی کہانی جوڑ توڑ ایک شاہکار ادبی تحریر تھی۔ بے حد لاجواب کہانی رہی جو ایک عرصہ تک دل وذہن کو یاد رہے گی۔ اب گفتگو میں دوست احباب سے پرسش احوال ہو جائے بخاری کی حدیث اور مدیر صاحب کی تمہید کے بعد بجا شہناز بانو کو صدارتی کرسی پر حسن پر تمکنت سے متمکن دیکھا تو خوشگواری کے احساس ہونٹوں پر تبسم عود کر آیا ایک ماہ کے وقفہ سے ان کی محفل میں موجودگی مجھ جیسے محروم تمنا کے لیے تریاق کی مانند ہوتی

ہے بجیا کے پرخلوص جذبوں سے متاثر ہو کر یوں آنکھوں میں تیرگی امڈ آتی ہے جیسے وہ میری سگی بہن ہوں۔ بجیا' آپ کا بھرپور اور جامع تبصرہ محفل کی آن بان میں اضافہ کر رہا ہے آپ عالم فہم اور سہل لفظوں میں بات کہتی چلی جاتی ہیں لیکن پڑھنے والا تو اپنی جگہ ہونق زدہ رہ جاتا ہے میں نے آپ کے پیغام کو بخوبی سمجھا اور جواباً اس پر رائے دی۔ اس سندوستائش کا تہہ دل سے مشکور ہوں لیکن اگلی سطر میں آپ نے یہ عندیہ دے کر ورطہ حیرت میں ڈال دیا کہ آپ نے مجھ نالائق کے لیے کوئی لڑکی چوز کی تھی لیکن وہ موصوفہ منگنی کی انگوٹھی پہن چکی تھیں۔ آپ نے حد کر دی بجیا' میری تنہا زندگی کے بارے میں آپ فکر اور تکلیف سے سوچتی ہیں یہ میرے لیے تعجب خیز اور خلاف حقیقت بات ہے۔ میری قابل عزت واحترام بہن اور مشفق بجیا۔ اللہ عزوجل آپ کو میری زندگی بھی لگا دے۔ تمنی ارشاد پیا دیس رخصت ہونے کے جملے پر تم چڑ کیوں گئیں محترمہ؟ ذرا تحمل سے کام لو کیونکہ تم غصے میں جب بولتی ہو تو بہت غضب ڈھانے لگتی ہو۔ معاف کرنا مجھے تمہاری اسٹوری رائٹنگ سے جیلسی نہیں ہے شادی کے بعد بھی تم دنیا کے کسی کونے پر قابض ہو کر اپنے مہندی لگے ہاتھوں سے خط اور کہانیاں لکھ سکتی ہو۔ وہ جو بھی ہوں گے جیسے بھی ہوں گے پر جاہل اور باؤلے تھوڑی ہوں گے جو روک ٹوک کریں گے۔ یہ علمی وادبی پروفیشل بہت سے شعبوں سے لاکھ درجے بہتر مانا جاتا ہے تمہارے لیے ہر لحاظ سے پرفیکٹ رہے گا۔ دوم بجیا شہناز باتو نے اپنے قرب وجوار کی لڑکیوں کی شادی کے بارے میں بلاوجہ فکر مند نہیں ہیں وہ خانہ خدا میں اپنے اللہ کے روبرو اخلاص دل سے دعا کر کے آئی ہیں۔ اللہ سے عہد کرنے کے بعد کوئی مسلمان کیونکر چین وسکون سے بیٹھ سکتا۔ ہے بجیا کے لیے یہ اگرچہ نہایت صبر آزما بات ہے اس کے باوجود وہ شادی میں جلدی کی بات کرتی ہیں مبادا تاخیر ہونے سے وہ گناہ گار اور معتوب ہوں۔ ''جلاد مسیحا'' میں مجھے جلاد پر اعتراض ہے تمنی۔ تمہاری اسٹوری کے ٹائٹل تو مکمل طور پر اچھے اور مثبت ہونا چاہیے بھئی۔ ریاض بٹ' آپ نے شکریہ بابے کا شکریہ لکھا اور میں کہوں گا کہ شکریہ۔ میری جان' جتنے سارے خواب تھے سب کو جگا دیا۔ ہائے نازش' زیادہ پریشان ہونے سے بہتر یہ ہے کہ تم محنت وتوجہ سے کوشش جاری رکھو۔ اللہ بڑا عالم الغیوب ہے جب وہ سنگلاخ چٹان میں رینگتے کیڑے کی خبر رکھتا ہے تو تمہاری محنت کو کس طرح ضائع اور رائیگاں جانے دے گا میری دعاؤں میں تو تم شامل حال رہتی ہو لیکن گلے شکوے کرنے سے تعلقات متاثر ہوتے ہیں اور منزل کی جانب لحظہ لحظہ بڑھتی گاڑی یکایک رک جاتی ہے۔ ''خواب کہانی'' اچھا عنوان ہے۔ یہ ناول بدقسمتی سے کس پلیس ہو گیا ہے تو ری رائٹ کر لو یار ویسے مائنڈ نہ کرنا تم نئے افق کی کہانیوں کا مطالعہ نہیں کرتی ہو تمہارے طویل تبصرے میں اپنی ذاتی باتوں کے علاوہ کسی کہانی پر اظہار خیال نہیں کیا گیا۔ رسالے کا مطالعہ کرو گی تو اسٹوری رائٹنگ میں بھی بتدریج امپورٹنس حاصل کرو گی۔ صدارتی کرسی کی طلب بڑے دل گردے والے کرتے ہیں۔ خط پہلے نمبر پر نہ سہی لیکن شائع تو ہوتا ہے نا' اس لیے میری ایڈوائس تو یہی ہے کہ پہلے نئے افق کو پڑھو اور پھر خط بھجواؤ چاہے کچھ تاخیر ہو جائے برادرم ریاض حسین قمر' فنکاروں کے بارے میں میرے موقف کی تائید کرنے کا بے حد شکریہ۔ تمہاری گزارش کا اس مہینے جواب دے دیا ہے لیکن صاحب مقتدر جناب صدیقی صاحب اس مرتبہ محفل سے ندارد ہیں۔ غزل کو بہت اچھے لفظوں میں سراہنے کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ حمد ونعت کہنے کی دعوت دینے پر احسان مند ہوں۔ اللہ عزوجل تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ این شاہین بہت غیر حاضر رہتی ہو محفل سے غزل وتبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ عالیہ انعام الہٰی کا آخری خط بھی بھرپور اور شاندار ہے سسٹر تم نے ہمہ جہت گردان کر کے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ شجاع جعفری' محمد اسلم جاوید' سلمیٰ غزل اور فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کے خطوط معیاری اور جاندار ہے۔ اب اجازت دیجیے بھائی عمران احمد۔ والسلام

اقرا

ترتیب: طاہر قریشی

ریا ایک درجہ کا شرک اور ایک قسم کا نفاق ہے:۔

(تشریح) دونوں حدیثوں کا حاصل اور پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اس نیک عمل کو قبول کرتا ہے اور اسی پر ثواب دے گا' جو اخلاص کی کیفیت کے ساتھ صرف اس کی رضا اور رحمت کی طلب میں کیا گیا ہو' اور اس کے سوا کسی کو بھی اس میں شریک نہ کیا گیا ہو' اور اس کے برخلاف جس عمل سے اللہ کے سوا کسی اور کی بھی خوشنودی یا اس سے کسی قسم کی نفع اندوزی مطلوب ومقصود ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو بالکل قبول نہ کرے گا' وہ نہایت بے نیاز اور شرک کی لگاوٹ سے بھی بیزار ہے۔

یہ انجام تو ان اعمال کا ہے جو اللہ کے لیے کیے جائیں لیکن نیت میں پورا خلوص نہ ہو بلکہ کسی طور پر اللہ کے سوا کسی اور کی بھی لگاوٹ ہو لیکن جو ''نیک اعمال'' محض ریاکارانہ طور پر کیے جائیں' جن سے صرف نام ونمود' دکھاوا اور شہرت اور لوگوں سے خراج عقیدت وصول کرنا ہی مقصود ہو تو وہ نہ صرف یہ کہ مردود قرار دے کر ان عمل کرنے والوں کے منہ پر مار دیئے جائیں گے' بلکہ یہ ریاکار اپنے ان ہی اعمال کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

ریاکاروں کو فضیحت اور رسوائی کی سزا:۔

(۲۵۶)

(ترجمہ) حضرت جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کوئی عمل سنانے اور شہرت دینے کے لیے کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو شہرت دے گا' اور جو کوئی دکھاوے کے لیے کوئی نیک عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب دکھائے گا۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ دکھاوے اور شہرت کی غرض سے نیک اعمال کرنے والوں کو ایک سزا ان کے اس عمل کی مناسبت سے یہ بھی دی جائے گی کہ ان کی اس ریاکاری اور منافقت کو خوب مشہور کیا جائے گا اور سب کو مشاہدہ کرا دیا جائے گا کہ یہ بدبخت لوگ یہ نیک اعمال اللہ کے لیے نہیں کرتے تھے' بلکہ نام ونمود اور دکھاوے اور شہرت کے لیے کیا کرتے تھے...... الغرض جہنم کے عذاب سے پہلے ان کو ایک سزا یہ ملے گی کہ سر محشر ان کی ریاکاری اور منافقت کا پردہ چاک کر کے سب کو ان کی بدباطنی دکھا دی جائے گی۔ اللھم احفظنا!

دین کے نام پر دنیا کمانے والے ریاکاروں کو سخت تنبیہ:۔

(۲۵۷)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ آخری زمانہ میں کچھ ایسے مکار لوگ پیدا ہوں گے جو دین کی آڑ میں دنیا کا شکار کریں گے، وہ لوگوں پر اپنی درویشی اور مسکینی ظاہر کرنے اور ان کو متاثر کرنے کے لیے بھیڑوں کی کھال کا لباس پہنیں گے، ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی، مگر ان کے سینوں میں بھیڑیوں کے سے دل ہوں گے، (ان کے بارے میں) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، کیا یہ لوگ میرے ڈھیل دینے سے دھوکہ کھا رہے ہیں یا مجھ سے نڈر ہو کر میرے مقابلے میں جرأت کر رہے ہیں، پس مجھے اپنی قسم ہے کہ میں ان مکاروں پر انہی میں سے ایسا فتنہ کھڑا کروں گا جو ان میں کے عقلمندوں اور داناؤں کو بھی حیران بنا کے چھوڑے گا۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ریاکاری کی یہ خاص قسم کہ عابدوں زاہدوں کی صورت بنا کر اور اپنے اندرونی حال کے بالکل برعکس ان خاصان خدا کی سی نرم و شیریں باتیں کر کر کے اللہ کے سادہ لوح بندوں کو اپنی عقیدت کے جال میں پھانسا جائے، اور ان سے دنیا کمائی جائے، بدترین قسم کی ریاکاری ہے اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی تنبیہہ ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اس دنیا میں بھی سخت فتنوں میں مبتلا کیے جائیں گے۔

ریاکار عابدوں اور عالموں کو جہنم کا سخت ترین عذاب:۔

(۲۵۸)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ تم لوگ "جب الحزن" (غم کے کنوئیں یا غم کے خندق) سے پناہ مانگا کرو۔ بعض صحابہ نے عرض کیا:۔ حضرت "جب الحزن" کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: جہنم میں ایک وادی (یا خندق) ہے (جس کا حال اتنا برا ہے کہ) خود جہنم ہر دن میں چار سو مرتبہ اس سے پناہ مانگتی ہے۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ! اس میں کون لوگ جائیں گے؟ آپ نے فرمایا:۔ وہ بڑے عبادت گزار اور یا وہ زیادہ قرآن پڑھنے والے جو دوسروں کو دکھانے کے لیے اچھے اعمال کرتے ہیں۔

(جامع ترمذی)

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

محبانِ وطن

محمد حنیف قادری

جب قومیں مایوسی کے بھنور کا شکار ہوجاتی ہیں تو وہ دشمن کا آسان ہدف بن جاتی ہیں۔ اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر ملک کی جڑوں پر حملہ آور ہو کر اسے نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ایسا ہی ہمارے وطن عزیز کے ساتھ 1971ء میں ہوا جب را اور سی آئی اے نے چند ضمیر فروش لیڈروں کو خرید کر پہلے قوم کو مایوسی کے اندھیرے میں دھکیلا اور پھر ایک طبقہ کو حقوق کے نعروں کے سحر میں جکڑ کر انہیں آگے بڑھایا اور دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کو دو لخت کردیا۔ یہ سازشیں آج بھی جاری ہیں۔ وہی نعرے وہی پروگرام دیے جا رہے ہیں بس چہرے مختلف ہیں۔ مگر ان سازشوں کا مقابلہ کرنے والی قوتیں پہلے کے مقابلے میں آج زیادہ مضبوط ہیں عوام کا شعور پہلے سے زیادہ بیدار ہے اور وہ دشمن کی ہر سازش کو ناکام بنادیں گے۔

وطن کی مٹی کو عظیم تر قرار دینے والے چند سرفروشوں کا احوال

نئے افق کی روایتوں کا امین، سطر سطر ہنگامے اور تجسس سے بھرپور ناول

رات کا جانے وہ کون سا پہر تھا کہ بے انتہا فائرنگ کی وجہ سے میری آنکھ کھلی میں جلدی سے اٹھا۔ سردیوں کا موسم تھا باہر نکلا تو تیز سرد ہوا نے استقبال کیا۔ آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی تو سارا منظر روشن ہوجاتا تھا۔ فائرنگ کی آواز بیلے کی طرف سے آتی محسوس ہوئی تھی، یہ بیلا ہمارے گاؤں سے کچھ ہی دور ہے جو کہ خودرو درختوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں جلدی سے اپنے مکان کی چھت پر پہنچا تو مجھے اندازہ ہوا کہ جیسے دو گروہ میں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہو۔ اچانک آسمانی چمکی تو بیلے کی طرف سے کچھ بندے گاؤں سے باہر موجود ایک کھنڈر کی طرف فائرنگ کرتے نظر آئے۔ اس کھنڈر میں کون لوگ تھے ہمارے گاؤں میں کافی عرصے سے دشمنیاں چلی آرہی تھیں مگر ایسا تصادم پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا یہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟

اچانک آسمانی بجلی چمکی تو میں نے کھنڈر میں سے کسی کو بیلے کی طرف فائرنگ کرتے دیکھا یہ شاید ایک ہی شخص تھا کیونکہ یہاں سے اکا دکا ہی فائر ہو رہا تھا پھر میرے اندر کا غیرت مند انسان جاگ اٹھا کسی مظلوم کی مدد کرنا میرا ہمیشہ سے شیوہ تھا میں سیڑھیوں سے حتی الامکان تیزی سے نیچے اترا کمرے سے اپنی رائفل، فالتو میگزین اور گولیوں کا تھیلا اٹھایا اور گاؤں سے باہر کھنڈر کی طرف دوڑ لگادی۔

میں جب کھنڈر کے قریب پہنچا تو میں نے دو بندوں کو کھنڈر کی دیوار پھلانگتے دیکھا۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے اندھا دھند چھلانگ لگانے سے بہتر جانا کہ تھوڑی دیر رک کر حالات کا جائزہ لیا جائے اندر تھوڑی دیر اٹھا پٹخ ہوئی اس کے بعد ایک آدمی کسی بندے کے ہاتھ پاؤں باندھے اسے سر پر لادے باہر نکلا اور بیلے کی طرف بھاگنے لگا اس کے بعد اس کا دوسرا ساتھی بھی نکلا اور اس کے پیچھے بھاگا چند لمحوں میں ساری صورت حال واضح ہوچکی تھی۔

کھنڈر میں شاید ایک ہی بندہ تھا جسے یہ لوگ اٹھا کر لے جا رہے تھے اور یقیناً یہ لوگ اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک کرنے والے نہیں تھے اور میرے لیے یہ فیصلے

کی گھڑی تھی۔ میں نے فوری طور پر کھنڈر کی آڑ لی اور رائفل کو برسٹ پر سیٹ کیا میں نے نشست باندھی اور ان دونوں کی ٹانگوں کا نشانہ لیتے ہوئے ایک بھرپور برسٹ مارا اور اس کا نتیجہ میری توقع سے بھی زیادہ نکلا دونوں آدمی جو بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے اب دونوں ہی چیخ رہے تھے۔ ابھی یہ لوگ کھنڈر سے زیادہ دور نہ گئے تھے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر تمام نتائج کی پروا کیے بغیر کھنڈر سے چھلانگ لگائی اور بھاگتے ہوئے ان لوگوں کے سر پر جا پہنچا۔

یہ بس چند لمحوں کا کھیل تھا۔ اگر میں دیر کرتا تو اور دیوانہ وار بھاگتے ہوئے ان کے سروں پر نہ پہنچتا تو ان لوگوں کو جوابی کارروائی کا موقع مل سکتا تھا وہ لوگ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ میں ان کے پاس پہنچ گیا اور انہیں للکارا۔

"خبردار گولی مت چلانا ورنہ میں تمہاری کھوپڑی میں بارود بھر دوں گا۔" ان دونوں آدمیوں کی ٹانگوں میں گولیاں لگ چکی تھیں۔ مجھے سر پر دیکھا تو ان کا رہا سہا حوصلہ بھی جواب دے گیا اور انہوں نے اپنے آپ کو سرنڈر کرنے میں دیر نہیں کی میں نے ان دونوں آدمیوں کی رائفلو پر فوری طور پر قبضہ کر کے جلدی سے ان کی جامہ تلاشی لی ان کے پاس اور کوئی اسلحہ نہ تھا۔

میں نے تیسرے شخص کی طرف دیکھا جس کو یہ لوگ اٹھا کر بھاگ رہے تھے اس کا منہ سختی کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور باقی سارے جسم پر چادر لپیٹ کر رسی سے باندھا ہوا تھا۔ البتہ اس کی آنکھ سے اوپر والا حصہ کھلا تھا اور وہ شخص بڑی حیرانی سے مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید یہ سب کچھ اس کی توقع کے برعکس تھا وہ ابھی تک حیران تھا کہ اس کا نجات دہندہ اچانک کہاں سے ٹپک پڑا؟

یہ سب سوچتے ہوئے مجھے چند لمحے لگے بیلے میں موجود لوگ شش و پنج میں مبتلا تھے وہ ابھی فائرنگ بھی نہیں کر رہے تھے کیونکہ ان کے اپنے ساتھی ان کی فائرنگ رینج میں تھے اور کوئی گولی انہیں بھی لگ سکتی تھی۔ اچانک ان لوگوں نے بوکھلا کر ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ میرے پاس ابھی چند لمحے اور تھے اور مجھے ان چند لمحوں کا بروقت استعمال کرنا تھا۔ میں نے اسلحہ تھوڑی دور رکھا اور جلدی سے زخمیوں کی گرم چادروں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے اور ان کو الٹا لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے حتی الامکان اپنے لہجے کو خوفناک بناتے ہوئے کہا۔ خبردار یہاں سے ہلنا بھی مت ورنہ تمہارا بھیجہ اڑا دوں گا۔ میں نے ان کے ہتھیار اپنی گرم چادر میں باندھے اور اپنی پیٹھ کے پیچھے لاد لیا مگر میری اپنی رائفل ابھی میرے ہاتھ میں ہی تھی اور پھر جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے دونوں زخمیوں پر اپنی گن خالی کر دی اور وہ دونوں یقیناً مر چکے تھے اور شاید ان کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ اس کے بعد میں نے اس شخص کو کندھوں پر لادا جسے وہ لوگ اٹھا کر بھاگ رہے تھے۔

اگر اس وقت میں اسے بندشوں سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا تو شاید دیر ہو جاتی۔ میں بھاگتے ہوئے کھنڈر کی آڑ میں پہنچا اور اسی آڑ میں گاؤں کی طرف بھاگتا رہا اور یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا کیونکہ جب میں گاؤں کی گلی میں داخل ہو رہا تھا تو بجلی چمکی اور ان لوگوں نے صورت حال کا اندازہ کر لیا۔ کیونکہ ان میں سے کچھ لوگ صحیح صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے اپنے ساتھیوں تک پہنچ چکے تھے اور انہوں نے مجھے گاؤں میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا انہوں نے میرا نشانہ لے کر گاؤں کی طرف ایک طویل برسٹ مارا۔ مگر میں اب دیوار کی آڑ میں پہنچ چکا تھا بھاگتے ہوئے مجھے کندھے پر

لدے ہوئے شخص کے بارے میں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق صنف نازک سے ہے۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بیلے کی طرف سے ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد دوسرا دھماکہ ہوا اور اس کے بعد تو جیسے قیامت برپا ہو گئی یہ دھماکے اتنے شدید تھے کہ ایک بار تو مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی اسلحے کے ڈپو میں آگ لگ گئی ہو در و دیوار لرز رہے تھے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے بیلے کی طرف سے آسمان آگ کی طرح سرخ ہوتا ہوا نظر آیا اب میرا گلی میں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا میں نے حتی الوسع تیز دوڑنے کی کوشش کی اور میں جلد ہی گھر پہنچ گیا۔

☆☆☆

میرا نام ذکیہ ہے اور میں لاہور کی رہنے والی ہوں میری عمر ابھی دو سال بھی نہ تھی کہ میری والدہ ایک حادثے میں فوت ہو گئیں۔ میرے والد صاحب بقید حیات ہیں اور میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے والد سندھ کی ایک بڑی جاگیردار فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے والد کے دو بڑے بھائی ہیں۔ جو اب بھی سندھ میں اپنی آبائی حویلی میں رہتے ہیں۔ میرے والد جو دونوں بھائیوں سے چھوٹے تھے اس لیے دادا ابو کے بہت زیادہ لاڈلے بھی تھے۔ انہوں نے بی اے تو پاکستان سے کیا لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ کا رخ کیا۔ وہ جب تعلیم مکمل کر کے واپس آئے تو ان میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ ان کے خیالات اپنی فیملی سے یکسر مختلف ہو چکے تھے۔ انگلینڈ کی جس یونیورسٹی میں انہوں نے تعلیم حاصل کی اسی میں میری والدہ جو کہ خود ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں نے بھی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ایک دن جب لائبریری میں ان دونوں کا تعارف ہوا تو اس کے بعد ان کی اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ آہستہ آہستہ یہ ملاقاتیں محبت میں تبدیل ہو گئیں اور میرے ابو جب واپس آئے تو انہوں نے دادا ابو سے ذکر کیا۔

تو پہلے تو وہ کافی ناراض ہوئے مگر جب ابو نے امی کی فیملی کے بارے میں تفصیلاً ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے آخر کار دونوں گھروں کی باہمی رضامندی سے دونوں کی شادی ہو گئی۔ ابو اور امی میں اتنا پیار تھا کہ جس کی مثال پوری فیملی میں نہ ملتی تھی میرے والد کی شادی کے تقریباً چھ ماہ بعد دادا ابو کا انتقال ہو گیا۔

دادا ابو کی وفات کے بعد تینوں بھائیوں میں زمین کا بٹوارہ ہو گیا میرے والدین پہلے ہی کراچی شفٹ ہو چکے تھے۔ مگر امی کی وفات کے بعد ابو کا کراچی سے دل اچاٹ ہو گیا اور وہ لاہور چلے آئے۔ یہیں پر انہوں نے کاروبار سیٹ کیا اور پھر وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

اب بھی کبھی جب وہ سندھ جاتے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے ہیں نانا بھی وفات پا چکے ہیں مگر اب بھی جب ہم نانا کی حویلی میں جاتے ہیں تو ماموں اور ممانی بہت محبت سے پیش آتے ہیں۔ دونوں تایا جنہیں میں انکل کہہ کر پکارتی ہوں وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ جب میں وہاں جاتی ہوں اور کزنز وغیرہ سے ملتی ہوں تو ان کی باتیں سن کر اور لوگوں سے ان کا سلوک دیکھ کر بہت پریشان ہوتی ہوں۔

میرے ابو نے بھی اپنی زمینوں پر اپنی حویلی بنوا رکھی ہے۔ ہم وہاں بھی جاتے ہیں اور مجھے جتنی خوشی یہاں آ کر ملتی ہے پورے سندھ میں اور کہیں بھی نہیں ملتی ہمارے مزارع ہم سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں۔

منشی دین محمد ہو یا پھر کوئی عام مزارعہ سبھی لوگ ہمیں اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں کیونکہ ابو ان کے ہر دکھ سکھ میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ تمام اخراجات بھی خود

ادا کر کے جاتے ہیں اگر وہ خود نہ آسکیں تو یہ کام منشی دین محمد کے ذمے ہوتا ہے میں نے زندگی بھر کبھی نہیں دیکھا کہ کسی نے ابو سے کچھ مانگا ہو اور انہوں نے انکار کیا ہو۔

میرے ابو مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں اور شاید اسی لیے انہوں نے امی کی وفات کے بعد شادی نہیں کی میرے ابو کا پیار مجھ سے مثالی تو تھا ہی مگر انہوں نے میری تعلیم و تربیت میں بھی کوئی کمی نہ چھوڑی مجھے نہ صرف اچھے اسکول میں داخل کروایا گیا بلکہ گھر پر بھی میرے لیے بہترین ٹیوٹرز کا اہتمام کیا گیا گھر میں ایک پورشن میں میرے لیے ورزش کی تمام مشینیں موجود تھیں اور یوگا' باکسنگ اور سیلف ڈیفنس سے لے کر ہر قسم کے اسلحے کی تربیت مجھے دی گئی۔

ابو جانے مجھے کیا بنانا چاہتے تھے میں نے ان سے کئی بار پوچھا بھی مگر اکثر وہ ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے وہ کہا کرتے تھے بیٹا دنیا بڑی ظالم ہے اور میں تمہیں ان ظالموں کے ظلم سے بچنے کے تمام گر سکھا دینا چاہتا ہوں۔

ایک دن یونیورسٹی سے گھر آتے ہوئے مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر لیا گیا میں سوچ رہی تھی کہ ایسا کون ہمارا دشمن ہو سکتا ہے جو اس حد تک جا سکتا ہے۔ آج کل ویسے ہی اغوا کی وارداتیں عام تھیں اور ان لوگوں سے کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا۔ بلکہ یہ سب کچھ پولیس کی سرپرستی میں رہا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ میرے ناک پر کسی نے رومال رکھا اور بے ہوش کر دیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بیڈ پر لیٹے ہوئے پایا ایک بندہ جو سوٹڈ بوٹڈ اور کافی مہذب لگتا تھا میرے سامنے کھڑا تھا میں نے جونہی آنکھیں کھولیں۔ کسی نے اس سے کہا۔

''سر! اسے ہوش آگیا ہے آپ اس سے بات کر سکتے ہیں۔'' میں نے دیکھا کہ میرے سرہانے کی طرف ایک ڈاکٹر کھڑا تھا۔

''جی میڈم! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔'' سوٹڈ بوٹڈ شخص نے مجھ سے پوچھا!

''آپ تو ایسے پوچھ رہے ہیں کہ جیسے اسپتال میں کسی مریض کی عیادت کر رہے ہوں جبکہ مجھے یہاں اغوا کر کے لایا گیا ہے اور آپ یقیناً ان لوگوں کے ساتھی ہیں۔'' مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں نے انتہائی تحمل سے جواب دیا۔

''میڈم! آپ نے درست فرمایا آپ کو اغوا کر کے ہی یہاں لایا گیا ہے مگر میں ان کا ساتھی نہیں ہوں ان کا باس ہوں اور اب آپ یہاں آگئی ہیں تو مجھے آپ کو یہاں کے اصولوں سے متعارف کروانا ہے۔''

''آپ تمہید نہ باندھیں اور جو کہنا ہے کہیں! میں اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہو چکی ہوں کہ مجھے اغوا کر لیا گیا ہے اب میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔'' میں نے کہا۔

میرے منہ سے ایسے الفاظ سن کر شاید اسے بھی حیرت ہوئی ہو مگر اس کا اس نے اپنے چہرے سے اظہار نہیں ہونے دیا۔

''وری گڈ میڈم! ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہم سے تعاون کریں۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کر کے ہم اپنے دوست کے سامنے شرمندہ ہوں کل رات آپ کو اپنے تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ اس دوران آپ ہم پر بھی مہربانی کریں اور اپنے آپ پر بھی۔ کیونکہ اب آپ کی واپسی ناممکن ہے کسی بھی ناگزیر صورت حال میں ہمیں آپ کو شوٹ کرنے کا حکم ملا ہے۔ جہاں تک اس بیلے میں پھیلے ہوئے میرے ساتھیوں کا تعلق ہے تو وہ آپ کے بارے میں ان تمام باتوں سے بے خبر ہیں اور اگر آپ نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی اور ہمارے لیے مشکلات کا سامان

کیا تو پھر آپ کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں مگر مجھے امید ہے کہ یہ تھوڑا سا وقت جو آپ کا ہمارے درمیان ہے وہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے گا۔'' اس نے تمام باتوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

''آپ مجھے پڑھے لکھے اور کسی اچھی فیملی سے تعلق رکھنے والے لگتے ہیں آپ مجھے ان کے ساتھی تو کم از کم نہیں لگتے۔'' میں نے کہا۔

''میں ان کا ساتھی ہوں یا نہیں آپ میرے پڑھے لکھے انداز گفتگو اور فیملی پر بھی نہ جائیں یہ سب مقدر کا کھیل ہے میرے دل میں آپ کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ بس میرا ایک انداز ہے مسائل کو سلجھانے کا اور جو لوگ اس کا غلط مطلب نکال لیتے ہیں انہیں پچھتانے کا موقع بھی کم ہی ملتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں بھی کوشش کروں گی کہ آپ سے مکمل تعاون کر سکوں' مگر کیا آپ مجھے میرے اغوا کروانے والے کے بارے میں کچھ بتائیں گے آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''کل رات سب کچھ آپ کے سامنے ہوگا۔ ہاں ایک اور بات' کل یہاں ایک بیوٹیشن آئے گا اور آپ کو دلہن کا روپ دے گا اس بارے میں بھی اگر ہو سکے تو ہم سے تعاون کریں۔ اس کے بعد نکاح نامے پر آپ کے سائن ہوں گے جو پارٹی آپ سے خود کروا لے گی۔''

نکاح! کیا مطلب......؟''

''نکاح کا مطلب نکاح کے سوا کچھ بھی نہیں اور اب بس۔ باتیں بہت ہو گئیں۔ میں رانو کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں سوچ رہی تھی کہ میرا ایسا دشمن کون ہو گیا جو اس حد تک چلا گیا۔ آ جا کے میری سوئی ایک نکتے پر اٹکی تھی مگر وہ لوگ اس حد تک چلے جائیں گے یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پھر کون ہو سکتا ہے۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ رانو نامی عورت رات کے کھانے کے ساتھ آگئی اور میری تربیت کچھ ایسے خطوط پر ہوئی تھی کہ میں نے فی الحال اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑتے ہوئے کھانا کھا لینا بہتر جانا اور آئندہ جانے حالات کیا ہوتے ان سے نمٹنے کے لیے مجھے توانائی کی ضرورت تھی اور توانائی کے لیے کھانا ضروری تھا۔ کھانے کے بعد رانو چائے لے کر آئی تو میں نے بلا چون و چرا چائے بھی پی لی۔ رانو ان سب باتوں پر حیران تھی کہ ایک لڑکی جسے اغوا کر لیا گیا تھا وہ ایسے برتاؤ کر رہی تھی کہ جیسے یہ سب اس کے لیے پکنک ہو۔ مگر شاید اسے بولنے کی عادت کم تھی یا اسے مجھ سے غیر ضروری باتوں سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی زبان بند ہی رکھی۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ رانو میرے والے کمرے میں میرے ساتھ والی چارپائی پر سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمرے کے دروازے کو اندر سے صرف کنڈی لگائی گئی تھی۔ میں نے رانو سے کہا۔

''رانو تم نے دروازے کو اندر سے صرف کنڈی لگائی ہے۔ اگر میں بھاگ جاؤں تو؟''

''تو مجھے خوشی ہوگی' مگر ایسا ممکن نہیں۔ اگر پھر بھی آپ اپنا شوق پورا کرنا چاہیں تو مجھے حکم ہے کہ آپ کو ایسا کرنے سے نہ روکوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب رانو؟'' میں حیرت سے پوچھا۔

''بی بی! آپ مجھے سونے دیں ناں' مجھے صبح صبح ہزار کام ہوتے ہیں اور آپ ایسا کریں کہ بھاگ جائیں میری بلا سے۔''

''عجیب لوگ ہیں یہ بھی۔'' میں نے سوچا کہ مجھے یہاں سے بھاگنا تو تھا ہی۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ

میں ان کے ساتھ خاموشی سے چلتی رہتی اور تمام باتیں مانتی رہتی۔ شاید یہ لوگ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کے وہم میں مبتلا تھے۔ یا پھر یہ لوگ مجھے ایک معمولی لڑکی سمجھتے ہوئے بے فکر تھے۔ کچھ تو تھا جو مجھے پریشان کر رہا تھا وہ لوگ میری طرف سے اتنے بے پروا تھے تو اس کی کوئی تو وجہ تھی۔

میں اپنے بستر سے اٹھی اور اپنے جوگرز پہنے۔ اپنے لیڈیز بیگ سے گرم مفلر اور ٹوپی نکال کر پہنی اور میں نے رانو سے کہا۔

"میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔"

دروازہ اچھی طرح بھیڑ دو۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔ جب سر پھوڑ وا کے لوٹو تو زیادہ شور مت کرنا۔ آرام سے سو جانا۔" رانو نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں نے دروازہ کھولا اور باہر نکلی جس جگہ میں کھڑی تھی وہ برآمدہ تھا۔ میں نے دیکھا تو یہ چار کمروں کا بنا ہوا مکان تھا۔ ان چار کمروں کے اوپر چوبارہ تھا اور اس پر سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے ذریعے میں چوبارے تک پہنچی۔ یہ چاند کی آخری راتیں تھیں۔ چہار سو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے دور دور تک چاروں طرف نظر دوڑائی' اردگرد خود رو درختوں اور جھاڑ جھنکار کی بہتات تھی۔ گیدڑوں اور حشرات الارض کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے نظر آیا کہ یہ بہت بڑی حویلی تھی اور جہاں مجھے لا کر رکھا گیا تھا وہ حویلی کا ایک پورشن تھا اور جس پورشن کے چوبارے پر میں کھڑی تھی اس کے ساتھ ہی دوسرا پورشن بالکل اسی طرز پر بنا ہوا تھا۔ جس میں مجھے رکھا گیا تھا۔ حویلی کا مین گیٹ بند تھا۔ مگر اس کے آس پاس مجھے کوئی گارڈ یا رکھوالا نظر نہیں آیا۔ احاطے میں سے کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ مین گیٹ کے ساتھ ہی کچھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان سے ٹی وی چلنے کی ہلکی ہلکی آواز بھی آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ یہاں رکھوالی کے لیے کچھ بندے موجود تھے۔ کیونکہ ہوا کے دوش پر ان کے قہقہے لگانے اور باتیں کرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔

ابھی میں حالات کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ اچانک مجھے ساتھ والے چوبارے سے کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی میں نے جلدی سے دیوار کی اوٹ سے دیکھا تو چوبارے کی بنی ہوئی پردی کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا کوئی روتا ہوا نظر آیا۔ گرم چادر کی بکل اس نے یوں مار رکھی تھی کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے اینٹوں کی یہ چھوٹی سی دیوار پھلانگی اور دوسرے پورشن کے چوبارے پر جا پہنچی۔ مذکورہ شخص رونے میں یوں محو تھا کہ اسے اردگرد کی کسی شئے کی کوئی خبر نہ تھی۔ میں نے آہستگی سے اس کی چادر کو پکڑ کر ہلایا تو اس نے چادر کی بکل سے سر نکالا اور حیران پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"آپ کون ہو باجی اور اس وقت چوبارے پر کیا کر رہی ہو۔" اس نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ رات کے اس پہر تم چوبارے پر بیٹھے کیوں رو رہے ہو۔"

"باجی! یہ تو ایک لمبی داستان ہے سن کر کیا کرو گی۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بھی میری طرح یہاں اغوا ہو کر آئی ہو اور ابھی تمہیں ان لوگوں کے بارے میں معلوم نہیں ہوا۔ یہ بہت ظالم لوگ ہیں باجی۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر رونے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔ میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کے سر پر تازہ تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور اس کے چہرے پر زخموں اور چوٹوں کے نشان بھی موجود تھے۔

"میرا نام خرم ہے باجی اور میں کراچی ڈیفنس کا

رہنے والا ہوں۔ میرا تعلق ایک امیر گھرانے سے ہے۔ ایک ماہ پہلے کالج سے آتے ہوئے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ پہلے مجھے سندھ میں ہی کسی وڈیرے کی حویلی میں رکھا گیا تھا اور میرے گھر والوں سے رقم کی ڈیمانڈ کی گئی۔ رقم کی منتقلی کے دوران جانے کیسے پولیس والوں کو خبر ہو گئی۔ میرے گھر والوں نے خود اطلاع دی تھی یا پھر کوئی اور مسئلہ تھا۔ بہرحال اغوا کاروں کو شک ہو گیا تھا اور انہوں نے رقم ہی وصول نہ کی اور میرے گھر والوں سے کہا کہ تم لوگوں کے پولیس کو اطلاع دینے کی وجہ سے ہم رقم دگنا کر رہے ہیں۔ اس بار ہم تسلی سے رقم وصول کر کے تمہارے بیٹے کو چھوڑیں گے۔ پہلے بیس کروڑ کا مطالبہ تھا اب وہ چالیس کروڑ مانگ رہے ہیں' میرے گھر والوں سے ان کی بات چیت ہو رہی ہے۔ دیکھیں کب اس عذاب سے نجات حاصل ہو گی۔"

اور یہ پٹی اور چہرے پر زخموں کے نشانات۔ یہ سب کیسے ہوا کیا ان لوگوں نے تم پر کوئی تشدد وغیرہ تو نہیں کیا؟"

"یہ سب تو میرے اپنے کیے کی سزا ہے باجی۔ مجھے منع کیا گیا تھا کہ میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کروں مگر ہاتھ پاؤں آزاد ہونے کی وجہ سے میں نے کوشش کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ مگر میں جسے آسان سمجھتا تھا وہ تو ناممکن تھا باجی۔ دیکھنے میں یہی لگتا ہے کہ بندہ یہاں سے آرام سے نکل جائے گا۔ مگر اس کوشش میں بندہ اپنی جان سے بھی جا سکتا ہے۔ مجھے تو صرف چوٹیں آئی تھیں۔ مگر اس دوران میں نے اپنی پوری کوشش کی تھی کہ یہاں سے نکل سکوں مگر میری تمام کوششیں بے کار رہیں۔"

"خرم بھائی کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ یہاں سے فرار ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے یا تمہارے ذہن کے مطابق وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے یہاں سے نکلنا ناممکن ہے؟"

"باجی میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں مگر اس سے پہلے کیا میں آپ کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟"

"بھیا! میرا نام ذکیہ ہے اور میں لاہور کی رہنے والی ہوں۔ میرے اغوا کی داستان کچھ انوکھی قسم کی ہے۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گی۔ مگر آزاد فضاؤں میں اور اس آزاد فضا میں میرا بھائی میرے ساتھ ہو گا۔ خرم دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔"

"ذکیہ بہن' یہ سب کتابی باتیں ہیں اور کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ اس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ادھر آؤ میں تمہیں بتاؤں۔ یہ اینٹوں کے رخنے دیکھ رہی ہو ان میں سے دیکھو ذرا۔"

"میں دیکھ رہی ہوں تم بتاؤ۔" میں نے اینٹوں کے ایک چوکور رخنے سے آنکھ لگائی اور کہا۔

"حویلی سے ایک ایکڑ کی دوری پر ایک سبزے کی پٹی سی نظر آ رہی ہے تمہیں۔ جو ایک ترتیب کی شکل میں حویلی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یہ ایک گہری کھائی ہے۔ اس کھائی کی چوڑائی اندازاً کم از کم پچاس فٹ سے زیادہ ہے اور گہرائی چالیس' پینتالیس فٹ ضرور ہو گی۔ یہ حویلی ایک ٹیلے پر بنی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ سیلاب کے پانی سے بھی بچی رہتی ہے۔ یہ گہری کھائی پختہ اینٹوں سے تیار کی ہوئی ہے اور اس پر جو سبزہ نظر آ رہا ہے۔ وہ امر بیل کا سبزہ ہے۔ یہ ایک ہلکے نائلون کے دھاگے پر لپٹا ہوا ہے۔ یہ دھاگہ صرف اور صرف اس امر بیل کے وزن ہی کو سہار سکتا ہے۔ مگر دور سے دیکھنے والے کو اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ یہ پتہ اسے تب چلتا ہے جب بے دھیانی میں چلنے والا شخص گہری کھائی میں جا گرتا ہے۔ اب اس بات کا اندازہ تم خود لگا سکتی ہو کہ چالیس فٹ کی بلندی سے نیچے گرنے والے

شخص کا کیا حشر ہوتا ہوگا۔ وہ بھی نیچے پکے فرش پر۔"

"مگر خرم بھائی، مجھے آج جس گاڑی پر لایا گیا ہے۔ وہ تو اندر آ کر رکی ہوگی۔ یقیناً یہاں کوئی پل ہوگا جس سے ان لوگوں کی آمد و رفت ہوتی ہوگی۔"

"جی یہ پل ہے۔ لیکن یہ ایک میکنزم کے تحت کام کرتا ہے۔ یہ لفٹ کی مانند ہے جب ان لوگوں نے گزرنا ہوتا ہے تو یہ اوپر آ جاتا ہے۔ جب یہ لوگ گزر کر چلے جاتے ہیں۔ تو یہ پھر نیچے اپنی جگہ پر واپس چلا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ لوگ اس کے اوپر دھاگوں کا جال پھینک کر گھاس پھونس ڈال کر برابر کر دیتے ہیں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے میں بھی کہوں کہ یہ لوگ اتنے بے پروا کیوں ہیں۔"

"پچھلے پندرہ دنوں سے میں ادھر موجود ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں لایا گیا تھا۔ یقیناً بیلے میں بھی ان کے لوگ موجود ہیں۔ رات کو یہ لوگ اکثر جیپ پر یہاں سے جاتے ہیں اور اس کے بعد کبھی کبھار فائرنگ کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے یہ لوگ شکار کرتے ہوں گے۔"

"خرم بھائی تم چل پھر تو سکتے ہو ناں؟"

"میں نہ صرف چل پھر سکتا ہوں بلکہ دوڑ بھی لگا سکتا ہوں۔ کیونکہ یہ چوٹیں جو آپ دیکھ رہی ہیں۔ اس سے میرا بازو اور ماتھا متاثر ہوا ہے۔ دراصل ہوا یوں تھا کہ جب میں یہاں سے بھاگنے لگا تھا تو میں بغیر سوچے سمجھے رات کے وقت حویلی سے نکل پڑا تھا۔ رات کے تقریباً ایک بجے کا ٹائم تھا۔ حویلی کے تمام دروازے صرف کنڈی لگا کر بند کیئے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ مین گیٹ کو بھی تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کو اپنے سسٹم پر یقین ہے کہ یہاں سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔

"میں چپکے سے حویلی سے باہر نکلا اور ایک سمت کا تعین کر کے اندھا دھند دوڑ لگا دی۔ رات اندھیری تھی اور اس رات دھند بھی شدید تھی۔ اچانک میرا پاؤں کسی لکڑی کے ڈنڈے سے ٹکرایا اور میں منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ قریب تھا کہ میں منہ کے بل گھسٹتا ہوا گہری کھائی میں جا گرتا مگر شاید خدا کو میری زندگی منظور تھی کہ میں نے گرتے ہی اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین کے ساتھ طاقت سے پنچ کرتے ہوئے اپنے آپ کو روک لیا۔ ورنہ میرا اوپر والا دھڑ تو گہری کھائی میں جا چکا تھا۔ جونہی میرے وجود کو بریک لگی تو ایک انجانے خوف سے میں نے اپنے آپ کو پوری طاقت سے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ بس یہ چند لمحوں کا کھیل تھا اور خدا نے مجھے بچا لیا۔ جب میں گھسٹتے ہوئے کھائی کی طرف جا رہا تھا تو میرے ہاتھوں اور جسم سے کچھ کنکر اور مٹی وغیرہ کھائی میں جا گری تھی اور اس کے نیچے کہیں تہہ میں گرنے کی آواز سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کافی گہری کھائی ہے۔

اس حادثے میں مجھے چہرے اور ہاتھوں پر کچھ چوٹیں بھی آئیں۔ جو تم دیکھ رہی ہو مگر یہ قابل برداشت تھیں۔ میرا ماتھا پھٹ چکا تھا۔ جس کو میں نے مفلر سے کس کر باندھ لیا تھا۔ کچھ سردی کی شدت نے بھی میرے زخموں سے رسنے والے خون کو جلد ہی بند کر دیا تھا۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو مجھے ان کے اس ٹریپ کی سمجھ آ گئی۔ جو کہ ان لوگوں نے یہاں سے بھاگنے والوں کے لیے لگا رکھا تھا۔ ان لوگوں نے باریک نائیلون کی ڈوری پر امر بیل کو لپیٹ رکھا تھا۔ اور اس کے چالیس فٹ نیچے گہری کھائی تھی۔ میں نے امر بیل کو ادھر ادھر ہٹا کر نیچے دیکھنے کی کوشش کی تو سوائے اندھیرے کے مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔

"میں اٹھا اور اس کھائی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا کہ کہیں تو کوئی جگہ ہوگی جہاں سے میں نکل سکوں، مگر چلتے چلتے میں جب اس جگہ پر پہنچا جہاں سے ان لوگوں کو دن کے اجالے میں آتے جاتے دیکھتا تھا۔ وہاں میں نے نیچے کی طرف دیکھا تو لوہے کی گراریوں اور اس کے اوپر لگی موٹی چین سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ سب مصنوعی پل کا میکنزم ہے۔ جب یہ لوگ یہاں سے گزرتے ہیں تو لوہے کی موٹی پلیٹ لفٹ کی مانند اوپر آ جاتی ہوگی اور جب یہ گزر جاتے ہونگے تو یہ پلیٹ پھر واپس نیچے کہیں گہرائی میں چلی جاتی ہوگی۔

"اس دوران مجھے نہ تو کوئی رکھوالی کا کتا نظر آیا اور نہ ہی کوئی گارڈ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ سکون سے سو رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہاں سے نکلنا اتنا ہی آسان ہوتا تو یہ لوگ مجھ سے یوں بے فکر نہ ہوتے۔ آخر کار مجبور ہو کر میں نے نیچے گہرائی کو ناپنے کی کوشش کی اس کے لیے میں نے قریب ہی پڑے سرکنڈوں کے گٹھوں میں سے تین چار سرکنڈے نکال کر پاس ہی پڑے پولی تھین کے شاپر سے باندھ کر سرکنڈے کا سرا نیچے کیا تو سرکنڈے کا سرا نیچے کی سطح سے ٹکرایا۔ میں نے یہ نکال کر اندازاً ناپا تو یہ چالیس پینتالیس فٹ کے قریب تھا اور اتنی گہرائی میں چھلانگ لگانا یقیناً موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ سو میں آرام سے حویلی میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ صبح جو بندہ ناشتہ دینے آیا وہ مرہم پٹی کا سامان بھی ساتھ لایا تھا۔"

"تمہیں منع بھی کیا تھا مگر تم باز نہیں آئے۔" اس نے کہا۔

"آپ لوگوں کو کیسے معلوم ہوا۔" تو اس نے کہا۔

"رات تمہاری ساری کارروائی کے دوران ایک بندہ تمہارے پیچھے تھا اور تمہارا گرنا اتفاقی نہیں تھا اگر رات دھند نہ ہوتی تو شاید تم اس بندے کو دیکھ ہی لیتے جس نے تمہارے پاؤں کے درمیان لکڑی کا چھوٹا سا ڈنڈا پھینک کر گرنے پر مجبور کیا تھا۔ تاکہ تم کہیں گہری کھائی میں گر کر مر نہ جاؤ اور اگر ایسا ہوتا تو ہمارا بیس کروڑ کا نقصان ہو جاتا۔ آؤ اب ناشتہ کرنے سے پہلے پٹی کروا لو۔ اس کے بعد میں تمہیں کچھ پین کلرز اور اینٹی بائیوٹک ٹیبلٹ دیتا ہوں۔ وہ کھاؤ اور آرام سے لمبی تان کر سو جاؤ۔ تاکہ تم جلد از جلد صحت مند ہو جاؤ اور ہم معاہدے کے مطابق تمہیں تمہارے والدین کو واپس کر سکیں۔ کیونکہ ہمارے صاحب معاہدے کی خلاف ورزی کے سخت خلاف ہیں۔"

"میری مرہم پٹی ہو چکی تھی اور میں ناشتہ بھی کر چکا تھا اس نے مجھے کچھ ٹیبلٹس کھلائیں اور چلا گیا۔"

"تم نے اس دوران کہیں پہ کیمرے وغیرہ تو لگے ہوئے نہیں دیکھے؟" میں نے پوچھا۔

"ذکیہ بہن! اس سسٹم کو میں سمجھتا ہوں۔ جو مجھے نظر آیا تو یہ صرف مین گیٹ پر ہے اس کے علاوہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔"

"خرم اب میری بات ذرا دھیان سے سنو۔ کچھ بھی ہو کل رات بارہ بجے کے بعد ہم یہاں سے نکل جائیں گے اور اب جا کر غور سے اپنے کمرے، پوری چار دیواری برآمدہ وغیرہ ہر چیز کو چیک کر لو۔ جہاں کہیں بھی کیمرہ لگا ہوا ہے تو کل رات تمہیں اس سے بچ کر نکلنا ہے اور اگر تمہارے کمرے میں کیمرہ لگا ہو تو تم ایسا کرنا کہ جہاں وہ تمہارے بیڈ کی لوکیشن واضح کر رہا ہو اس کے آگے کوئی کپڑا وغیرہ ڈال دینا۔ جب تم سونے کے لیے بیڈ پر لیٹو تو تمام لائٹس آف کر دینا۔ جب تم نکلنے لگو تو خیال رکھنا کہ کیمرے کی زد میں نہ آؤ۔ ٹھیک بارہ تیس پر تمہیں یہیں چوبارے پر موجود ہونا چاہیے۔"

''ٹھیک ہے باجی! میں بھی اس جہنم سے نکلنے کے لیے بے تاب ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی بہتر حل نکال لیں گی۔''

''یقین رکھو پرسوں شام ہم لاہور میں اکٹھے شام کا کھانا کھائیں گے۔ وہاں سے ہم تمہیں کراچی تمہارے پاپا کے پاس خود چھوڑنے جائیں گے۔''

جدا ہوتے ہوئے ایک دفعہ پھر خرم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اسے تسلی دی اور اسے روانہ کر دیا اس کے بعد میں نے سارے پورشن کا جائزہ لیا۔ مگر کہیں بھی مجھے کیمرہ نظر نہیں آیا۔ اگر پھر بھی کہیں کوئی پوشیدہ کیمرہ تھا تو یہ کمال کی فنکاری تھی۔

مجھے یہاں سے کیسے نکلنا تھا اس کے بارے میں میں ساری پلاننگ کر چکی تھی۔ اب مجھے انتظار تھا اس شخصیت کا جس نے مجھے اغوا کروایا تھا اور جو مجھ سے نکاح کا خواہشمند تھا۔ میں اس سے ملے اور دو دو ہاتھ کیے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ پھر خرم بھائی کو بھی تو ساتھ لے جانا تھا۔ دوسرے دن عصر کے بعد ایک عورت اور اس کے ساتھ ایک لڑکی آئی جو کہ یقیناً بیوٹیشن اور اس کی ساتھی تھی۔ ان کے پاس میرے سائز کا عروسی جوڑا بھی تھا۔ جو کہ اس نے میک اپ مکمل کرنے کے بعد مجھے پہنا دیا میک اپ کے دوران میں نے اس سے بات کرنا چاہی مگر اس نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا میک اپ کرنے کے بعد اس نے مجھے دلہن کا عروسی جوڑا بھی پہنا دیا۔ اس کی ساتھی لڑکی نے کمرے میں میری سیج بھی تیار کر دی تھی۔ کام مکمل ہونے کے بعد وہ دونوں چلی گئیں۔

اسٹیج تیار تھا۔ بس ڈرامہ پلے ہونا باقی تھا۔ اس کے لیے اداکار کا انتظار تھا اور وہ اداکار آنے ہی والا تھا۔ میں سراپا منتظر تھی کہ وہ آئے اور یہ سسپنس ختم ہو اور رات کے تقریباً نو بجے وہ پہنچ ہی گیا۔

مگر یہ کیا، یہ تو سندھی اجرک پہنے میرا تایازاد بھائی وڈیرہ رب نواز تھا۔ میں حیرانی کے عالم میں سیج سے کھڑی ہو گئی۔

''بھائی رب نواز آپ......''

''بھائی کہہ کر میرا موڈ خراب مت کرو جان من۔''

''مگر کزن! یہ تو ہمارے گھر کا معاملہ تھا۔ جو کہ گھر میں ہی حل ہو سکتا تھا تمہیں مجھ کو اغوا کروانے کی کیا ضرورت تھی۔''

''گھر کا معاملہ! تمہارے باپ نے جو میرے بابا کی بے عزتی کی کیا سوچ کر کی۔ آخر کو اسے سوچنا چاہیے تھا کہ اس کا اور ہمارا رشتہ کیا ہے اور تم بھی تو اتھری گھوڑی کی طرح کسی کے ہاتھ ہی نہیں آتی تھیں۔ میں نے کئی بار تم سے فون پر بات کرنا چاہی اور گھر آکر بھی کئی بار تمہیں منانا چاہا۔ مگر تمہارا دماغ تو ساتویں آسمان سے نیچے اترتا ہی نہیں تھا۔ تم تو مجھے یوں سمجھتی تھیں کہ جیسے میں زمین پر رینگنے والا کوئی کیڑا مکوڑا ہوں۔''

''رب نواز! اب پرانی باتوں کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اگر تم نے اب یہی باتیں کرنی ہیں تو شوق سے کرتے رہو۔'' میں نے ہلکی سی ناراضگی دکھائی۔

یہی تو بات ہے تمہاری، جو میرا من موہ لیتی ہے۔ یاد ہیں تمہیں وہ بچپن کے دن جب تم دادا جان کی حویلی میں ہم سے ملنے آیا کرتی تھیں اور ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ اکثر جب تم میرے داؤ میں آجاتی تھیں تو ایسے ہی مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے مجھے مات دے دیتی تھیں مگر اب وہ وقت گزر چکا ہے۔ اب میں جوان ہو چکا ہوں اور تمہاری سب چالوں کو خوب سمجھتا ہوں اب میں عدالت سے پکے کاغذات بنوا کر لایا ہوں۔ اس پر تمہارے سائن کرواؤں گا اور تمہیں اپنے دل کی رانی بنا کر حویلی کے تہہ خانے میں

رکھوں گا۔ تمہارے ابو کی گردن میں جو سریا آگیا ہے ناں! وہ تو میں ایسا سیدھا کروں گا کہ دوبارہ ضرورت ہی نہیں پڑی گی۔''

''کیا مطلب رب نواز! تم کیا کرو گے میرے ابو کے ساتھ؟''

''ٹائیں ٹائیں فش جان من، ٹائیں ٹائیں فش۔ اس کا مطلب تو تم سمجھتی ہو گی کہ کیا ہے آسان لفظوں میں سمجھاتا ہوں تم سے نکاح کے پیپر سائن کرانے کے بعد ہم ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیں گے اور ان کی تمام جائداد خود بخود ہماری ہو جائے گی۔''

''رب نواز! میں اپنی اور بابا کی تمام غلطیوں کی تم سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ جیتے اور ہم ہارے۔ جب تم ان کاغذات پر سائن کروالو گے تو اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے ہمارے درمیان۔ میں بابا سے بھی بات کر لوں گی تم عزت سے آنا اور مجھے بیاہ کر لے جانا۔''

''کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو کہ میں تمہاری چالوں کو نہ سمجھ سکوں۔''

''رب نواز! میں تمہیں بڑے پیار سے کہہ رہی ہوں اور تم ہو کہ مانتے ہی نہیں۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رانو آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا۔ جس میں ولایتی شراب کی دو بوتلیں اور ہوانا کے قیمتی سگاروں کا ایک پیکٹ تھا۔ وہ اس نے ٹیبل پر رکھا اور چلی گئی۔ باقی لوازمات میز پر پہلے ہی رکھے ہوئے تھے۔ رب نواز نے شراب کی بوتل کھولی اور ایک پیگ بنا کر چسکی لی۔ اس کے بعد اس نے بے دریغ تین چار پیگ بنائے اور چڑھا لیے۔ اب اس نے ایک طویل ڈکار لی اور سگار سلگا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ مزید اب بھی ایک گلاس میں آدھا پیگ پڑا تھا۔ اور وہ اس کی چسکی لگا کر ہلکے ہلکے سرور میں آرہا تھا۔

میں نے مزید یہ کیا کہ اس کی ساقی گری کے فرائض سنبھال لیے اور اس کی شراب میں وہ ٹیبلٹ ملا دی جس کا ایک پتا مجھے رانو کے کچن میں رکھے سامان سے دن کو ہی مل گیا تھا۔ سرور میں تو وہ پہلے ہی آچکا تھا اور وہ وقت جلد ہی آگیا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ جونہی میں نے اسے ڈانواں ڈول ہوتے دیکھا تو میں نے پیار سے اسے باہوں میں بھر کر بستر پر لٹا دیا۔

اس پورشن میں آج رات میرے اور وڈیرے رب نواز کے علاوہ کوئی نہ تھا اور دروازوں کو تالا لگانے کا رواج تو شاید سرے سے اس حویلی میں موجود ہی نہ تھا۔ اس لیے مجھے گھر سے ہی اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ مل گئیں۔ میں نے بیڈ شیٹوں کو پھاڑ کر موٹے رسے کی شکل دے دی تھی اور باقی تمام ضروری اوزار ایک تھیلے میں ڈال کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیے تھے۔ میں چاہتی تو وڈیرے رب نواز کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی تھی۔ مگر میرے یوگا کے انسٹرکٹر نے میری تربیت ہی کچھ ایسی کی تھی کہ اپنے دفاع کے علاوہ میں نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔

ٹھیک بارہ بجے میں چوبارے پر تھی۔ خرم وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے اینٹوں کے ایک مضبوط رخنے میں بیڈ شیٹوں سے بنا موٹا رسا ڈال کر باندھا اور بقیہ رسہ نیچے پھینک دیا۔ میں نے خرم سے کہا۔

''کیا تم اس رسے کو پکڑ کے نیچے اتر سکتے ہو؟''

''جی، بالکل آپ فکر نہ کریں۔ میں نے کراچی میں بوائے اسکاؤٹ ٹریننگ کے دوران یہ سب سیکھا تھا۔''

پھر بھی مجھے اس کی طرف سے فکر تھی کہ وہ شاید ایسا نہ کر سکے۔ حویلی کے گیٹ پر تالا تو نہیں تھا مگر وہاں سیکورٹی کیمرہ لگا ہوا تھا اور میں فی الحال کوئی رسک

نہیں لینا چاہتی تھی۔ میں نے ایک دوسری رسی جو کسی دوسرے مقصد کے لیے بنائی تھی۔ وہ اس کی کمر کے گرد لپیٹی اور اللہ کا نام لے کر اسے نیچے روانہ کر دیا۔ خرم بڑی مہارت کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ نیچے اترنے کے بعد اس نے وہ رسی جو کہ اس کی کمر سے لپٹی ہوئی تھی وہ اپنی کمر سے کھول دی اور میں نے وہ رسی اوپر کھینچ لی۔

اس کے بعد میں نے وہ رسی پہلے والے رسے کی گرہ سے اٹیچ کی اور پھرتی سے نیچے اترتی چلی گئی۔ نیچے پہنچتے ہی میں نے رسی کو جھٹکے کے ساتھ نیچے کی طرف کھینچا۔ اس سے وہ گرہ کھل گئی جس کے ساتھ موٹا رسا بندھا ہوا تھا۔ اس سے موٹا رسا بھی نیچے آ گیا' میں نے دونوں رسوں کو قریب کیا۔ حویلی کی تمام بیرونی لائٹس آف تھیں۔ اس حویلی کا ماسٹر مائنڈ شاید کچھ خبطی سا تھا اور مجھے تو وہ نفسیاتی مریض ہی لگتا تھا بہر حال میں اس کی شکر گزار تھی کہ اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے مجھے کافی فائدہ ہوا تھا۔

ہم دونوں اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کھائی تک پہنچے۔ میں نے ایک درخت کے تنے سے جو کہ بالکل کھائی کے قریب تھا موٹا رسہ باندھا اور ایک دفعہ پھر خرم کو نیچے بھیجا۔ اس کے بعد میں بھی نیچے اتر گئی۔ ایک دفعہ پھر میں نے دونوں رسوں کو بھی قریب کر لیا۔ مگر یہاں ایک نئی چیز ہماری منتظر تھی۔ فرش سے تقریباً چھ سات فٹ اوپر موٹے رسے کا مضبوط جال موجود تھا جو کہ دونوں طرف کی دیواروں میں لگے مضبوط کیلوں سے بندھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہاں کوئی گر بھی جاتا تو محفوظ رہتا اور ہم اس جال کے اوپر کھڑے تھے۔

ایک بات جو مجھے بار بار کھٹک رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ یہاں سے نکلنا یقیناً اتنا آسان نہ تھا۔ جتنا نظر آرہا تھا۔ ان لوگوں نے کوئی نہ کوئی جال تیار کر رکھا تھا جو فی الحال ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ اس لیے میں بے حد محتاط تھی۔

''باجی! اب کیا کریں۔'' خرم نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''بھیا میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ۔ خبردار کوئی شور وغیرہ نہ ہو بے حد احتیاط سے۔''

ہم موٹے رسے کے جال پر چل رہے تھے۔ میری نظریں فرش پر اور اس کے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اچانک میں نے ایک دروازہ دیکھا جو حویلی کی مخالف سائیڈ پر تھا۔ میں نے سوچا کام بن گیا۔ میں نے جلدی سے اپنے اوزاروں کے تھیلے سے سبزی کاٹنے والی چھری نکالی اور رسے کو اتنی حد تک کاٹا کہ اس میں سے آسانی سے گزرا جا سکے۔ میں نے خرم کو اشارہ کیا وہ رسے کے جال سے نکل کے نیچے پہنچ گیا اور اس کے بعد میں بھی فرش پر نیچے پہنچ گئی۔

فرش بالکل پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ مگر یہاں پر دروازے کی موجودگی سمجھ سے باہر تھی اور یہاں دروازے پر تالا بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کھائی کا ایک راؤنڈ کر لینا بہتر سمجھا۔ ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ حویلی کی سائڈ پر بھی ایک دروازہ نظر آیا اور اس دروازے کو بھی تالا لگا ہوا تھا۔ الغرض یہاں چار مختلف سمتوں میں چار دروازے تھے جو کہ حویلی کی مخالف سمتوں میں تھے اور سبھی کو تالے لگے ہوئے تھے۔ جبکہ حویلی کی سائیڈ پر ایک ہی دروازہ تھا۔ میں حیران و پریشان کھڑی سوچ رہی تھی کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے اور پھر ایک خیال کے تحت میں نے حویلی کی سائیڈ والے دروازے کے تالے میں اپنے بالوں کی ہیئر پن ڈالی۔ تالوں کو کھولنے کی ترکیب بھی مجھے یوگا کے استاد نے سکھائی تھی۔ جو کہ ہر فن مولا تھے۔

دو منٹ کی مسلسل جدو جہد کے بعد تالا کھل گیا۔ یہ لوہے کا دروازہ تھا۔ میں نے آہستگی سے اسے کھولا اور بڑی احتیاط سے ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ خرم میرے پیچھے ہی تھا۔ اندر ایک نیا جہان آباد تھا۔ جہاں ہم داخل ہوئے تھے وہاں کاٹھ کباڑ رکھا ہوا تھا۔ تھوڑی دور انرجی سیور کی روشنی میں مجھے کچھ آدمی کام کرتے ہوئے نظر آئے۔ وہ کسی چیز کو چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں پیک کر رہے تھے۔ میں اور خرم کاٹھ کباڑ کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔

''باجی یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' خرم نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''تم خاموشی سے ذرا پیچھے جا کر کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ میں حالات کا جائزہ لے کر ابھی آتی ہوں اور یہ بھی دیکھتی ہوں کہ یہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ ہے تو ہم اسے کیسے استعمال کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ذرا جلدی آنا اور اپنا خیال رکھنا۔'' اس نے کہا۔

''میں ابھی آئی۔'' میں نے یہ کہہ کر خرم کو کاٹھ کباڑ کے پیچھے چھپا دیا اور خود دیوار کی اوٹ سے ہوتی ہوئی آگے بڑھی۔ غور سے جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ یہ تقریباً پانچ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تہہ خانہ ہے۔ جس کے چاروں طرف گہری کھائی ہے اور جسے میں خود اپنے آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔

ایک جگہ ایمبولینس کھڑی تھی۔ وہ لوگ جو پیکنگ کر رہے تھے۔ اب وہ پیکنگ ختم کر کے پیک کیے ہوئے ڈبے لا کر ایمبولینس میں رکھ رہے تھے۔ میں ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ جب وہ تمام ڈبے لا کر رکھ چکے تو انہوں نے ایمبولینس کے فرش سے سیٹوں سے نیچے ایک خانہ کھولا اور اس میں تمام ڈبے ایک ایک کر کے رکھتے گئے۔ وقفے وقفے سے وہ چھوٹے سے سریے کو خانے میں ڈال کر ڈبوں کو آگے پیچھے بھی کر رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اندر کسی کمرے سے کفن میں لپٹی ایک لاش برآمد کی اور اسے اسٹریچر پر لا کر ایمبولینس میں رکھ دیا۔ میں یہ سب کچھ دیکھنے میں اتنا محو تھی کہ اچانک پیچھے سے کسی نے میری کنپٹی سے پستول کی نال لگائی اور کہا۔

''خبردار! ہلنا مت ورنہ تمہارا بھیجہ اڑا دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹارچ جلائی اور میرا چہرہ دیکھا۔

''اوہو میڈم! آپ ادھر کیا کر رہی ہو۔ آپ کا تو آج ہی نکاح ہوا ہے اور آپ کو تو حجلہ عروسی میں ہونا چاہئے تھا اور کہاں آپ ہماری جاسوسی کر رہی ہو۔ تم یہاں کیسے چلی آئیں کمال ہے۔ بھئی لگتا ہے تم خاصی ہوشیار قسم کی لڑکی ہو۔ تمہارا تو خاص خیال رکھنا پڑے گا۔ چلو اچھے بچوں کی طرح ہاتھ پیچھے کرو۔'' سچویشن ایسی تھی کہ مجھے چارو ناچار ہاتھ پیچھے کرنے پڑے۔ جونہی میں نے ہاتھ پیچھے کیے اس نے کھٹکے سے میرے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں ڈال دیں اور ایک زبردست قسم کا مکا میری کمر میں جڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے میری دونوں ٹانگوں کو پیچھے سے پاؤں کی ٹھوکر مار کر مجھے زمین پر چت لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں بری طرح اس کے جال میں پھنس چکی تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''سالا گاؤدی قسم کا ہمارا باس ہے۔ پتہ نہیں اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ ایسے لوگوں کو کھلے عام بھاگنے کی چھٹی دے کر ہمارا جینا حرام کیا ہوا ہے بے وقوف نے۔ اب بھگتو اوئے طافو! ذرا ادھر آؤ۔''

''ابھی آیا سر جی' ذرا ایمبولینس والوں کو فارغ کر دوں' تھوڑی دیر لگے گی۔'' اندر کہیں کسی کمرے سے آواز آئی۔

''اچھا اچھا' ٹھیک ہے۔''

ابھی اس نے یہ الفاظ ادا کیے ہی تھے کہ اچانک ٹھک کی آواز آئی اور وہ دھڑام سے مجھ پر آ گرا۔ میں نے گردن پیچھے موڑ کر دیکھا۔ تو خرم ہاتھ میں سریا لیے کھڑا تھا۔ اور اس نے پستول بردار کو مار گرایا تھا اور ایک دفعہ پھر اسے مارنے کی تیاری کر رہا تھا۔

''بس خرم بھائی! اس کا کام ہو چکا ہے۔ تم ایسا کرو کہ اسے مجھ پر سے اتارو۔ اور اس کی جیبوں سے ہتھکڑی کی چابی نکالو۔'' میں نے اسے کہا۔

''ٹھیک ہے باجی۔'' یہ کہہ کر خرم نے اس شخص کو مجھ سے پرے ہٹایا اور اس کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اتنی دیر میں میں اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے چابی سے میری ہتھکڑی کھول دی۔

''تم کب آئے خرم؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہیں آنے میں دیر ہوئی تو میں گھبرا کر حالات کا جائزہ لینے کے لیے نکلا تھا۔ آتے ہوئے میں نے لوہے کی راڈ بھی اٹھالی تھی۔ جب میں یہاں پہنچا تو آپ کو اس صورت حال میں پایا۔ یہ دیکھ کر میں نے فوری طور پر آہستگی سے پیچھے سے اس شخص کے سر میں لوہے کی راڈ ٹھوک دی۔'' اس نے کہا۔

''میرے پیارے بھائی' اگر آج تم نہ آتے تو ہم پکڑے جاتے اور جانے یہ لوگ ہم سے کیا سلوک کرتے اور ہاں اب بالکل خاموش ہو کر دیوار سے چپک کر کھڑے ہو جاؤ۔ اس کا دوسرا ساتھی آنے ہی والا ہوگا اور ہمیں ہر حال میں اسے قابو کرنا ہے۔''

جس گارڈ کے سر کے پچھلے حصے پر خرم نے لوہے کا راڈ مارا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر پڑا تھا۔ سر کے عقبی حصے میں لوہے کی راڈ سے لگنے والی چوٹ نے اسے بے ہوش کر دیا تھا اور وہ کمرے کے عقبی حصے کی دوسری سائیڈ پر پڑا تھا۔ میں نے خرم کی مدد سے اسے گھسیٹ کر کمروں کے عقبی حصے میں لے جا کر لمبا لٹا دیا اور اس شخص کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کم از کم دو گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ میں نے اس کا پستول پہلے ہی اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

اس کے بعد میں اور خرم بھاگ کر کمروں کی دوسری سائیڈ پر کھڑے ہو گئے۔ مجھے طافو کی بے خبری سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اس تہہ خانے میں کچھ فاصلے سے انرجی سیور لگے ہوئے تھے جن سے مناسب روشنی ہو رہی تھی۔

میں نے خرم سے لوہے کا راڈ لے کر اس کے ایک سرے پر اپنے مفلر کو ہلکے سے لپیٹا۔ اور اسے آہستگی سے انرجی سیور کے چھوٹے سے خلا میں گھسیڑ کر ادھر ادھر ہلایا۔ تو وہ ایک ہلکے سے کھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ کوریڈور میں ہماری منشاء کے مطابق اندھیرا ہو گیا تھا۔ دوسرا انرجی سیور کافی فاصلے پر تھا۔ اور اس کی ہلکی ہلکی روشنی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ خرم نے انرجی سیور کے ٹکڑے اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیئے۔

اچانک سناٹے میں ایمبولینس کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ایمبولینس کی اگلی لائیٹس آن تھیں۔ مگر یہ کیا؟ ایمبولینس دوسری طرف جانے کی بجائے مڑ کر ہماری طرف آ رہی تھی۔

ایمبولینس جہاں سے مڑ کر آ رہی تھی۔ وہاں سے اسے ایک اور موڑ مڑ کر ہماری طرف آنا تھا۔ اور اس کا یہ سفر چند لمحوں میں طے ہونے والا تھا اور جونہی ایمبولینس موڑ مڑتی۔ ہم روشنی کی زد میں آ جاتے اور پکڑے جاتے۔ یہ سب سوچنے میں مجھے سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی نہ لگا۔

''خرم بھاگو! کمروں کے عقبی طرف' جلدی۔'' میں نے خرم سے کہا۔

خرم اور میں چند لمحوں میں کمروں کے عقبی طرف پہنچے اور اس کے ساتھ ہی کوریڈور میں ایمبولینس داخل

ہو گئی۔ مگر اس سے پہلے ہم ان کی نظروں میں آئے بغیر کمروں کی عقبی سمت میں پہنچ چکے تھے۔ چند لمحوں میں ایمبولینس کوریڈور سے نکلی اور تیزی سے مخالف سمت میں چلی گئی۔

''سلیم صاحب آپ کہاں ہیں؟'' طافو نامی بندہ بھی کوریڈور میں داخل ہو چکا تھا اور اپنے ساتھی کو آوازیں دے رہا تھا۔

سلیم صاحب اس کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ وہ اسے تلاش کرتا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا۔ عقبی حصے میں مکمل اندھیرا تھا۔ جونہی وہ ہماری رینج میں آیا۔ میں نے یک لخت پستول کی نال اس کی کھوپڑی سے لگا دی اور تیزی سے دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جما کر انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

''خبردار! اب اگر ایک بھی لفظ تمہارے منہ سے نکلا تو پستول کی گولی تمہاری کھوپڑی توڑتی ہوئی دوسری طرف سے نکل جائے گی۔ خرم آگے بڑھو اور اس کی تلاشی لو۔'' میں نے خرم سے کہا۔

خرم نے اس کی سر سے لے کر پاؤں تک تلاشی لی۔ مگر اس کے پاس سے اسلحہ نام کی کوئی شئے برآمد نہ ہوئی۔

''میڈم میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ آپ کو یہاں آئے ہوئے آج دوسری رات ہے اور میں نے سنا ہے کہ آج ہی آپ کا ہمارے باس کے پارٹنر سے زبردستی نکاح ہوا ہے۔ بہتر ہوگا میڈم آپ ابھی اور اسی وقت واپس اپنے کمرے میں چلی جائیں اور یہاں سے بھاگنے کا خیال بھی دل سے نکال دیں۔''

ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ میں نے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ اور اسے گریبان سے پکڑ کر کمروں کے عقبی طرف اندھیرے میں گھسیٹ لیا۔

''میں تمہاری تقریر سننے یہاں نہیں آئی بے غیرت' ہاتھ پیچھے موڑو۔''

اس نے جونہی ہاتھ پیچھے موڑے۔ خرم نے اس کے ہاتھوں کو نائیلون کی مضبوط رسی سے باندھ دیا۔ جو میں اسی مقصد سے ساتھ لائی تھی۔ ہاتھ پشت پر باندھنے کے بعد ہم نے اس کے پاؤں بھی باندھ دیئے۔

''مجھے اپنے چند سوالوں کے صحیح صحیح جواب درکار ہیں۔ شرافت سے جواب دو گے یا پھر مجھے کچھ تکلیف دہ فارمولے آزمانے پڑیں گے۔''

''میڈم آپ یونہی تکلیف کر رہی ہیں۔ مجھے آپ سے جھوٹ بولنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جو اپنے کمرے میں پاگل ہمارا باس سویا ہوا ہے۔ وہ پہلے بھی اس سلسلے میں ہمارے کئی بندے مروا چکا ہے۔ وہ مغویوں کو بھاگنے کی کھلی چھٹی دیتا ہے اور وہ یہاں سے بھاگنے کے چکر میں ہمارے کئی بندوں کو مار چکے ہیں۔ مگر یہاں سے نکل وہ بھی نہیں سکے۔ تھک ہار کر یا تو انہوں نے خودکشی کر لی یا ہمارے گارڈز نے انہیں مار ڈالا یا پھر ان کے وارثوں نے رقم کی ادائیگی کر دی اور وہ یہاں سے چلے گئے۔ مگر میں نے آج تک کسی بھی مغوی کو یہاں سے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

''آپ اگر مجھے مار کے یہاں سے بھاگ سکتی ہیں تو میں سو بار مرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ مجھے اب جی کے کرنا بھی کیا ہے۔ پچھلے دو سالوں سے میں خود بھی یہاں قید ہوں۔ مجھے بھی یہ لوگ ایک دن یہاں اغوا کر کے لائے تھے۔ مگر میرے گھر والوں کے پاس ادائیگی کے لیے رقم نہ تھی۔ کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ ہم کب کے دیوالیہ ہو چکے تھے۔ صرف ظاہری رکھ رکھاؤ تھا۔ رقم نہ ملنے پر ان لوگوں نے مجھ سے یہاں کام کرانا شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے بھاگنے کی کئی بار کوشش کی۔ مگر میں ہر بار پکڑا گیا۔ تھک ہار کر میں ان لوگوں کے سسٹم کا حصہ بن گیا۔

اب ہر ماہ ایک مخصوص رقم میرے گھر والوں کو ادا کر دی جاتی ہے۔ مگر میں خود ان لوگوں کا قیدی ہی ہوں۔ نہ میرے گھر والوں کو میرا پتہ ہے نہ مجھے ان کے حالات کا۔ مگر باس کہتے ہیں کہ رقم انہیں دی جا رہی ہے یہ جھوٹ ہے یا سچ۔ میرے پاس باس کی بات کا اعتبار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔“

”مجھے تمہاری کہانی سننے کا کوئی شوق نہیں۔ سچ اور جھوٹ کا اندازہ میں خود لگا لوں گی۔ اگر تم سچے ہو تو پھر تمہیں سچے دل سے ہماری مدد کرنی چاہیے۔ بولو اس وقت اس تہہ خانے میں تمہارے سوا کون کون ہے؟“

”تہہ خانے میں اس وقت سلیم صاحب کے سوا کوئی بھی بندہ گشت پر نہیں ہوتا۔ جو یہاں آپ کے سامنے پڑا ہے۔ کیونکہ یہاں سارا کام دن کو ہوتا ہے رات کو صرف ڈلیوری دینا ہوتی ہے اور وہ بھی کبھی کبھار ہفتے میں تین چار بار بھی ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی ہفتے میں ایک بار بھی نہیں ہوتی۔ ویسے کچھ پورشنز کے باہر ایک آدھ گارڈ کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ مگر یہ تین چار بندے ہوتے ہیں جو کہ اپنی پوسٹ پر موجود رہنے کے پابند ہوتے ہیں۔“

”یہ بندے کس کس پورشن کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔“

”باس کا پورشن ہے۔ اس کے علاوہ ایکسچینج اور پاور جنریٹر روم کے سامنے ایک ایک بندہ موجود ہوتا ہے۔“

”ایمبولینس کس راستے سے باہر نکلے گی۔“

اس تہہ خانے سے چار راستے ہیں جو مشرق، مغرب اور شمال جنوب کی سمت نکلتے ہیں اور مجھے نہیں علم کہ یہ کون سے راستے سے نکلے گی۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو تہہ خانے سے نکلنے کے اتنے راستے کیسے ہو سکتے ہیں۔“

”میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔ ویسے یہ چاروں راستے چار مختلف کمروں تک جاتے ہیں۔ مگر کمروں کا دروازہ ایک مخصوص کوڈ سے کھلتا ہے۔ جو کہ یہاں پر موجود ہمارے باس کے پاس بھی نہیں۔ وہ صرف ان کے مخصوص نمبر پر فون کرتے ہیں۔ اور وہ جہاں کہیں بھی ہوتا ہے نیٹ پر ایک مخصوص کوڈ پریس کرتا ہے تو کمرے کا دروازہ کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ آگے کیا ہوتا ہے اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ آپ مجھے مارنا چاہیں تو بے شک مار ڈالیں۔“

”طافو! تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم تو مجھے کوئی فلمی کہانی سنا رہے ہو۔ کوئی تو راستہ ہو گا یہاں سے نکلنے کا؟“

”میڈم! راستے تو بہت ہیں مگر وہاں سے کوئی ان لوگوں کی مرضی کے بغیر گزر نہیں سکتا۔ اوپر والی منزل سے ایک راستہ ہے جو لفٹ کے ذریعے آپریٹ ہوتا ہے مگر وہ لفٹ بھی وہی شخص مخصوص کوڈ کے ذریعے آپریٹ کرتا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ یہ ایمبولینس کیسے باہر جائے گی؟“

”یہ ایک لمبا پراسیس ہے۔ غیر ملکیوں کی گاڑی کے علاوہ ہر گاڑی کی آتے اور جاتے ہوئے مکمل چیکنگ ہوتی ہے۔ مین گیٹ پر یہ سارا پراسیس مکمل کیا جاتا ہے۔ یہاں سے گاڑی کا ڈرائیور کمرے تک جا سکتا ہے اور باہر والا ڈرائیور گاڑی کمرے تک چھوڑ سکتا ہے۔“

”اور یہ کمرا کیا بلا ہے؟“

”ڈرائیور سے سنا ہے کہ یہ سپاٹ دیواروں والا چاروں طرف سے بند کمرا ہے۔ اس میں کوئی دروازہ ہے نہ کھڑکی اور چھت بھی دیواروں کی طرح سپاٹ ہے۔“

”کیا مصیبت ہے۔ سبھی راستے بند ہیں۔ مگر وہ جو اوپر کھائی کے ساتھ کافی اونچی خاردار تار لگی ہوئی ہے۔

اگر بندہ کسی طریقے سے وہاں تک پہنچ بھی جائے اور خاردار تار کو کاٹ کر نکلنا چاہے تو نکل سکتا ہے۔“

”میڈم! اس خاردار تار میں ہر وقت کرنٹ رہتا ہے اور اس کی چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ اندر اور باہر دونوں طرف سے اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی بندہ کسی خفیہ جگہ چھپے گارڈ کی گولی کا شکار ہو جاتا ہے۔“

”ان گارڈز کی لوکیشن کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟“

”جی مجھے پتہ نہیں۔“

”بجلی کا سسٹم کیا ہے۔“

”ڈیزل سے چلنے والے دو جنریٹر ہیں ایک چلتا ہے دوسرا اسٹینڈ بائی رہتا ہے۔“

”کیا اسے کسی طریقے سے بند نہیں کیا جا سکتا۔“

”میڈم! یہاں ٹوٹل کمپیوٹر نیٹ کوڈ سسٹم ہے۔ ہر چیز نیٹ سے لاک اور اوپن ہوتی ہے۔ جو بندے ادھر ہیں۔ ان کی اکثریت باہر نہیں جا سکتی اور جو یہاں سے باہر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ مارا جاتا ہے۔ سسٹم چلانے والی مین جگہوں پر جو لوگ کام کر رہے ہیں۔ وہ انتہائی بے حس اور بے ضمیر لوگ ہیں۔ ان کی ماہانہ تنخواہ ہی اتنی ہے۔ کہ ایسی تنخواہوں کا تصور یہاں تو کیا باہر کے کسی ملک میں نہ ہو گا اور ان لوگوں کو یہاں بھی آزادی ہے اور وہ اپنے گھروں کو بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”عجیب گورکھ دھندا ہے اور یہ سب بنا کیسے ہے اور یہاں یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ کیا حکومتی ادارے سو رہے ہیں؟“

”مجھے کنفرم نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی خفیہ حکومتی سائنسی ریسرچ سنٹر ہے۔ جو ہمارے بے ضمیر حکمرانوں کی بے حسی کی وجہ سے کسی غیر ملکی ایجنسی کا اڈہ بن چکا ہے میں نے کئی بار گوروں کو یہاں آتے جاتے دیکھا ہے یہاں ایک جگہ انہوں نے تفتیشی سیل بھی بنا رکھا ہے جہاں کئی دفعہ لوگوں کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا جاتا ہے اور ان میں سے آج تک کوئی زندہ کیا مر کے بھی واپس نہیں گیا۔“

”اور کیا کیا ہوتا ہے یہاں؟“

”منشیات کے دھندے سے لے کر اسلحہ کی سمگلنگ تک۔ بلکہ سچ پوچھو تو میرے خیال میں دہشت گردی کے لیے ملک میں جتنے بھی چھوٹے بڑے بم استعمال ہو رہے ہیں ان کا مٹیریل یہیں سے جا رہا ہے۔“

”یہ جو ایمبولینس ابھی گئی تھی۔ اس میں ایک لاش تھی۔ اس کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہے کہ وہ کس کی تھی؟“

”جی نہیں! لاش کے بارے میں تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس کی تھی۔ مگر لاشوں کی آڑ میں یہ لوگ اکثر منشیات اور دہشت گردی کا سامان ادھر ادھر کرتے رہتے ہیں اور لاش یہ ہمیشہ باہر سے ہی لاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں مرنے والوں کی لاش یہ لوگ ٹکڑے کر کے گٹر میں بہا دیتے ہیں۔“

میں طافو کا ایک طویل انٹرویو کر چکی تھی۔ اگر وہ سچا تھا تو یہ بہت خطرناک صورت حال تھی۔

میں نے خرم کو بلایا جو کہ کوریڈور کے ساتھ عقبی دیوار سے چپکا۔ صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ خرم آیا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ طافو کی ٹانگوں سے بندھی رسی کو کھول دے۔ خرم نے طافو کی رسی کھول دی۔ میں نے اسے کھڑا کیا اور کہا۔

”طافو! اب تمہارے سچ کو پرکھنے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ جو تم چار مختلف اطراف میں کمروں کا بتا رہے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی چیک کرنا ہو تو مین گیٹ کے علاوہ کوئی راستہ ہے۔“

"میڈم! آپ یقیناً کھائی والے راستے سے اندر آئی ہیں۔ آپ نے کھائی کے دوسری طرف چار دروازے مختلف اطراف میں دیکھے ہوں گے۔ اگر آپ ان میں سے کسی کا تالا کھول سکیں۔ تو ہم مین گیٹ سے داخل ہوئے بغیر وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ شارٹ کٹ وی آئی پیز یا پھر باس کے لیے ہے۔"

"تو چلو پھر اسی راستے سے چلتے ہیں۔"

میں نے ایک بار پھر اس کی کنپٹی سے پستول لگایا اور خطرناک لہجے میں کہا۔ "خبردار کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"میڈم! ایک سچ آپ کو اور بتاتا چلوں۔ کہ آپ کے پاس جو پستول ہے ناں! اس کی گولی سے بندہ صرف دو گھنٹوں کے لیے بے ہوش ہوتا ہے مرتا نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے اس کی بار بار دھمکی نہ دیں میں آپ سے ویسے ہی تعاون کر رہا ہوں۔"

"چلو آگے، زیادہ ٹرٹر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے آپ کا اطلاع دینے کا شکریہ۔" یہ کہہ کر میں نے قریب ہی بے ہوش پڑے سیکورٹی گارڈ کی ٹانگ کا نشانہ لے کر گولی چلادی۔ ایک ٹھک کی آواز سے گولی نکلی اور سیکورٹی گارڈ کی ٹانگ میں گھس گئی۔ واقعی یہ خاص قسم کا پستول تھا۔ میں نے سیکورٹی گارڈ کی ٹانگ کو دیکھا تو ربر کی گولی اس کی ٹانگ کے باہر رک گئی تھی۔ مگر اس کے اندر ابھری ایک باریک پن اس کے گوشت میں داخل ہو چکی تھی اور سیکورٹی گارڈ مزید دو گھنٹوں کے لیے بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے طافو کو آگے لگایا اور چل پڑی۔ خرم بھی ہمارے ساتھ تھا۔ جس دروازے سے ہم داخل ہوئے تھے۔ اسی دروازے سے دوبارہ گزر کر ہم گہری کھائی میں پہنچے۔ ہمارے اوپر رسے کا موٹا جال موجود تھا۔ جلد ہی ہم تہہ خانے سے مخالف سمت جانے والے دروازے تک پہنچے۔ تھوڑی سی محنت کرنے کے بعد دروازہ کھل گیا۔ طافو کی معیت میں ہم ایک لمبی سرنگ نما جگہ سے گزرے۔ جو کہ بالکل اندھیری قبر کی طرح تھی۔ گو کہ میرے پاس وڈیرے رب نواز کا لائیٹر موجود تھا۔ جس کے ساتھ لائٹ بھی تھی۔ مگر میں نے اسے جلانا مناسب نہ سمجھا۔ ہم سیڑھی نما جگہ سے نیچے اترے اور اس بڑی سرنگ میں پہنچے جو کہ مکمل طور پر روشن تھی اور مذکورہ کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ جلد ہی ہم کمرے تک پہنچ گئے۔ غور سے جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ یہ کمرا اسٹیل کی بڑی شیٹوں سے بنا ہوا ہے اور ہر طرف کی شیٹ کسی میکنزم سے کھلتی تھی۔ اس کا جو سامنے والا حصہ نظر آ رہا تھا کم از کم پچیس فٹ چوڑا اور پچیس فٹ اونچا ضرور تھا اور یہی حال بڑی سرنگ کا تھا۔ اس میں سے ہر قسم کی ہیوی ٹریفک گزر سکتی تھی۔ میں ادھر ادھر کوئی سوئچ بورڈ تلاش کر رہی تھی کہ ہوسکتا ہے اگر کہیں کوئی سوئچ بورڈ موجود ہو تو اسے کسی طریقے سے آپریٹ کر کے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جاسکے۔

اسی دوران مجھے یوں لگا کہ جیسے کمرے کی دوسری سائڈ پر کوئی گاڑی آ کر رکی ہو اور لازمی بات تھی کہ باہر رکنے والی گاڑی کو اندر ہی آنا تھا۔ یہاں ایک سائیڈ پر تھوڑی سی جگہ موجود تھی اور اس جگہ کافی اندھیرا تھا۔ میں نے خرم سے کہا کہ وہ طافو کو لے کر ادھر ہی آجائے۔ میں نے طافو کو ایک بار پھر دھمکایا کہ وہ آرام سے کھڑا رہے اور کوئی شور وغیرہ نہ کرے اور پھر وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد سرنگ کی سائیڈ والی اسٹیل کی شیٹ آہستہ آہستہ نیچے جا رہی تھی اور ایک وقت آیا کہ یہ بالکل نیچے چلی گئی۔

میں نے دیکھا کہ ایک مرسڈیز گاڑی میں دو گوروں کے درمیان ایک گوری بیٹھی ہوئی تھی اور

ڈرائیونگ سیٹ پر ایک کالا بھجنگ رنگت کا ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے چہرے سے ہی خباثت ٹپک رہی تھی۔ جونہی شیٹ نیچے ہوئی ڈرائیور نے مرسڈیز گیئر میں ڈالی اور زن سے سرنگ کی طرف بڑھا دی جونہی گاڑی سرنگ کی طرف بڑھی اسٹیل کی شیٹ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگی۔ میں نے جلدی سے طافو کو پکڑا اور اسے کمرے کی طرف دھکا دیا۔ وہ رونے اور گڑگڑانے لگا۔

پلیز میڈم! مجھے جانے دیں میں باہر نہیں جانا چاہتا۔ خرم بھی میرے ساتھ تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا خیال ہے باجی! اسے سرنگ میں پھینک دیں یا پھر اسے بھی دو گھنٹے کا ٹیکا لگا دیں۔ میں نے طافو کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ چپ نہ ہوا۔ آخر کار خرم نے اس کی ٹانگ پر پستول سے گولی چلادی۔ گولی لگتے ہی طافو فوری طور پر بے ہوش ہوگیا مگر وہ اب بھی میرے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر ایک سائیڈ پر کر دیا۔ دیوار بند ہو چکی تھی۔ کمرے کی چھت میں انرجی سیور بلب لگا ہوا تھا اور اس سے کمرے میں مناسب روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا یہ واقعی چاروں طرف سے سپاٹ شیٹوں سے بند کمرا تھا۔

میں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر جائزہ لیا کہ شاید کہیں اس میکنزم کو آپریٹ کرنے کے لیے کہیں کوئی سوئچ بورڈ موجود ہو۔ مگر مجھے کہیں بھی کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی۔ میں نے خرم کی طرف دیکھا تو مجھے وہ کافی گھبرایا ہوا نظر آیا۔ میں نے کہا خرم بھائی! کیا ہوا تم کیوں گھبرا رہے ہو

"باجی! پتہ نہیں کیوں اچانک مجھے گھبراہٹ سے ہونے لگی ہے، میرے خیال میں ہم نے اس کمرے میں داخل ہو کے اچھا نہیں کیا۔"

خرم کیا اچھا اور کیا برا بغیر کوشش کیے ہار مان لینا بزدلوں کا شیوہ ہے اور کم از کم میرا پیارا بھائی بزدل نہیں ہوسکتا۔ حوصلے سے کام لو اور بہتری کی امید رکھو۔

باجی، اگر آپ ساتھ نہ ہوتیں تو میں تو کب کا حوصلہ ہار چکا ہوتا۔

میں نے خرم سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر کے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی اور میں اس میں کامیاب رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نارمل ہو چکا تھا۔ اتنی دیر میں کمرے کی چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ لگتا تھا کہ چھت پر بیٹھا کوئی آدمی کام کر رہا ہے۔ اچانک کمرے میں کسی جگہ چھپے ہوئے اسپیکر سے آواز ابھری۔

اس کمرے میں آپ کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ لگتا ہے آپ لوگوں کو ہماری دوستی راس نہیں آئی۔ آپ دونوں کو سمجھایا گیا تھا کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ مگر اس بات کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسی خوشی میں آپ کے کمرے میں پہلا تحفہ ارسال کیا جا رہا ہے امید ہے آپ کو بہت پسند آئے گا۔

ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ چھت میں ایک چوکور چھوٹا سا خلا پیدا ہوا اور اس میں سے ایک تھیلا دھڑام سے نیچے گرا اور خلا دوبارہ بند ہوگیا۔ مگر تھیلے میں سے تیزی سے نکلنے والی مخلوق نے ایک دفعہ تو ہمارے ہوش وحواس ہی اڑا دیے۔

☆☆☆☆☆☆☆

یہ بپھرے ہوئے کئی قسم کے خطرناک اور زہریلے سانپ تھے۔ جو تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ طافو نیچے فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ اسپیکر سے ایک دفعہ پھر آواز ابھری۔

ہمیں آپ کی زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ انتہائی خطرناک اور زہریلے سانپ ہیں۔ بھگوڑوں

کے لیے ہمارا بہترین تحفہ۔ اگر بچ سکتے ہو تو بچو۔ وِش یو گڈ لک۔

اتنے میں خرم لوہے کی وہ سلاخ ہاتھوں میں لے چکا تھا۔ جس سے اس نے گارڈ کو مارا تھا۔ میں تھیلے میں سے وڈیرے رب نواز کا چھپایا ہوا لائیٹر تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ مجھے تھیلے سے مل ہی نہیں رہا تھا۔ خرم نے آگے بڑھ کر سلاخ گھمائی۔ کیونکہ اب اگر وہ سلاخ نہ گھماتا تو سانپ یقیناً طافو کو ڈس لیتے۔ خرم کے سلاخ گھمانے سے سانپ اور زیادہ مچل چکے تھے۔ اب سارے سانپ خرم کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ مگر کمبخت لائیٹر مجھے مل ہی نہیں رہا تھا۔ اچانک چٹ کی آواز آئی اور کمرے میں روشن واحد انرجی سیور بند ہو گیا۔ اور ایک دفعہ سارے ماحول میں تاریکی چھا گئی۔

میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ میں نے لائیٹر آخر رکھا کہاں تھا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ میں نے اسے تھیلے میں ڈالا تھا۔ خرم کے اچھل کود کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ باجی کچھ کرو! سانپوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا ہے اور اسی وقت میں نے ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو لائیٹر مل گیا۔ میں نے ہر ممکنہ تیزی سے اسے روشن کیا اور دیوانہ وار خرم کی طرف بڑھی۔ قریب تھا کہ سانپ اسے ڈس لیتے۔ مگر لائیٹر کی تیز روشنی جونہی ان پر پڑی وہ روشنی کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ دیکھتے ہی خرم نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے سانپوں کی طرف لائیٹر کی روشنی کیے رکھی اور خرم سے پوچھا۔

"بھائی تم بچ تو گئے ہو ناں؟"

"باجی، میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تم فی الحال لائیٹر کی روشنی ان کی طرف کیے رکھو میں ان کا کوئی حل نکالتا ہوں۔ ان کا اس کے سوا کوئی حل نہیں خرم بھائی جو میں نے کر رکھا ہے تم طافو کو گھسیٹ کر دوسرے کونے میں لے چلو میں بھی آہستہ آہستہ وہیں پہ آ رہی ہوں میں سانپوں کی طرف لائٹ کیے کھڑی سوچ رہی تھی کہ ان لوگوں نے یقیناً کہیں خفیہ کیمرے لگا رکھے تھے۔ جو میری نظر میں نہیں آئے تھے یا پھر ان کا کوئی اور نادیدہ سیکورٹی سسٹم تھا کہ انہیں پتہ چل چکا تھا کہ ہم کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ یہ سوچتے سوچتے لائٹ سانپوں کی طرف کیے میں آہستگی سے پیچھے کی طرف لوٹ رہی تھی کہ ایک دفعہ پھر چوکور خلا کھلا اور اس میں سے ایک موٹا پائپ اندر داخل ہوا گویا کوئی نئی مصیبت آنے والی تھی یہ پائپ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔ اس پائپ کی شکل ایسے تھی جیسے ٹیکسٹائل ملوں میں فرش سے کچرا وغیرہ ہوا کے پریشر سے اپنے اندر کھینچنے والا پائپ ہوتا ہے۔ یہ پائپ سانپوں کے سروں کے عین اوپر آ کر رک گیا اور اچانک ہوا کے پریشر نے کمرے میں پڑی ہلکی پھلکی چیزوں کو کھینچنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ ہوا کا پریشر اتنا بڑھا کہ اس نے تمام سانپوں کو اپنے اندر ہڑپ کر لیا۔ اس کے بعد پائپ آہستگی سے اوپر چلا گیا اور چوکور خلا ایک بار پھر بند ہو گیا ایک دفعہ میرے اندر سکون کی ایک طویل لہر سرایت کر گئی۔ میں نے وہیں پہ لائیٹر رکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا تھا۔

اچانک انرجی سیور جل اٹھا اور اسپیکر سے ایک دفعہ پھر آواز ابھری۔

"لگتا ہے ہمارے دوستوں کو پہلا تحفہ پسند نہیں آیا اس لیے وہ ہم نے واپس لے لیا ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کریں، آپ کے لیے کچھ اور خوب صورت تحائف کا بندوبست ہو چکا ہے اور وہ جلد ہی آپ کی

خدمت میں پیش کر دیئے جائیں گے۔"

میں جو پہلے ہی ان کی طرف سے بھری بیٹھی تھی۔ میں نے غصے سے کہا۔ "کتے، بے غیرت، ذلیل اگر تم میری بات سن رہے ہو تو سنو! تمہارے اندر اگر تھوڑی سی بھی غیرت موجود ہے تو سامنے آؤ۔ ہیجڑے کی اولاد۔ کیا عورتوں کی طرح چھپ کر بات کرتے ہو۔"

"میڈم میں تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں غصے میں ہوش نہیں کھوتا۔ بے غیرت میں نہیں آپ لوگ ہیں۔ چند ٹکوں کے عوض بکنے والی قوم کے فرد ہو تم۔ گندی نالی کے کیڑے سے بھی بدتر ہو تم۔"

"چند ضمیر فروشوں کے ٹولے نے تمہیں اس وہم میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جب تمہاری آنکھ کھلے گی تو تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

"اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا کہ وہم میں مبتلا کون تھا تم یا ہم، فی الحال تو آپ اس خوب صورت تحفے کو وصول کرنے کی تیاری کریں جو ہماری طرف سے آپ کے لیے خیر سگالی کا بہترین اظہار ہے اور امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر پائیں گے۔"

ایک چوکور خلا کھلا اور اس میں سے ایک کھلا ہوا تھیلا نمودار ہوا اس میں سے شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہوئی تیزی سے فرش کی طرف آ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ تھیلا خالی ہو گیا اور شہد کی مکھیوں کی کثیر تعداد کمرے میں داخل ہو گئی۔ چوکور خلا بند ہو چکا تھا۔ خرم اور طافو پہلے ہی ایک کونے میں سمٹے ہوئے تھے۔ میں بھی انہی کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔ شہد کی مکھیوں کو اگر تنگ نہ کیا جائے تو وہ کبھی نقصان نہیں پہنچاتیں مسئلہ تب بنتا ہے جب آپ انہیں چھیڑتے ہیں اور رات کے اس پہر انہیں چھیڑ کر ہی یہاں بھیجا گیا تھا۔ کمرے میں انرجی سیور کی روشنی ہو رہی تھی۔ طافو تو ویسے ہی بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے خرم کو سمجھایا کہ وہ آرام سے بیٹھا رہے اور مکھیوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ہاتھ مت ہلائے۔

مگر میں ابھی یہ بات کر ہی رہی تھی کہ کمرے میں ایک عجیب و غریب کیڑا نما مخلوق جانے کہاں سے ٹپک پڑی۔ یہ یقیناً کسی درز وغیرہ سے داخل کی گئی تھی اور اس کے کمرے میں تیزی سے داخل ہونے کی وجہ سے ایک عجیب سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ یہ کوئی خاص قسم کا کیڑا تھا جو یقینی طور پر پیوند کاری سائنس کا کرشمہ تھا اور لگتا تھا کہ یہ تحفہ امپورٹڈ تھا۔

میں آج بھی جب اس وقت کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہمارے لیے شہد کی مکھیوں سے نمٹنا ہی کسی عذاب سے کم نہ تھا کجا یہ کہ ان خاص قسم کے خونخوار کیڑوں نے ہمارا جینا حرام کر دیا ان کیڑوں نے ہمیں اس درد سے روشناس کروایا جو بیان سے باہر تھا۔ یہ کیڑے آناً فاناً پورے کمرے میں پھیل چکے تھے اور انتہائی تیزی سے ہمارے جسموں سے چمٹ رہے تھے اور انہیں جسم سے اتارنے کے لیے مجبوراً ہمیں حرکت میں آنا پڑا اور اس حرکت میں آنے نے ہمیں تگنی کا ناچ نچا دیا۔ یہاں تک کہ طافو جو دو گھنٹوں کے لیے بے ہوش پڑا تھا۔ وہ بھی اٹھ چکا تھا اور انتہائی کرب ناک انداز میں بلبلا رہا تھا۔ اس کیڑے اور شہد کی مکھیوں نے ہمیں جگہ جگہ سے کاٹ لیا تھا۔ ہم تینوں فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ شہد کی مکھیوں سے زیادہ خاص قسم کا کیڑا بے دردی سے ہمیں کاٹ رہا تھا۔ اگر ایک کیڑے کو ہم جسم سے اتارنے کی کوشش کر رہے تھے تو دس کیڑے ہمیں اپنے بے رحم جبڑوں سے کاٹ رہے تھے۔ یہ ظالم کیڑا جہاں

گوشت میں ایک دفعہ دانت گاڑتا تھا۔مرنے کے بعد بھی نہ چھوڑتا تھا۔اوپر سے شہد کی مکھیوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہمارے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا کہ جہاں سے خون نہ رس رہا ہو۔کیڑوں اور مکھیوں کو اپنے جسم سے علیحدہ کرنے کی کوشش میں ہم بے حال ہو رہے تھے۔طافو کے ساتھ خرم کی چیخیں بھی شامل ہو چکی تھیں۔ وہ دونوں بھی اپنے لہو میں لت پت نظر آتے تھے ایک میں تھی جو بے پناہ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے منہ کو سختی سے بند کیے ہوئے تھی مگر کب تک؟ آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور پھر اس سے پہلے کہ میری قوت برداشت مکمل طور پر جواب دے جاتی۔ خدا کو مجھ پر ترس آگیا اور میں اپنے ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر لڑھک گئی۔آخری احساس جو مجھے ہوا کہ شاید ہمارا آخری وقت قریب تھا اور زندگی کی تمام منزلیں ختم ہو چکی تھیں۔ میری زبان پر کلمہ طیبہ کا ذکر جاری تھا۔

☆☆☆☆☆☆

اس کے کتنی دیر یا کتنے دنوں کے بعد مجھے ایک وارڈ نما کمرے میں ہوش آیا۔ایک ڈاکٹر کسی نرس سے بات کر رہا تھا۔

”اسے جونہی ہوش آئے۔ اسے لیکوڈ غذا دینی شروع کر دو یہ بہت ضروری ہے۔“

ایک چیز جو مجھے سب سے پہلے محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ میری آنکھوں کے آگے مکمل اندھیرا تھا اور مجھے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا دوسرا احساس یہ تھا کہ میرا سارا جسم پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ مجھے فوری طور پر وہ واقعات یاد آئے جن کے تحت میں بے ہوش ہوگئی تھی۔جانے مجھے وہاں سے کون لایا تھا؟ خرم اور طافو بھی میرے ساتھ تھے۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہوں گے۔لگتا تھا کہ میرا سارا جسم پھولا ہوا تھا اور سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں تو سوجن کی وجہ سے مکمل طور پر بند تھیں۔یہی وجہ تھی کہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔نرس نے میرے بازو میں انجکشن لگایا تو میں ذرا کسمسائی۔

”کیا آپ کو ہوش آگیا ہے میڈم؟“ انجکشن لگانے کے بعد نرس نے پوچھا۔

”ہاں مجھے ہوش آگیا ہے سسٹر! میرے ساتھ طافو اور خرم بھی تھے وہ کہاں ہیں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”خرم تو یہیں دوسرے وارڈ میں موجود ہے مگر...... طافو بے چارہ رات چل بسا۔ کتنے ظالم لوگ ہیں یہ انسانیت نام کی کوئی شے نہیں ہے ان میں۔اس کی لاش بھی کاٹ کے ٹکڑے کر کے گٹر میں بہا دی ظالموں نے۔“

”آپ رو رہی ہیں سسٹر! آپ کا کیا تعلق تھا طافو سے؟“ نرس شاید رو رہی تھی میں نے اس سے پوچھا

”وہ بھی میری طرح مظلوم تھا بے چارہ۔ پچھلے چھ ماہ سے میں بھی یہاں قیدی ہوں اور اس کے تمام حالات سے واقف ہوں اکثر بیمار رہتا تھا اور دوائی کے بہانے یہاں آتا رہتا تھا۔انسیت کا ایک رشتہ سا بن گیا تھا اس سے۔اپنے بچوں کو یاد کر کے اکثر روتا رہتا تھا اور میں بھی اپنے بچوں سے بچھڑی ہوئی تھی۔ہم دونوں اکثر ایک دوسرے سے اپنے بچوں کے بارے میں ذکر کرتے رہتے تھے۔ بلکہ ہمارے درمیان بات کرنے کا موضوع ہی یہی ہوتا تھا۔“

یہ ایک نئی کہانی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ لوگ جنہیں اغوا کر کے لاتے تھے۔انہیں واپس بھیجتے ہی نہیں تھے یا وہ انہیں مار دیتے تھے یا پھر غلام بنا لیتے تھے۔قید کرنے کا ان کا انوکھا انداز تھا۔ بھاگنے والے خود ہی تھک ہار کر مایوس ہو جاتے تھے اور یا تو ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے یا پھر مارے جاتے تھے۔

اور مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ مغویوں کے وارثوں سے رقم بھی بٹور لیتے تھے۔

یہاں دو قسم کے لوگ تھے ایک تو وہ لوگ تھے جو کہ اغوا ہو کر یہاں آئے تھے اور ان لوگوں کی غلامی پر مجبور تھے۔دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جو کہ تمام مراعات سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور بھاری تنخواہیں وصول کر رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ مجھے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے غلامی پہ مجبور طبقے سے کام لینا تھا مگر کیسے؟ یہ مجھے سوچنا تھا۔

میں ابھی اسپتال میں ہی تھی اور میری صحت انتہائی تیزی سے بہتری کی طرف آرہی تھی۔خرم میرے ساتھ والے کمرے کے بیڈ پر تھا اور وہ بھی تیزی سے صحت مند ہو رہا تھا۔ایک رات جب نرس بھی ہمیں دوائیاں وغیرہ دے کر سو رہی تھی۔اچانک خرم میرے کمرے میں چلا آیا اس وقت میں بھی سو چکی تھی۔خرم نے مجھے سوتے سے اٹھایا اور مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔وہ ایک پیڈ اور پین ساتھ لے کر آیا تھا۔اس نے پیڈ پر پہلے ہی سے کچھ لکھا ہوا تھا۔وہ اس نے میرے حوالے کیا۔پین میرے سرہانے رکھا اور مجھے پڑھنے کا اشارہ کر کے چلا گیا۔

میں اس کی اس حرکت سے پریشان تھی کہ اگر اسے کوئی بات کرنا تھی تو اس نے خود کیوں نہیں کی مگر اس کی تحریر پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ایسا کرنا واقعی اس کی مجبوری تھی اس نے لکھا تھا۔

”باجی ذکیہ! اس تہہ خانے اور اوپر بنی حویلی میں صرف ایک سیکورٹی کیمرہ ہے اس کے علاوہ کہیں بھی کوئی کیمرہ نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کا سارا نظام غیر ملکی گوروں کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو کچھ یہاں کرتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ وہ کسی کیمرے میں ریکارڈ ہو جائے اور وہ کسی طریقے سے باہر میڈیا کی دنیا میں پہنچ جائے اور ان کے لیے مسئلہ بنے۔حویلی کے مین گیٹ پر جو کیمرہ لگا ہوا ہے وہ انہوں نے پتہ نہیں کس مقصد سے لگایا ہوا ہے۔ گورے اوپر جاتے بھی نہیں ہیں۔

”یہ واقعی خفیہ حکومتی سائنسی ریسرچ سنٹر ہے۔جو کہ ہمارے نااہل حکمرانوں نے اپنی جیبیں بھرنے کے لیے گوروں کو دے رکھا ہے۔ایک بات اور جو اس رات چوبارے پر میں نے آپ کو اس وجہ سے نہیں بتائی تھی کہ ایک طاقتور ٹرانسمیٹر میری قمیص کے بٹن کی صورت میں میرے ساتھ تھا۔جس کی وجہ سے ہماری گفتگو کہیں سنی جا رہی تھی اور اس سارے ڈرامے پر مجھے مجبور کیا گیا تھا تاکہ میں آپ کی ہمدردیاں سمیٹ کر آپ کے اصل خیالات سے ان لوگوں کو ٹرانسمیٹر کے ذریعے آگاہ کر سکوں۔وہ کہانی سنا کر میں آپ کی ہمدردیاں حاصل کر چکا تھا۔آپ مجھے باہر نکالنے کے لیے ساتھ لے جانے پر تیار ہو چکی تھیں۔ یہی ان لوگوں کا مقصد تھا۔تاکہ وہ تمہارے بھاگنے سے لمحہ بہ لمحہ باخبر رہ سکیں اور ایک آپ ہی کیا وہ پچھلے پانچ سالوں سے ہر آنے والے کے ساتھ مجھ سے ایسا کروا رہے ہیں۔اس میں کئی لوگ مارے بھی گئے۔مگر اس وجہ سے کوئی بھی تہہ خانے سے باہر نہیں نکل سکا۔ کیونکہ لوگ میری بھولی صورت سے دھوکا کھا جاتے تھے اور کچھ میرا رونا اتنا اوریجنل ہوتا ہے کہ لوگوں کو مجھ پر شک ہی نہیں ہوتا۔رہی یہ بات کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں تو میری جان سے بھی پیاری بہنا! یہ سب کچھ کرنے پر مجھے مجبور کر دیا گیا ہے اور میرا تعلق کراچی سے نہیں بلکہ وڈیرہ رب نواز کے گوٹھ سے ہے۔میں بچپن سے ہی انتہائی شرارتی اور ذہین تھا۔ میرے والدین وڈیرے رب نواز کے ہاری تھے۔ مجھے پڑھائی کا جنون کی حد تک شوق تھا۔میرے

والدین نے میرے اس شوق کو دیکھتے ہوئے مجھے حیدرآباد میری خالہ کے گھر بھیج دیا۔ کیونکہ ہمارے گوٹھ میں تو سرے سے اسکول ہی موجود نہ تھا۔ پانچویں کلاس میں اول آنے کے بعد میرے والد آئے اور وہ مجھے گھر لے گئے۔ کیونکہ وڈیرہ رب نواز کو کسی نے بتایا تھا کہ میرے والد خیر محمد نے اپنا بیٹا شہر میں پڑھنے کے لیے بھیجا ہوا ہے۔ وڈیرا رب نواز نہیں چاہتا تھا کہ ان کے ہاری کا بیٹا پڑھ لکھ کے ان کی غلامی سے آزاد ہو سکے۔

''میرے گوٹھ میں آنے کے دوسرے دن مجھے اپنے والدین اور چھوٹی بہن نگو کے ساتھ وڈیرے کے پاس جانا پڑا۔ کیونکہ انہوں نے بلایا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو وڈیرے کے بندوں نے ہمیں جیپ پر بٹھایا اور انڈیا کے بارڈر کے ساتھ والی زمینوں پر بنی ایک حویلی میں لے گئے۔ حویلی کے تہہ خانے میں لے جا کر بند کر دیا۔ میری چھوٹی بہن نگو کی عمر اس وقت پانچ سال تھی۔ اس کے سامنے مجھ پر اور میرے والدین پر بے انتہا تشدد کیا گیا۔ میرے والد خیر محمد نے ان کی کافی منت سماجت کی کہ وہ کم از کم مجھے نہ ماریں مگر ترس یا رحم نام کی کوئی شئے ان میں سرے سے موجود ہی نہ تھی اور میری والدہ تو میرا حال دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روتی تھیں اور انہیں واسطے دیتی تھیں۔ مگر وہ لوگ مجھے اس وقت تک مارتے رہے۔ جب تک میں بے ہوش نہیں ہوا۔ میری چھوٹی بہن نگو کی تو حالت ہی بیان سے باہر تھی۔ بہرحال جب مجھے ہوش آیا تو ہم سب کو وڈیرے رب نواز کے سامنے پیش کیا گیا۔

''ہم سب وڈیرے رب نواز کے سامنے مجرم بنے کھڑے تھے اور ہمیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ہمارا قصور کیا تھا اور ہم میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ ہم ان سے پوچھ سکتے کہ ہمیں کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔ مبادا یہ کہ وہ لوگ دوبارہ ہم پر تشدد شروع کر دیتے پھر بھی میری والدہ سے رہا نہ گیا اس نے پوچھ ہی لیا۔''

''سائیں! ہم نے ساری زندگی آپ کا نمک کھایا ہے اور کبھی کوئی غلطی نہیں کی۔ مگر ہمارے خاندان کو کس بات کی سزا دی گئی ہے؟''

''خاموش ایک تو تم ہیرا پھیری کرتے ہو اور زمینوں پر محنت سے کام بھی نہیں کرتے۔ پچھلے پانچ سالوں سے تمہاری زمینوں سے ہمیں کوئی بچت ہی نہیں ہو رہی اور اوپر سے تم ہم سے سوال بھی کرتے ہو۔''

''یہ سن کر میرے والدین رونے گڑگڑانے لگے اور اپنی صفائیاں پیش کرنے لگے۔ مگر ان کی کسی نے نہ سنی۔ اس کے بعد وڈیرے نے اپنے بندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے میرے والدین اور چھوٹی بہن نگو کو پکڑ لیا اور کہیں لے کر جانے لگے۔ وڈیرے رب نواز نے کہا۔

''خیر محمد! تمہارا یہ بیٹا ہمارے پاس رہے گا تا کہ تمہارا دماغ درست رہے۔''

''قصہ مختصر یہ کہ مجھے میرے والدین اور چھوٹی بہن نگو سے علیحدہ کر لیا گیا ہم سبھی روتے کرلاتے رہے۔ مگر ظالموں کو ہم پر ذرا ترس نہ آیا۔ اس کے بعد وڈیرہ رب نواز مجھے یہاں لے آیا اور موجودہ باس کے حوالے کیا اور کہا کہ اگر میں نے باس کی بات نہ مانی۔ تو وہ میرے پورے خاندان کو قتل کر دے گا اور اس دن سے لے کر آج تک میں باس کی ہر بات ماننے پر مجبور ہوں۔ ان پانچ سالوں میں کئی مغوی میری وجہ سے مارے گئے یا پکڑے گئے۔ سوائے باس کے یہاں پر رہنے والے کسی بندے کو معلوم نہیں کہ میرا کام کیا ہے۔ کیونکہ ڈرامے کے طور پر کئی دفعہ مجھے بھی بھاگنا پڑا ہے اور سبھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں بھاگنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ جو بھی نیا بندہ آتا ہے میں اس کے ساتھ مل کے بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں، ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ باس کی اس چال کو سمجھ چکے ہوں مگر وہ ایک دوسرے سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔

''ان پانچ سالوں کے دوران میں ان کا سارا سسٹم تو نہیں مگر ان کے سسٹم کے بارے میں کافی کچھ جان چکا ہوں۔ طافو کو یقیناً ان لوگوں نے قتل کیا ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ کیڑوں اور مکھیوں کے کاٹنے سے بندہ نہیں مرتا۔ اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ میں اس سے پہلے بھی تین بار کیڑوں، مکھیوں اور سانپوں کے ڈرامے سے گزر چکا ہوں۔ مگر مجھے تو آج تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ بات الگ ہے کہ مجھے اس وارڈ میں ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزارنا پڑتا ہے اور یہ سارا ڈرامہ لوگوں کو ڈرانے کے لیے کیا جاتا ہے اگر ان لوگوں نے بندے کو مارنا ہی ہو تو وہ تو ان کے لیے اس سے کہیں آسان ہوتا ہے اور یہ سب ڈرامہ کرنا میری مجبوری ہے۔ کیونکہ مجھے وڈیرے کی دھمکی یاد ہے۔ مگر میں یہ سب کرتے کرتے تھک چکا ہوں اور آپ سے ملنے اور آپ کا پیار دیکھ کر مجھے اپنی بہن نگو بہت یاد آتی ہے۔ جانے وہ کس حال میں ہو گی میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں سے نکلیں اور کسی طریقے سے وڈیرے رب نواز کی حویلی کے تہہ خانے سے میری فیملی کو نکال کر لاہور لے جائیں۔ کیونکہ میں نے چھپ کر وڈیرے رب نواز اور باس کی باتیں سن لی تھیں اور اس سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ وڈیرا رب نواز کی کزن ہیں اور لاہور میں رہتی ہیں۔ ادھر ہمارے گوٹھ میں آپ کی زمینیں بھی ہیں۔ یہ کام آپ اگر چاہیں تو آسانی سے کر سکتی ہیں۔

''جہاں تک یہاں سے نکلنے کا تعلق ہے۔ تو واقعی یہ ناممکن ہے۔ مگر میں آپ کو کچھ ایسے راز بتا سکتا ہوں کہ جس سے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری پیاری بہن مجھے اس جھوٹ پر معاف کر دے گی۔ جو میں نے مجبوری کی وجہ سے بولا اور آپ اب مجھ سے جو بات کرنا وہ یہ سوچ کر کرنا کہ وہ لوگ یہ باتیں سن رہے ہیں۔ فی الحال راز کی تمام باتیں ہم لکھ کر کریں گے میں چاہتا تو یہ بٹن اتار کر آپ کے پاس آ کر تمام باتیں کر سکتا تھا مگر میں زیادہ دیر آپ کے پاس رک کر کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا کیونکہ یہ گفتگو ذرا طویل تھی۔''

☆☆☆☆☆☆

اگلے دو دنوں میں سارا پلان تیار ہو چکا تھا اس پلان کے مطابق نہ صرف خرم ہمارے ساتھ جا رہا تھا بلکہ کچھ اور لوگ بھی اس میں شامل تھے اس میں وہ نرس بھی شامل ہو چکی تھی اور دو بندے ہمیں اور شامل کرنا پڑے جو کہ خرم کے مطابق گوروں کے قیدی تھے اور یہ سب معلومات مجھے خرم نے لکھ کر بتائی تھیں، ہم جو کچھ بھی لکھتے تھے وہ پڑھ کر جلا دیتے تھے اور اس کی راکھ بھی فلیش میں بہا دیتے تھے اس دوران وڈیرہ رب نواز سندھ جا چکا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

آج رات ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ رات بارہ بجے کی چائے میں بے ہوشی کا سفوف ملایا جا چکا تھا اور یہ چائے رات کی ڈیوٹی پر موجود تمام گارڈز پیتے تھے اور آج کی چائے انہیں بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔ اس کے بعد ہمارے پلان کا دوسرا حصہ شروع ہونے والا تھا۔ یہ سفوف نرس مدیحہ نے باورچی کو اپنے جلووں میں الجھا کر چائے میں ملایا تھا۔ اس کا انتظام بھی اسی نے کیا تھا۔ باورچی جانے کب کا عورت کے وجود کو ترسا ہوا تھا اور مدیحہ کو اپنے روبرو دیکھ کر ویسے ہی عقل و خرد سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے ایک سیکورٹی گارڈ آتا تھا اور چائے سے بھرا ہوا بڑا تھرماس لے کر

چلا جاتا تھا آج جب مدیحہ کچن میں آئی تو باورچی اس وقت چائے بنا رہا تھا۔ مدیحہ نے اسے باتوں میں لگایا اور بے ہوشی کا سفوف چائے کے دیگچے میں خالی کر دیا۔ تھرماس میں چائے ڈالنے کے بعد بھی کچھ چائے بچی ہوئی تھی۔ جو اس نے باورچی کو پلانا تھی اور یہاں سے نکل آنا تھا۔

سیکورٹی گارڈ چائے کا تھرماس لے کر چلا گیا۔ مدیحہ نے بڑے پیار سے باورچی کو خود اپنے ہاتھوں سے چائے پیش کی، باورچی کی حالت یہ تھی کہ مدیحہ اسے زہر بھی پلاتی تو وہ پی لیتا۔ چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد وہ وہیں لڑھک گیا۔

مدیحہ نے کچن کا دروازہ باہر سے بند کیا۔ وہاں سے نکل آئی اس نے آتے ہی کہا۔

"میڈم مبارک ہو۔ پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہوگیا ہے۔"

"اوہ خدا کا شکر ہے سسٹر، اس کام سے ہم پچاس فیصد کامیابی کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ آج خرم نے اپنی قمیص سے اس بٹن کو علیحدہ کر دیا تھا جو تمام فساد کی جڑ تھا اور ہمارے دشمنوں کو لمحے لمحے کی خبر دے رہا تھا۔ ڈاکٹر آج کہیں چلا گیا تھا اس لیے اس کلینک میں ہمارے سوا کوئی بھی موجود نہ تھا۔ ہم نے مدیحہ کو وہیں ٹھہرنے کو کہا کیونکہ وہ بے چاری اتنی بھاگ دوڑ کی عادی نہ تھی۔

دوسرے مرحلے میں ہمیں تمام گارڈز کی لوکیشن کو چیک کرنا تھا اور یہ تسلی کرنا تھی کہ ان میں سے کوئی گارڈ چائے سے رہ تو نہیں گیا تھا اور اگر کوئی رہ گیا تو اس کا مناسب بندوبست کرنا تھا۔ خرم تمام گارڈز کی لوکیشن سے واقف تھا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ تہہ خانے کے اوپر خفیہ گارڈز کہاں ہیں۔ مگر اس سے پہلے بھی ہمیں ایک کام اور کرنا تھا۔ جو کہ انتہائی ضروری تھا۔ وہ تھا باس کو قابو میں کرنا۔ میرے خیال میں یہ مشکل تو ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ جس کلینک میں ہم موجود تھے۔ باس کا رہائشی پورشن اس کے قریب ہی موجود تھا۔ ہم کلینک سے باہر نکلے اور باہر کوریڈور میں پہنچے۔ اس تہہ خانے میں گولائی میں کئی پورشن بنے ہوئے تھے۔ ہر کام کے لیے الگ پورشن تھا۔ جس پورشن میں باس کی رہائش تھی وہ بالکل کونے میں تھا۔

اس پورشن کے صدر دروازے پر گارڈ موجود تھا۔ مگر وہ کرسی پر ہی سویا پڑا تھا۔ یہ یقیناً نشہ آور چائے کا کمال تھا۔ ہم نے فوری طور پر اس کے اسلحے پر قبضہ کیا جو کہ بے ہوشی والے پسٹل اور ایک کمانی دار چاقو پر مشتمل تھا۔ اسلحہ قبضہ میں کرنے کے بعد تھوڑی سی زور آزمائی کے بعد تالا کھل گیا۔ میں نے خرم سے کہا کہ وہ باہر رک کر پہرا دے میں اندر جاتی ہوں۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ یہ پورشن چار کمروں پر مشتمل تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے چاروں کمرے چیک کر لیے۔ مگر وہ کسی بھی کمرے میں موجود نہ تھا۔ خرم کے مطابق اسے یہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا۔ شاید واش روم میں ہو۔ مگر واش روم سے بھی کسی قسم کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا...... آخر وہ کہاں چلا گیا؟

اس سے پہلے کہ میں باہر نکل کے خرم کو صورت حال سے آگاہ کرتی۔ میں نے بالکل آخری کونے والے کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ دیوار میں ایک جگہ مجھے شک ہوا اور یہ شک بالکل درست تھا۔ ایک بڑی پینٹنگ کے پیچھے ایک الماری نما دروازہ موجود تھا۔ یہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس بند دروازے کا فی الحال میرے پاس کوئی حل نہ تھا۔

میں فوری طور پر باہر نکلی اور خرم کو صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ باس سے بعد میں دو دو ہاتھ کرتے ہیں۔ پہلے سیکورٹی کی صورت حال کا جائزہ لے لیں اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہوا۔ کیونکہ ہم جونہی مین گیٹ پر پہنچے وہاں کی صورت حال کافی گمبھیر تھی۔ وہاں ایک بندہ انٹر کام پر کسی سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب یہ کنفرم نہیں تھا کہ اس کا رابطہ ہو چکا تھا یا نہیں۔ اس کے باقی پانچ چھ ساتھی وہیں ادھر ادھر بے ہوش پڑے تھے۔ خرم کے پاس بے ہوش کرنے والا پستول موجود تھا۔ جبکہ میرے پاس کمانی دار چاقو اور لوہے کی موٹی سلاخ موجود تھی۔ انٹر کام سیٹ ایک کیبن میں پڑا تھا اور وہ گارڈ اس پر بار بار کوئی نمبر ڈائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور میرے خیال میں اس کا رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ اگر اس کا رابطہ ہو جاتا تو وہ لازمی بات کر رہا ہوتا اور ہم اس کے اتنے قریب تھے کہ اس کی آواز سن لیتے۔ گارڈ کی ہماری طرف پشت تھی۔ اس لیے وہ ہمیں دیکھ ہی نہیں پایا۔ اب سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ کیبن کا دروازہ بند نہیں تھا۔ خرم نے کمال ہمت سے کام لیا اور کیبن میں داخل ہوتے ہی اس پر بے ہوشی کی گولی فائر کر دی میں نے اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا۔ خرم نے گولی مارتے ہی اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام لیا تھا۔ اس پستول کی گولی سے نکل کر بندے کے اندر داخل ہونے والا مادہ اتنا سریع الاثر تھا کہ لمحوں میں بندے کو بے ہوش کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مذکورہ گارڈ اب خرم کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔ وہ بے چارہ ہم سے کوئی بات بھی نہیں کر پایا تھا۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا تو ٹوں ٹوں کی آواز آرہی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ مذکورہ گارڈ کی ابھی کسی سے بات نہیں ہوئی تھی اور یہ ہماری خوش بختی تھی مین گیٹ سے ہمیں کچھ بہتر اسلحہ مل گیا۔ گو کہ یہ بھی صرف بے ہوش ہی کرتا تھا مگر یہاں سے ہمیں ایک دور مار رائفل بھی ملی جس سے بے ہوشی کی گولی فائر ہوتی تھی۔ ہم نے جلدی سے تمام اسلحہ سمیٹا وہاں سے واپس چل دیئے اب ہمیں اس تہہ خانے میں ڈیوٹی دینے والے دوسرے گارڈز کو چیک کرنا تھا۔ میں نے خرم سے کہا کہ وہ جلدی سے تمام تہہ خانے میں موجود گارڈز کی لوکیشن چیک کر لے۔

صرف تین لوکیشنز پر گارڈ موجود تھے۔ جنہیں وہ پہلے ہی چیک کر چکا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ اور وہ اس نے اسی وقت کر لیا تھا جب میں باس والے پورشن کی تلاشی لے رہی تھی۔

اس کے بعد ہم گارڈز کے رہائشی پورشن میں پہنچے اور اسے باہر سے لوہے کی سلاخ لگا کر بند کر دیا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ابھی ہمیں بہت سے کام کرنا تھے اس کے بعد ہم نے تیزی سے تہہ خانے میں موجود تفتیشی سیل کا رخ کیا تفتیشی سیل کے دروازے پر بہت مضبوط تالا لگا ہوا تھا اور اس پر مجھے کافی محنت کرنا پڑی۔ آخر کار سات منٹ کی انتھک کوشش کے بعد تالا کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک عجیب سی بو نے ہمارا استقبال کیا۔ جانے کس چیز کی بو تھی یوں لگتا تھا کہ جیسے ہم کسی مذبح خانے میں داخل ہوگئے ہوں میں نے تمام لائٹس آن کر دیں۔ یہاں بھی گولائی میں چار کمرے بنے ہوئے تھے، تین کمرے بالکل خالی تھے۔ چوتھے کمرے میں کوئی تھا۔ مگر اسے باہر سے لاک لگا ہوا تھا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد یہ لاک بھی کھل گیا۔ میں خرم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ تو یہاں ایک عجیب و غریب منظر ہمارا منتظر تھا۔ پورے کمرے میں جا بجا انسانی خون کے چھینٹوں کے داغ نظر آرہے تھے۔

وہ جو عجیب سی بو جو یہاں داخل ہوتے ہی ہمیں محسوس ہوئی تھی۔ وہ یہی تھی۔ مگر اس کمرے میں یہ بو اتنی تیز تھی کہ لگتا تھا کہ دماغ پھٹ جائے گا۔ سب سے حیران کن، عجیب وغریب اور دل کو دہلا دینے والی چیز یہاں یہ تھی کہ تین چار قطاروں میں انسانی ڈھانچے الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ یہ ڈھانچے باریک جالی نما کپڑے کے کور میں تھے۔ اور زنجیروں سے ہک میں لٹکے ہوئے تقریباً پورے کمرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں چکرا کر یہیں گر جاؤں گی۔ بھلا کوئی اتنا ظالم اور بے رحم بھی ہو سکتا ہے۔ ساری دنیا میں تہذیب اور انسانی حقوق کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اندر سے اتنے غلیظ ہوں گے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

میں دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ کے وہیں بیٹھ گئی چند لمحوں کے لیے تو مجھے یہ خیال بھی نہ رہا کہ میں کس مقصد کے لیے یہاں آئی تھی۔ خرم جو میرے پیچھے ہی یہاں داخل ہوا تھا۔ وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ شاید میں بے ہوش ہونے کے قریب تھی کہ کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔

یاالٰہی یہ کیا چکر تھا! میں نے پورے کمرے میں نظریں دوڑائیں مگر مجھے کوئی بھی زندہ انسان نظر نہ آیا۔ یہ آواز شاید کسی ڈھانچے سے آئی تھی میں نے کسی سے سنا تھا کہ مرنے کے بعد کچھ بے قرار روحیں دنیا میں بھٹکتی رہتی ہیں اور ان کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ شاید یہ کوئی بے قرار روح تھی۔ جو مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی اور مجھے کچھ بتانا چاہتی تھی۔ عجیب خوفناک سا ماحول تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ آواز دوبارہ آئی۔ شاید کوئی آہستہ آہستہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ جیسے کوئی قرآن کی آیت پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایسے واقعات سے زندگی میں میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خوفزدہ ہو چکی تھی۔ میں ڈر کے مارے باہر نکلی اور خرم کو دیکھا تو وہ باہر دروازے کے ساتھ ہی بیٹھا گھٹنوں میں سر دیئے رو رہا تھا۔

اس سائنسی ریسرچ سینٹر میں یہ لوگ آخر کر کیا رہے تھے؟

میں نے زندگی میں کئی بار فلمیں دیکھی تھیں۔ مگر ایسا دل دہلا دینے والا منظر تو میں نے کبھی کسی فلم میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کہاں یہ کہ حقیقت میں اتنے انسانی ڈھانچے اور وہ بھی الٹے لٹکے ہوئے اور حد تو یہ تھی کہ ان میں سے کوئی ڈھانچہ بات بھی کر رہا تھا۔

"باجی! کیا کوئی انسان دوسرے انسان پر اتنا ظلم بھی کر سکتا ہے؟" میں نے خرم کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"خرم! حقیقت تمہارے سامنے ہے مگر شاید یہ لوگ ہماری سوچ سے بھی زیادہ ظالم ہیں۔"

اچانک پھر کمرے سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی جو کہ خرم نے بھی سنی اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ جیسے کوئی قریب المرگ ہو اور کلمہ طیبہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"خرم! میں پہلے بھی دو دفعہ یہ آواز سن چکی ہوں۔ یہ شاید کسی بے قرار روح کی آواز ہے۔" میں نے خرم سے کہا

"باجی ہو سکتا ہے کہ آپ درست کہہ رہی ہوں مگر وہ دو بندے انہوں نے کہاں کیے جو یہ لوگ پچھلے ہفتے پکڑ کر لائے تھے۔ باجی وہ دو لوگ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ وہ کہاں گئے آخر؟" خرم نے کہا

"آؤ ایک بار پھر انہیں تلاش کرتے ہیں۔"

ہم نے پہلے کمرے سے انہیں دوبارہ تلاش کرنا شروع کیا۔ مگر تینوں کمروں میں وہ موجود نہ تھے اور نہ ہی ان تینوں کمروں سے کوئی خفیہ دروازہ نکلتا دکھائی دیتا تھا حتی کہ ہم نے واش روم بھی اچھی طرح چیک کر لیے مگر وہ نہ ملے۔

"ایک دفعہ ڈھانچوں والا کمرہ پھر چیک کر لیتے ہیں۔ شاید یہاں سے کوئی اور دروازہ نکلتا ہو اور وہ لوگ اس میں موجود ہوں۔ میں نے خرم سے کہا۔

میں نے خرم کو دروازے پر کھڑا کیا اور ایک دفعہ ڈھانچوں والے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کمرے میں ڈھانچوں کی چار قطاریں تھیں اور ہر ڈھانچہ دوسرے ڈھانچے سے ملا ہوا تھا یوں کہ جیسے کوئی الماری میں کپڑے ٹانگتا ہے۔ کمرے میں انرجی سیور کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں اللہ کا نام لے کر آگے بڑھی اور ڈھانچوں کو ہٹاتے ہوئے سامنے والی دیوار تک گئی اور پوری دیوار کا غور سے جائزہ لیا مگر کہیں کوئی دروازہ نہ تھا۔ دوسری دیوار چیک کی مگر وہاں بھی کسی دروازے کے آثار نظر نہیں آئے۔

اب میں دروازے والی دیوار کے ساتھ مڑی تو مجھے ہلکی سی کراہ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی جونہی میری نظر دیوار کے ساتھ لگی لائن کے ڈھانچوں پر پڑی تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ پر قابو پایا۔

"خرم! ادھر آؤ خرم! دیکھو یہ کیا ہے۔"

خرم ڈھانچوں کو پرے ہٹاتا ہوا ادھر آیا تو وہ بھی یہ سب دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

خرم اور میں کھڑے یہ اعصاب شکن منظر دیکھ رہے تھے۔ ڈھانچوں کے درمیان دو تازہ لاشیں ٹنگی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر بھی وہی کپڑے کا باریک جالی نما کور چڑھا ہوا تھا۔

میرے حوصلے کا بند ٹوٹ چکا تھا اور میں سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ روتے ہوئے میں نے خرم سے کہا "خرم دیکھو یہ وہی لوگ تو نہیں جنہیں ہم تلاش کر رہے تھے۔"

"جی باجی! لگتے تو وہی ہیں۔"

میں نے ان لاشوں کی طرف غور سے دیکھا۔ ان کے پاؤں کے ناخن اکھڑے ہوئے تھے اور ان پر کھرنڈ آ چکا تھا۔ ان کی ٹانگیں مضبوط زنجیر سے باندھ کر چھت پر لگے ہک سے لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں سے خون ابھی تک رس رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ان کے ہاتھوں سے ناخن حال ہی میں اکھاڑے گئے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی خون جم چکا تھا اور خون ان کے ہاتھوں اور سر سے ہوتا ہوا نیچے بہتا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے زمین پر جمے ہوئے خون کے لوتھڑے نظر آ رہے تھے۔

مگر یہ کیا.....؟ ایک لاش کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ زندہ تھا اور کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جسے ہم روح کی آواز سمجھ رہے تھے وہ یہی شخص تھا۔ میں نے خرم سے کہا کہ وہ میرے کندھوں پر کھڑا ہو کر ان لوگوں کی ٹانگوں سے بندھے کنڈے ہک سے نکالے۔ خرم میرے کندھوں پر کھڑا ہوا تو میں نے اس شخص کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ جونہی خرم نے اس کی ٹانگوں والے کنڈے کو ہک سے علیحدہ کیا تو اس نے اپنے ایک ہاتھ کو خالی ہونے والی ہک میں پھنسا لیا اور دوسرے ہاتھ سے دوسری ہک میں پھنسی زنجیر کو تھام لیا اور مجھے آزاد کر دیا۔ میں نے اپنی باہوں میں پھنسے شخص کو آہستگی سے فرش پر لٹا دیا۔ میں نے ایک دفعہ پھر کھڑے ہو کر دوسرے بندے کو بھی اسی طرح نیچے اتار لیا اور پھر خرم بھی میرے کاندھوں کے ذریعے زمین پر آ گیا۔

اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم پہلے ہی کافی وقت ضائع کر چکے تھے۔ دونوں کافی ہلکے پھلکے تھے اور ان کی سانسیں ابھی چل رہی تھیں۔ میں نے خرم سے پوچھا کہ کیا وہ ان میں سے کسی کو کندھوں پر اٹھا کر کلینک تک لے جا سکتا ہے۔ اس نے کہا۔

"باجی میں کافی سخت جان ہوں' آپ فکر نہ کریں۔"

اس کے بعد ہم نے ایک ایک کر کے دونوں کو کندھوں پر لادا اور کلینک کی طرف دوڑ لگا دی۔ کلینک پہنچتے ہی میں نے نرس مدیحہ سے کہا کہ وہ فوری طور پر ان کی ٹریٹمنٹ کرے۔ ہم نے دونوں لوگوں کو بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ مدیحہ نے فوری طور پر دونوں بندوں کے سروں کی طرف سے بیڈ اونچا کر دیا۔ میں نے مدیحہ سے کہا۔ سسٹر وقت بہت کم ہے اور آپ کو بہت کم وقت میں ان دونوں کو ہوش میں لانا ہے تاکہ یہ ہمارے ساتھ چل نہ سکیں تو کم از کم ہمارے کندھوں پر خاموشی سے سفر کرنے کے قابل ہوں۔

اس کے بعد میں اور خرم وہاں سے نکلے اور سیدھے ٹیلیفون ایکسچینج کی طرف بڑھے۔ سیکورٹی گارڈ کا یہاں بھی وہی حال تھا۔ یعنی کہ اپنی کرسی پر گردن ڈھلکائے بے ہوش پڑا تھا۔ ہم نے اسے کرسی سمیت ایک ذرا کم روشنی والی جگہ پر دھکیل دیا۔ ایکسچینج کے دروازے کو ہضمی قفل لگا ہوا تھا جو کہ تھوڑی سی محنت کے بعد کھل گیا۔ ہم نے آپریٹر کو دیکھا تو وہ بھی آرام سے کرسی پر سو رہا تھا اور اس کی وجہ بھی جلد ہی نظر آ گئی۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے نیچے گر کے ٹوٹ چکا تھا۔ ایکسچینج کا ٹوٹل سسٹم کمپیوٹرائزڈ تھا۔ اس میں ایکسٹرنل اور انٹرنل دونوں قسم کی لائنیں موجود تھیں۔ جن میں سے دو لائنوں کے سوا میں نے سبھی بیکار کر دیں۔ انہیں فعال کرنے میں انہیں جتنا وقت درکار تھا اتنے وقت کے بعد شاید انہیں اس چیز کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اس کے بعد میں کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس میں بھی یہی مسئلہ تھا کہ یہ لوکل اور ایکسٹرنل دونوں سے جڑا ہوا تھا اور اب ان کی کم بختی آ چکی تھی۔ سر توڑ اور اعصاب شکن کوششوں کے بعد یہاں کا تمام سسٹم میرے تابع ہو چکا تھا اور وہ تمام پاس ورڈز جو کہ ان لوگوں نے لگائے تھے وہ تبدیل ہو کر میری مرضی کے مطابق محفوظ ہو چکے تھے اور یہ تمام پاس ورڈ میرے ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں گم ہو چکے تھے جو میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک سب سے اہم چیز بھی ملی تھی یعنی اس عمارت اور علاقے کا نقشہ اسے ایک نظر دیکھ کر میں سمجھ گئی تھی کہ میں کس علاقے میں ہوں اس ساری کارروائی پر دس منٹ صرف ہوئے تھے۔ مگر خدا کا شکر تھا کہ ناممکن، ممکن میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اب صرف دو کام رہ گئے تھے اسلحے کے ذخیرہ میں ٹائم بم فٹ کرنا تھے۔ اور باس سے ایک آخری ملاقات کرنا تھی جو کہ مجھ پر قرض تھی۔ اسلحے کے دروازے پر پاس ورڈ لگا ہوا تھا جو کہ میں نے کھول دیا اور ہم جلدی سے اس کی طرف بڑھے۔ مگر میں ابھی دروازے سے باہر نکلی ہی تھی کہ مدیحہ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں دوڑتی ہوئی وہاں پہنچی اس نے کہا۔

"میڈم! ایک مریض کی حالت انتہائی مخدوش ہے اسے فوری طور پر اسپتال لے جانا ضروری ہے اگر جلد ہی اسے ہسپتال نہ پہنچایا گیا تو وہ مر جائے گا میں نے اسے آکسیجن لگا دی ہے کافی دیر الٹا لٹکا رہنے کی وجہ سے اس کی حالت کافی خراب ہو رہی ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر اسے جلد......"

"گھبرایئے مت سسٹر! اللہ کرم کرے گا۔" میں نے خرم سے کہا۔ "خرم ایمبولینس تیار ہے۔"

"جی باجی! بالکل اے ون کنڈیشن میں۔"

"فوراً لے کر کلینک کے گیٹ پر پہنچو۔"

خرم ابھی لایا کہتا ہوا بھاگ گیا اور میں مدیحہ کے ساتھ بھاگتی ہوئی مریضوں تک پہنچی۔ ایک مریض کی حالت واقعی خراب تھی۔ اسے مدیحہ نے آکسیجن لگا رکھی تھی وقت پہلے ہی بہت کم تھا اور معاملات انتہائی نازک پوزیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے ایک نظر مریض کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے میں نے فیصلہ کیا۔ میں نے خرم کو بلایا اور پوچھا۔

"خرم پہلے بھی کبھی گاڑی لے کر آخری کمرے تک گئے ہو؟"

"جی باجی کئی دفعہ گیا ہوں' لیکن اس کے آگے مجھے کوئی علم نہیں کیونکہ مجھے وہیں سے واپس بلا لیا جاتا تھا۔"

"کوئی بات نہیں خرم! تم ذرا ادھر میرے ساتھ آؤ۔"

خرم شش و پنج میں مبتلا تھا۔ مگر وہ میرے ساتھ چلا آیا۔ بیڈ کے نیچے میرا بیگ پڑا ہوا تھا۔ میں نے خرم کو بیڈ پر بٹھایا اور اس کے حلیے میں تبدیلی کے لیے اس کے گال پر ایک مصنوعی مسہ بنایا۔ اس کی مونچھیں ہلکی ہلکی تھیں۔ میں نے قینچی لے کر اس کے سر سے کہیں کہیں سے تھوڑے تھوڑے بال کاٹے اور خاص گم اسٹک سے اس کی مونچھوں پر چپکا دیئے۔ یہ خاص گم اسٹک میرے بیگ میں موجود تھی۔ اب اس کا حلیہ کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ اس سارے کام کے دوران میں اسے سمجھاتی رہی۔

"خرم وقت بہت کم ہے۔ تمہیں انتہائی اعتماد سے کام لینا ہوگا۔ تمہیں ایمبولینس میں مریضوں اور مدیحہ کے ساتھ یہاں سے نکلنا ہے۔ لوکیشن ون والے کمرے کی طرف سے تمہیں نکلنا ہے۔ جب تم کمرے سے نکلو گے تو ایک کوٹھی نما مکان میں پہنچو گے وہاں اس وقت کتنے بندے سیکورٹی پر مامور ہوں گے اور وہ تم سے کیا پوچھیں گے اس کا مجھے کوئی علم نہیں مگر یہ سب کچھ تمہیں حاضر دماغی سے نپٹانا ہوگا۔ وہ تم سے مین گیٹ کی کلیرنس کے کاغذات مانگیں گے۔ تم ان سے یہی کہنا کہ یہ ایمرجنسی معاملہ ہے اور یہ کہ تمہیں باس نے بھیجا ہے۔ اگر انہیں کوئی مسئلہ ہے تو وہ انٹرکام پر باس سے بات کر لیں اور انٹرکام پر باس والی لائن پر میں موجود ہوں گی اور میں کسی طریقے سے انہیں ہینڈل کر لوں گی۔ تمہیں جونہی وہاں سے جانے کی اجازت ملے۔ سیدھے روڈ پر نکلتے جانا۔ دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد تم مین روڈ پر پہنچو گے۔ مین روڈ پر پہنچتے ہی تم بائیں طرف مڑ جانا۔ اس کے بعد تقریباً پچاس پچپن کلومیٹر کی دوری پر سب سے پہلا شہر جہانگیر آباد آئے گا مگر تم یہاں رکنا مت۔ اس کے بعد پچیس کلومیٹر کی دوری پر ایک چھوٹا سا شہر نرمین نگر آئے گا۔ یہاں پہنچتے ہی تم کسی سے شاہین اسپتال کا پوچھ لینا۔ نرس اور مریضوں کو وہاں چھوڑتے ہی تم استقبالیہ پر پہنچو گے تو وہاں تمہیں ایک بندہ ہاتھ میں بریف کیس لیے کالی جیکٹ پہنے ملے گا۔ تمہیں دیکھتے ہی وہ تمہاری طرف بڑھے گا اور تم سے آہستگی سے کہے گا! آسمان نیلا ہونے ہی والا ہے اور تم اس سے کہو گے۔ مگر آج تو آسمان کالا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد وہ جو تم سے کہے مان لینا۔ انشاء اللہ سب درست ہو جائے گا۔"

"باجی' یہ ساری باتیں اور لوکیشنز اور یہ ساری معلومات چند لمحوں میں آپ نے کیسے جان لیں۔"

"انٹرنیٹ اور نقشہ سے اور اب مزید کوئی سوال مت کرنا۔ وقت پہلے ہی بہت کم ہے۔"

"مگر آپ بھی تو ہمارے ساتھ چلیں ناں' میں آپ کے بغیر یہاں سے نہیں نکلوں گا۔"

"خرم تمہیں میری قسم، اپنی نگو، بہن کی قسم! سوال نہ کرو اور ضد چھوڑ دو۔ پہلے پلان یہی تھا کہ ہم سب اکٹھے نکلیں گے مگر اب ان ایمرجنسی مریضوں کی وجہ سے یہ ناممکن ہے اور یہ مریض ہمارے ملک کا انمول سرمایہ ہیں۔ ہمیں انہیں ہر حال میں بچانا ہے اور میں جلد تم سے ملوں گی اور تمہارے تمام سوالوں کا جواب دوں گی۔"

خرم کی آنکھوں میں ان گنت سوال تھے، مگر وہ بھی شاید موقع کی نزاکت کو سمجھ چکا تھا۔ ہم دونوں نے مریضوں کو ایمبولینس میں لٹا دیا اور ان کے چہروں کو گرم کمبل کی اوٹ میں کر دیا تاکہ کوئی انہیں دیکھ کر پہچان نہ لے۔ نرس مدیحہ کو بھی جب معلوم ہوا کہ میں ان کے ساتھ نہیں جا رہی تو وہ بھی کافی پریشان ہوئی۔ مگر میں نے اسے بھی تسلی تشفی دی اور ایمبولینس کو روانہ کر دیا۔

میں تیزی سے ٹیلی فون ایکسچینج کی طرف بھاگی۔ میں آپ کو بتاتی چلوں کہ خدا نے مجھے کئی خصوصیات سے نوازا تھا۔ ان میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ میں ہر قسم کی آواز کی ہو بہو نقل کرنے میں ماہر تھی ایکسچینج میں دو ہی قسم کی لائنیں کام کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک انٹرنل اور ایک ایکسٹرنل تھی۔ انٹرنل باس سے منسلک تھی۔ باس تک جانے والی تار تو میں کاٹ چکی تھی اور باس تک پہنچنے والا فون اب میرے پاس ہی پہنچنا تھا۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ اٹھایا اور کمپیوٹر کے قریب ہی رکھ لیا۔

کمپیوٹر ابھی آن ہی تھا میں شارٹ کیز کا استعمال کرتے ہوئے روم اوپن کے پاس ورڈ پر پہنچی۔ میں نے لوکیشن نمبروں پر ٹک کیا اور گیٹ ون اوپن کا پاس ورڈ لگایا اور انٹر کر دیا۔ یہاں خفیہ کیمروں سے دونوں طرف کی گیٹ کی لوکیشن واضح ہو رہی تھی اور یہ سب مجھے انٹرنیٹ سے ہی پتہ چلا تھا۔ کیونکہ یہ ایک مکمل سوفٹ ویئر سسٹم تھا جو کہ باقی سسٹم کے ساتھ ہی اس منظر کو بھی واضح کر رہا تھا۔ گیٹ ون کی اسٹیل کی شیٹ نیچے آ چکی تھی اور اتنی دیر میں ایمبولینس بھی آ چکی تھی اور وہ سیدھی آگے بڑھی اور کمرے کے اندر آ کر رک گئی۔ اتنی دیر میں میں نے دوسرے گیٹ کا دروازہ اوپن کرنے کا پاس ورڈ لگا دیا تھا اور اسٹیل کی شیٹ آہستہ آہستہ نیچے آ رہی تھی۔ جونہی شیٹ نیچے آئی خرم نے تیزی سے ایمبولینس آگے بڑھائی اور گیراج میں لے جا کر بریک لگا دی۔ کیمرہ ہر چیز کی وضاحت کر رہا تھا، یہاں دو سیکورٹی گارڈ الرٹ کھڑے نظر آ رہے تھے اور انہوں نے اپنی رائفلیں ایمبولینس کی طرف سیدھی کر رکھی تھیں۔

یہ شاید سب کچھ اس لیے تھا۔ کہ یہ سب روٹین سے ہٹ کر تھا۔ ابھی مزید مسئلہ یہ بھی بنتا تھا کہ خرم کے پاس مین گیٹ سے کلیرنس کا کوئی کاغذ بھی نہیں تھا۔ ان میں سے ایک سیکورٹی گارڈ خرم سے بات کر رہا تھا۔ آخر کار خرم اسے اپنی بات سمجھانے میں کامیاب رہا اور سیکورٹی گارڈ نے پاس پڑے ٹیلی فون کی طرف قدم بڑھائے اور اس نے باس کے نمبر پر فون کیا جو کہ لازمی بات ہے مجھے ہی اٹینڈ کرنا تھا۔ جونہی ٹیلی فون کی بیل بجی میں نے ریسیور اٹھا لیا اور باس کی آواز کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"اب کیا بات ہے الو کے پٹھے! ابھی تک تم نے مین گیٹ سے ایمبولینس نہیں جانے دی۔ میں نے کہا بھی تھا کہ یہ ایمرجنسی ہے۔"

"سر! میں مختار بول رہا ہوں فائنل گیٹ سے۔ مین گیٹ سے یہ لوگ گزر آئے ہیں مگر ان کے پاس کلیرنس کے کاغذات نہیں ہیں۔"

"یہ ایمرجنسی معاملہ ہے مختار اور یہ کوئی نیا مسئلہ

نہیں ہے۔ وی آئی پیز کے لیے تو روز ہی ایسا ہوتا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے مگر......"

"اگر مگر کا وقت نہیں ہے، انہیں جانے دو۔ دس از مائی آرڈر۔"

"سوری سر آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر اس بارے میں کمانڈر جمال خان ہی کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں اور وہ اس وقت سو رہے ہیں۔"

"میں کب انہیں جگانے کی بات کر رہا ہوں انہیں سونے دو اور ایمبولینس کو جانے دو میں صبح خود ان سے بات کر لوں گا اگر ایمبولینس میں موجود لوگوں کو کچھ ہو گیا تو تم سبھی لوگ اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

"سر، میرا ساتھی انہیں بلانے جا رہا ہے وہ قریب ہی کمرے میں سو رہے ہیں ابھی ایک منٹ میں، میں آپ کی ان سے بات کرواتا ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے فون رکھ دیا۔

مجھے شروع ہی سے سیکورٹی گارڈ کے بات کرنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ باس کے ماتحت نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ باس کو کسی بھی معاملے میں نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال یہ ایک عجیب اور خطرناک صورت حال تھی اور میں ایمبولینس میں موجود ان دو انسانوں کو باہر نکالنے کے لیے ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ کمانڈر جمال خان نیند بھری آواز میں بولا۔

"سر آپ جو کہہ رہے ہیں وہ ناممکن ہے۔ کوئی مرے یا جیئے۔ مجھے اس سے غرض نہیں۔"

میں نے باس کی آواز کی بہترین نقل کرتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تمہارا نوکری سے جی بھر گیا ہے۔ جب میں تمہیں آرڈر دے رہا ہوں تو پھر تمہیں کیا مسئلہ ہے؟"

"سوری سر! ہم آپ کے عہدے کا احترام کرتے ہیں مگر ہم آپ کے انڈر میں نہیں ہیں۔ آپ کیوں بھول جاتے ہیں جبکہ اس بارے میں پہلے ہی سب کچھ طے ہو چکا ہے۔"

"کمانڈر صاحب، کیا طے ہو چکا ہے؟" میں نے انتہائی غصے سے کہا۔

"یہی کہ مین گیٹ سے کلیرنس لیے بغیر اگر آپ کچھ بندوں کو ایمرجنسی میں باہر بھیجنا چاہتے ہیں تو پھر آپ ہمارے باس سے فون پر بات کریں گے اگر وہ اجازت دیں تو پھر ہمارا باس ہمیں آرڈر دے گا۔ آپ ہمیں آرڈر نہیں دے سکتے۔ وی آئی پیز کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ کار ہے اور آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ ابھی کل ہی ہماری نئی باس لوسی نے یہاں کا چارج سنبھالا ہے۔ آپ ان سے بات کر لیں۔ اگر وہ فون پہ مجھے اجازت دے دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ورنہ انتہائی معذرت کے ساتھ سوری سر۔"

"کمانڈر صاحب، یہ انتہائی ایمرجنسی معاملہ ہے۔ اگر اوپر والوں نے کوئی بات کی تو میں آپ ہی کا نام لوں گا۔ آپ اس کے لیے تیار رہیں۔ آپ کو پتہ ہے میں کس کے انڈر کام کر رہا ہوں۔"

"جی سر! مجھے علم ہے کہ آپ ڈیوڈ صاحب کے ماتحت ہیں۔"

"تو محترم کمانڈر صاحب! آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ کمرے کے دروازے ڈیوڈ صاحب کے پاس ورڈ لگائے کے بغیر نہیں کھلتے اگر دروازے کھلے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے میں ابھی انہیں بتاتا ہوں کہ آپ مجھ سے تعاون نہیں کر رہے۔"

"سر ایک منٹ سر آپ کی بات درست ہے۔

آپ میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کریں۔ جس طرح آپ ڈیوڈ صاحب کو جواب دہ ہیں سر اسی طرح میں بھی میڈم لوسی کو جواب دہ ہوں۔ سر آپ میڈم لوسی سے بات کرلیں وہ آپ کو انکار تھوڑی کریں گی۔ بس آپ میری ان سے بات کروادیں۔ میں اس ایمبولینس کو اس کے بعد ایک سیکنڈ بھی نہیں روکوں گا' یا پھر میں خود ہی ان سے بات کرکے کنفرم کرلیتا ہوں۔"

"نہیں کمانڈر میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتا ہوں میں ابھی میڈم لوسی سے بات کرکے تمہاری بات کرواتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے فون کریڈل کردیا۔

اس ساری تگ ودو میں سوا ایک بج چکا تھا۔ میرا دو بجے یہاں سے نکلنے کا پروگرام تھا اور وقت بہت ہی کم تھا اور کام تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ عجیب شیطانی جال تھا جو کہ ان لوگوں نے بچھا رکھا تھا۔ اب میڈم لوسی اور ڈیوڈ نہ جانے کون تھے اور میں نے ان کی آواز بھی نہیں سنی تھی کہ میں ان کی آواز کی نقل کرتے ہوئے کمانڈر جمال خان کو رام کر لیتی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ واحد ایکسٹرنل کال لائن پر بیل بجنے لگی۔ یہ ایک نئی مصیبت تھی اور یہ جانے کون تھا جو باہر سے کال کررہا تھا اور جانے وہ کس سے بات کرنا چاہتا تھا اور میرا حال یہ تھا کہ میں نہ تو انکار کی پوزیشن میں تھی نہ اقرار کی۔ اب یہ ساری گیم ہی رسکی ہوتی جارہی تھی اور رسک لیے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

"ہیلو! کون؟" میں نے اللہ کا نام لے کر ریسیور اٹھایا اور باس کی آواز کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم لوسی! پلیز کال ٹرانسفر ٹو یور باس۔" کسی نے امریکی لہجے میں کہا۔

"شاید نہیں یقیناً یہ میرے اللہ کا کرم تھا اور یہ میرے لیے امداد غیبی تھی۔ لوسی مجھے آپریٹر سمجھ رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ یہ اس کی اور باس کی پہلی ٹیلی فونک بات چیت تھی۔

"آئی ایم لسننگ میڈم۔ وٹ یو وانٹ ٹو سے دس ٹائم۔" میں نے یہ سب لمحے کے بھی ہزارویں حصے میں سوچا اور کہا۔

"آئی ایم ود ڈیوڈ۔ اینڈ وئی ول بی دیئر ایٹ تھری پی ایم۔ پلیز کمپلیٹ یور سیٹ اپ بی فور آور ریچنگ۔"

"اوکے میڈم! مگر میرے اس بات کرنے سے پہلے ہی اس نے کال آف کردی۔"

میں نے کچھ بھی سوچنے سے پہلے فائنل گیٹ کے نمبر پر پہلے ایک لمبی بیپ دی تاکہ وہ یہی سمجھیں کہ باہر سے کال ہے۔ کیونکہ لوکل ایکسچینج کے نمبر پر اگر کوئی باہر سے کال آئے تو آپریٹر ایسے ہی کال ملا کر دیتا ہے۔ کمانڈر جمال خان نے فوری طور پر کال ریسیو کی۔

"مسٹر جمال خان! الاؤ ایمبولینس ٹوگو ودا پیشنٹس امی جیٹ لی۔"

"اوکے میڈم!"

"اوکے اینڈ آل۔" یہ کہتے ہی میں نے ریسیور رکھا اور میرے جسم میں طمانیت کی ایک طویل لہر دوڑ گئی۔

یہ بہت بڑی فتح تھی۔ میں نے کیمرے کی نظر سے دیکھا ایمبولینس اسٹارٹ ہوئی اور زن سے گیراج سے باہر نکلی اور اپنے سفر پہ روانہ ہوگئی۔ میرے جسم کا رواں رواں خدا کا شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے اپنے مقصد میں کامیاب کیا۔ وہ جو ناممکن تھا وہ ممکن ہو چکا تھا۔ دوسرا فون میں نے نرمین نگر میں موجود اپنے دوستوں کو کیا اور انہیں مناسب ہدایات دیں اور فون بند کردیا۔ اب میں نے وہ کام شروع کیا جو اس ایمرجنسی کی وجہ سے درمیان میں رہ گیا تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر کمپیوٹر پاس ورڈ کے ذریعے اسلحہ خانے کا دروازہ کھولا اور سات منٹ کا ٹائم لگا کر اس کی طرف بڑھی۔ اسلحہ خانے میں میری سوچ سے بھی زیادہ سامان تھا۔ جلد ہی مجھے اپنا مطلوبہ سامان مل گیا۔ میں نے چار طاقتور بم لگائے' تین بجے ڈیوڈ اور لوسی آرہے تھے اور یہ ان کا بہترین استقبال تھا۔ ڈیڑھ بج چکا تھا میں نے ٹائم ڈیوائس پر دو گھنٹے کا ٹائم سیٹ کردیا تھا۔ اس کے بعد میں فوری طور پر وہاں سے نکلی۔ ابھی ایک منٹ باقی تھا۔ میں باہر نکلی تو تھوڑی دیر بعد دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔

میں کوریڈور سے ایکسچینج کی طرف جارہی تھی کہ میں نے گارڈز والے پورشن سے کسی کے دروازہ پیٹنے کی آواز سنی۔ یہ بہت خطرناک صورت حال تھی ابھی مجھے کچھ اور کام نمٹانے تھے جو بے حد ضروری تھے۔ میں جلدی سے ایکسچینج کی طرف بڑھی اور ایک دفعہ پھر کمپیوٹر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کی اور اپنی تمام سیٹنگ اور پاس ورڈ تبدیل کرکے دوبارہ پہلے والی سیٹنگ کردی۔ یہ سب کچھ میں نے اس لیے کیا تھا کہ ڈیوڈ اور لوسی کسی شک کا شکار ہوئے بغیر اس جال میں پھنس سکیں اور جب وہ ایک دفعہ ان ہو جاتے تو مجھے امید تھی کہ وہ زندہ یہاں سے نکل نہ سکتے۔ پونے دو بج چکے تھے۔ گارڈز والے پورشن میں شور مچ چکا تھا۔ اب مجھے یہاں سے نکلنا تھا مگر مجھے باس سے ایک حساب کرنا تھا جو مجھ پر قرض تھا۔

میں باس والے پورشن کی طرف بڑھی۔ دروازہ ویسے ہی تھا جیسا کہ میں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس پورشن کی میں پہلے ہی تلاشی لے چکی تھی۔ ایک کمرے میں پینٹنگ کے پیچھے ایک چھوٹا سا الماری نما دروازہ موجود تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ دروازہ بھی شاید کسی کمپیوٹر پاس ورڈ سے کھلتا تھا مگر ایسا نہیں تھا کیونکہ کمپیوٹر سسٹم میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔ میں نے اس دروازے کو ہر زاویے سے چیک کیا۔ مگر اس کے پٹ بھی مخالف سائیڈ پر تھے اور اسے اس طرف سے کھولنا ناممکن تھا۔ کیونکہ یہ مخالف سائیڈ سے کنڈی یا تالا لگا کر بند کیا گیا تھا۔

گارڈ روم والے پورشن میں شور بڑھتا جارہا تھا۔ لوگوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ شاید اس بندے کو کوس رہے تھے۔ جو باہر سے کنڈی لگا گیا تھا۔ اب وہ لوگ زور زور سے کسی کو پکار رہے تھے۔ شکر ہے کہ یہاں کسی کو موبائل رکھنے کی اجازت نہ تھی ورنہ یہ لوگ کب کے باہر نکل چکے ہوتے۔

مگر شاید میری سوچ غلط تھی۔ کسی کو پتہ چل چکا تھا۔ کیونکہ کوریڈور میں کسی کے تیز دوڑنے کی آواز آرہی تھی اور اس نے گارڈز کو تسلی دی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی ہر طرف شور برپا ہوگیا۔ باہر جانے کیا ہو رہا تھا میں اس سے قطعی لاعلم تھی۔ میں اب کلینک میں بھی نہیں جاسکتی تھی۔ کیونکہ باہر کوریڈور میں لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اتنے میں اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جس چھوٹے الماری ٹائپ دروازے کو میں کھولنے کی کوشش کررہی تھی اس کے پیچھے کوئی کھٹ پٹ ہورہی تھی۔ میں نے جلدی سے پینٹنگ اس دروازے کے آگے لگائی اور دوسرے کمرے میں جاکر چھپ گئی۔

مجھے چھپے ہوئے ابھی ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ خفیہ دروازے والے کمرے سے کوئی نکلا اور باہر بھاگ گیا اور یہ یقیناً باس تھا۔ اب میرا یہاں سے فرار ناممکن ہوگیا تھا اور باس سے دو دو ہاتھ کرنے کا میرا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ ساتھ اب میری بھی موت یقینی تھی۔ پونے دو بج چکے تھے۔ اور بم بلاسٹ ہونے میں پونے دو گھنٹے باقی تھے۔ ڈیوڈ اور لوسی یہاں تین بجے پہنچتے اور ساڑھے تین پر بم

بلاسٹ ہوجاتے۔ یقیناً یہاں موجود ہر ذی روح فنا ہوجاتا اور اس میں ڈیوڈ اور لوسی بھی شامل ہوتے۔ جو کہ اس تمام فساد کے اہم ترین کردار تھے۔ یہ تمام خیالات میرے ذہن کی سکرین پر ایک لمحے سے بھی کم وقت میں گزر گئے۔

میں جس کمرے میں چھپی ہوئی تھی اس سے باہر نکلی اور خفیہ دروازے والے کمرے کی طرف بڑھی۔ باس جلدی میں یہ دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب یہاں سے فرار تو ناممکن ہے۔ مگر یہ جو تھوڑا سا وقت بچا ہے اس خفیہ دروازے کے پار ہی گزارتی ہوں۔ ہوسکتا ہے اللہ پاک اس دوران کوئی بہتر سبب ہی بنا دے اور یہاں سے نکلنے کا کوئی وسیلہ بن سکے۔ فی الحال تو اس جگہ سے نکلنے کا مطلب سوائے خودکشی کے اور کچھ نہ تھا۔ کیونکہ اوپر ہر طرف ہلچل مچی ہوئی تھی اور ان لوگوں کو آہستہ آہستہ تمام حالات کا پتہ چل رہا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں دروازے کے دوسری طرف جا پہنچی۔ دوسری طرف مکمل اندھیرا تھا۔ میں نے ٹراؤزر کی جیب سے پنسل ٹارچ نکالی جو کہ مجھے خرم نے کہیں سے لا کر دی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو اپنے آپ کو سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے پایا اور یہ سیڑھیاں نیچے کہیں جا رہی تھیں۔ میں نے کسی خیال کے تحت الماری نما دروازے کو کنڈی لگائی اور اس میں پہلے سے موجود چائنا کا تالا بھی لگا دیا۔ یقیناً اس تہہ خانے میں داخل ہونے کا کوئی اور بھی ذریعہ تھا۔ یا پھر اور بھی کوئی لاک سسٹم تھا جس سے یہ دروازہ کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ بہرحال میں نے اس پر دماغ کھپانے سے بہتر سمجھا کہ سیڑھیوں سے نیچے اتر کے دیکھا جائے کہ ادھر کیا ہے۔

سیڑھیاں نیچے ایک بڑے ہال نما کمرے پر ختم ہو رہی تھیں۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر ڈالی تو ایک دفعہ تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

یہ ایک خفیہ سائنسی ریسرچ سنٹر تھا۔ جس پر ہمارے حکمرانوں کی بے حسی کی وجہ سے کسی غیر ملکی ایجنسی نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مگر مجھے یہ امید قطعاً نہ تھی کہ یہاں اس خفیہ سائنسی ریسرچ سنٹر میں ہندوؤں کا مندر موجود ہوگا۔ یہاں نیچے تہہ خانے میں بھگوان کا بڑا سا مجسمہ موجود تھا۔ جو کہ پہلی نظر دیکھنے پر یوں ہی محسوس ہوتا تھا کہ جیسے سونے سے بنا ہوا ہو۔ اور یہ ہو بھی سکتا تھا کہ یہ واقعی سونے سے بنا ہوا ہو۔ کیونکہ ان لوگوں کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ مگر ایک بات جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے اور مجھے بے اختیار رونے پر مجبور کر دیا۔ وہ یہ تھی کہ اس بھگوان کے بڑے سے مجسمے کے قدموں میں ایک معصوم بچی کی سر کٹی لاش پڑی تھی۔ اور اس کا بہتا ہوا خون بھگوان کے مجسمے کے قدموں کو بھگو رہا تھا۔ میں نے بچی کی لاش کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو مجھے وہ گرم محسوس ہوئی۔ شاید یہ قتل باس نے ابھی ابھی کیا تھا۔

ایک دفعہ تو میرا دل چاہا کہ سبھی احتیاط بالائے طاق رکھوں اور اوپر جا کر اس باس نما بھیڑیے کے سینے میں خنجر کے اتنے وار کروں، اتنے وار کروں کہ اس کا سارے وجود کا ذرہ ذرہ الگ کر دوں۔ اور شاید میں بے اختیاری کی کیفیت میں باہر نکل بھی جاتی۔ مگر اسی وقت میرے ذہن میں میرے استاد (جن کا نام میں یہاں نہیں بتانا چاہتی) کے الفاظ گونجے۔

"جو چلا گیا اس کے بارے میں مت سوچو جو باقی ہے اسے بچانے کی کوشش کرو اور جوش میں اپنے ہوش مت کھوؤ۔"

بھگوان کا مجسمہ ایک چھوٹے سے چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔ میں بے اختیاری کی کیفیت میں چبوترے پر چڑھی اور مجسمے کے بازوؤں پر رکھا ہوا ایک جوگیا رنگ کا کپڑا اتارا اور اس معصوم بچی کی لاش کو اس سے ڈھک دیا۔ میرا جی نہیں کر رہا تھا کہ میں اس بچی کی سر بریدہ لاش کو دوبارہ دیکھوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ظلم ڈھانے والے لوگ پتھر دل ہوتے ہیں مگر آج اس تہہ خانے میں اس معصوم بچی کی لاش دیکھنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں کی یہ بات بھی غلط ہے۔ یہ لوگ پتھر دل نہیں اس سے بھی آگے کی کوئی چیز ہیں۔ جس کے لیے شاید کسی بھی زبان کی لغت میں کوئی الفاظ موجود نہیں اور یہ احساسات تو شاید وہ ماں ہی محسوس کر سکتی تھی جس کا لخت جگر اس ظالم نے اتنی بے دردی سے کاٹ کے پھینک دیا تھا۔ کافی دیر تک میں یونہی بیٹھی روتی رہی۔ جب میرا دل تھوڑا سا ہلکا ہوا تو میں نے مجسمے کی طرف دیکھا۔ یہ کافی بڑا مجسمہ تھا۔ اس کے دونوں سائیڈوں پر لوہے کا ایک ایک ترشول گڑا ہوا تھا۔ میں نے کسی مقصد کے تحت ایک ترشول کو اکھاڑنا چاہا۔ جب میں نے ترشول کو تھوڑا سا گھمایا تو مجھے اچانک ایک جھٹکا لگا اور میرے نیچے جو چبوترہ بنا ہوا تھا جانے کہاں نکل گیا اور میں انتہائی تیزی سے نیچے گری اور میرے ساتھ ہی سر بریدہ بچی کی لاش بھی تھی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میرا سر ریتلی زمین سے ٹکرایا اور میرے ساتھ ہی دھم کی آواز سے بچی کی لاش بھی میرے قریب ہی آ کے گری۔ میں نے اوپر دیکھا تو خلا بند ہو چکا تھا اور میں بچی کی لاش سمیت اندھے گڑھے میں پڑی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

خدا کا شکر ہے کہ میرے ہاتھ میں جو ٹارچ تھی وہ بھی میرے ساتھ ہی گڑھے میں آ گری تھی اور اس سے مناسب روشنی ہو رہی تھی۔ دوسری بات یہ کہ میں بھی صحیح سلامت تھی کیونکہ میں جہاں گری تھی وہاں زمین بھربھری اور ریتیلی تھی اس لیے مجھے کوئی چوٹ نہیں لگی۔ میں اٹھی اور ٹارچ کی روشنی میں یہاں کا جائزہ لیا۔ پہلی نظر میں تو مجھے یہی لگا تھا کہ میں ایک بار پھر کسی نادیدہ جال میں پھنس چکی تھی۔ مگر میں نے ٹارچ کی روشنی میں غور سے دیکھا تو مجھے کچی مٹی میں ایک غار سا بنا ہوا محسوس ہوا اور یہ اوپر کہیں جا رہا تھا۔ اس غار نما راستے پر کھڑے ہو کر تیزی سے چلنا ناممکن تھا۔ کیونکہ جگہ بہت کم تھی۔ لگتا تھا یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ میرے خیال میں یہ باس کا اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے بنایا ہوا راستہ تھا۔ جس سے اس کے بڑے بھی ناواقف تھے۔ اس نے یہ راستہ یقیناً کسی ہنگامی مقصد کے لیے بنا رکھا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اس غار نما راستے میں ٹھنڈی ہوا کا احساس ہوا۔

اس غار نما راستے کا خاتمہ درختوں کے ایک جھنڈ میں ہوا۔ میں نے ٹارچ بجھا دی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دور تک نظر دوڑائی۔ کالی رات کے گھپ اندھیرے میں مجھے اتنا معلوم ہو چکا تھا کہ میں حویلی اور تہہ خانے سے کافی دور پہنچ چکی تھی۔ میں اس ذات کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ میں اسی وقت خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی۔ جس کی کمال مہربانی سے میں اس جہنم سے نکل چکی تھی۔ مگر میں ایک دفعہ پھر واپس گڑھے تک گئی اور ایک خیال کے تحت ٹارچ کی روشنی میں میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور جلد ہی مجھے مطلوبہ شئے نظر آ گئی۔ یہ بائیں طرف دیوار کے گڑھے میں خلا کی موجودگی تھی۔ ایک جگہ ہلکا سا دھکا لگانے سے خلا کے اوپر موجود لوہے کی پلیٹ ایک

طرف ہو گئی اور خلا سے ایک رسے کا گچھا نیچے آگیا۔ میں نے اس رسے کو نیچے کھینچا تو اوپر مندر میں موجود مجسمے کے قدموں سے تھوڑا دور لگی سٹیل کی پلیٹیں حرکت میں آگئیں اور آہستہ آہستہ نیچے آنے لگیں۔

میں نے غور سے دیکھا تو ایک طرف کی پلیٹ میں ابھار سا تھا۔ میں نے اس ابھار کو ایک جگہ سے دبایا تو اس میں سے اسٹیل کی ایک ہلکی اور مضبوط قسم کی سیڑھی نکل آئی۔ میں نے ایک طرف ہو کر سیڑھی کو تھوڑا زور لگا کر کھینچا تو یہ سیڑھی اسٹیل کی شیٹ سے علیحدہ ہو گئی۔ میں نے یہ سیڑھی لگائی اور ایک دفعہ پھر اوپر بنے مندر میں پہنچ گئی۔ پہلے جب میں یہاں داخل ہوئی تھی تو اچانک بچی کی لاش دیکھ کر ادھر ادھر سے بے نیاز ہو گئی تھی اور ابھی میں کسی مقصد سے ترشول نکالنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک گڑھے میں جا گری تھی۔ اس وجہ سے میں اس جگہ کو تسلی سے دیکھ نہ سکی تھی۔

اب میں یہاں کی ہر چیز کی تلاشی لینا چاہتی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو مجھے مندر کی ایک طرف کی دیوار میں دروازہ نظر آیا۔ اسے باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے یہ دروازہ کھل گیا اور میں اندر داخل ہو گئی۔ میں نے اندر نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا کہ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ اور اس ہال کے اختتام والی دیوار میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اور ان سلاخوں کے پیچھے تین بڑے بڑے کمرے نظر آرہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں پنجاب کے کسی تھانے کی حوالات کا منظر دیکھ رہی ہوں۔ ایک جگہ سے سیڑھیاں اوپر جاتے ہوئے نظر آرہی تھیں۔ اور یہ یقیناً اوپر موجود کسی حصہ تک جاتی ہوں گی۔

عجیب بھول بھلیاں تھیں اور انوکھا حیرت کدہ تھا۔ پتہ نہیں یہاں کیا کیا چھپا ہوا تھا۔ اور میرے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا۔ کہ میں تمام چیزوں کا کھوج لگا سکتی۔ میں نے لوہے کی سلاخوں سے اندر نظر ڈالی تو میں نے کئی لوگوں کو وہاں لیٹے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے کچھ لوگ شاید رات کے اس پہر بھی جاگ رہے تھے۔ اور میری اس بے وقت آمد پر حیران نظر آرہے تھے۔ میں نے باہر لگے ہوئے پاور سوئچ سے لائٹس آن کر دیں۔ اندر اور باہر کا منظر واضح ہو چکا تھا۔

یہ تین بڑے بڑے کمرے تھے۔ جو کہ حوالات کی طرز پر بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں کافی لوگ موجود تھے۔ دوسرے کمرے میں کچھ بچے اور بچیاں سو رہی تھیں۔ جبکہ تیسرے کمرے کا ماحول انتہائی خوفناک تھا۔ اس میں جو لوگ موجود تھے۔ انتہائی بری حالت میں تھے۔ شاید حال ہی میں ان سے پوچھ گچھ ہوئی تھی اور ان پر تشدد کیا گیا تھا۔

ان دروازوں پر کافی مختلف قسم کے تالے لگے ہوئے تھے۔ مگر مجھے ان کو کھولنے میں بھی کچھ زیادہ وقت نہیں لگا۔ اندر موجود لوگ مجھے دیکھ کر کافی حیران تھے۔ اور شاید سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں کون تھی۔ اور رات کے اس وقت کیا کرنے آئی تھی۔ مگر میرا ہمدردانہ رویہ دیکھ کر کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے۔ میں نے سبھی لوگوں کو ہال میں جمع کیا۔ مگر ان لوگوں میں بچے شامل نہیں تھے۔ بچوں پر میں نے ایک جوان لڑکے کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ کہ وہ انہیں آہستگی سے جگائے اور انہیں پیار سے سمجھائے کہ انہیں یہاں سے اپنے گھروں میں اپنے ممی پاپا سے ملنے کے لیے نکلنا ہے۔ اس لیے وہ شور سے گریز کریں۔

بقیہ سبھی لوگ ہال میں جمع تھے۔ میں نے جلدی سے ان کی گنتی کی۔ یہ کوئی ایک سو تیس کے قریب لوگ

تھے میں نے ان سے کہا۔

آپ سب لوگ تیار ہو جائیں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ لہٰذا کوئی بھی مجھ سے کوئی سوال کر کے اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کرے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر اللہ پاک کے انتہائی فضل و کرم سے مجھے یہاں سے باہر نکلنے کا ایک خفیہ راستہ مل گیا ہے۔ آپ لوگ اگر مجھ سے تعاون کریں گے تو آپ ہی فائدے میں رہیں گے۔ دوسری صورت میں نقصان بھی آپ ہی کا ہو گا۔ اس لیے سبھی لوگ افراتفری سے گریز کریں۔ سب سے پہلے وہ لوگ ہاتھ کھڑے کریں جو چل پھر نہیں سکتے۔

سات افراد نے ہاتھ کھڑے کیے۔ میں نے ان کی حالت دیکھی تو واقعی ان کی حالت کافی خراب تھی۔ ان کے پاؤں سے ناخن نکلے ہوئے تھے اور وہ چہرے سے ہی کافی تکلیف میں نظر آتے تھے۔ پاؤں کے ناخنوں کے علاوہ بھی ان پر کافی تشدد کیا گیا تھا۔

اس کے بعد میں نے کچھ جوان اور صحت مند نظر آنے والے لوگوں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ان لوگوں کو ہر حال میں باہر لے کر جائیں چاہے اس کے لیے انہیں ان لوگوں کو کندھوں پر اٹھانا پڑے یا کوئی اور حل کرنا پڑے۔

ان لوگوں کے چہرے پر یہاں سے نکلنے کی جو خوشی تھی وہ دیدنی تھی اور اس خوشی نے ان لوگوں میں وہ جذبہ بھر دیا تھا۔ جو کسی اور حالات میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ان لوگوں کو یہی خوشی بہت تھی کہ وہ اس جہنم سے نکل رہے تھے۔ جس کی اب انہیں کوئی امید بھی نہ تھی۔ ان احساسات کی وضاحت شاید وہ انسان کر سکے جسے پھانسی دینے کے لیے پھانسی گھاٹ پر لے جایا جا چکا ہو اور اچانک اس سے کہا جائے کہ اس کی سزائے موت معاف کر دی گئی ہے۔

میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک لڑکے نے کہا۔

''میڈم! ساتھ والے حصہ میں کچھ لڑکیاں بھی قید ہیں۔ ہمیں انہیں بھی ساتھ لے لینا چاہیے۔''

میں نے اس لڑکے کو اپنے پاس بلا لیا اور بقیہ لوگوں سے کہا۔

''باہر بہت سردی ہے اور آپ کے پاس دو منٹ ہیں۔ جس کے پاس جو بھی گرم کپڑا یا چادر وغیرہ ہے وہ ساتھ لے لے اور یہاں مجھے تیار ملے۔ اس کے بعد میں اس لڑکے کے ساتھ لڑکیوں کے حصہ میں پہنچی۔ وہاں پچیس جوان لڑکیاں موجود تھیں اور ان کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ جو یہاں ہو رہا تھا۔ وہ بتانے کے لائق نہیں۔

بہرحال سات افراد کے سوا سبھی لوگ تقریباً اس حالت میں تھے کہ آسانی سے یہاں سے نکل سکتے تھے۔ بچوں کی تعداد نو کے قریب تھی۔ جن میں دو بچیاں بھی شامل تھیں اور لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت انہیں اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

اوزاروں کے تھیلے میں سے پلاس لے کر میں نے اس تہہ خانے کی بجلی کی سپلائی منقطع کر دی۔ مندر میں سبھی لوگ جمع تھے اور ایک ایک کر کے گڑھے میں اتر رہے تھے اور بتدریج سرنگ کے ذریعے باہر نکل رہے تھے۔ باہر جھنڈ میں ہی سب جمع ہو رہے تھے۔ جب سب لوگ مندر سے نیچے موجود گڑھے میں پہنچ گئے تو میں بھی نیچے اتری اور میں نے خلا کو ایک بار پھر بند کر دیا۔ بچی کی لاش بھی ایک شخص چادر میں ڈال کر اوپر لے گیا تھا۔ باہر درختوں میں ایک جم غفیر جمع ہو چکا تھا۔ میں جونہی باہر پہنچی۔ ایک شخص میرے قریب آیا اور اس نے بتایا کہ دو لڑکے باہر نکلتے ہی بھاگ گئے ہیں۔ مجھے ان کی اس حرکت پر افسوس تو بہت ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

میں نے بقیہ لوگوں سے کہا کہ وہ لوگ میرے

پیچھے پیچھے آجائیں۔ بچوں کی اکثریت کو لڑکیوں نے اپنے کندھوں پر لاد رکھا تھا۔ زخمیوں کو بھی بندوں نے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور باری باری ایک دوسرے کا ساتھ بٹا رہے تھے۔ ہم بہت سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ تقریباً دس ایکڑ دور آنے کے بعد ایک جگہ درختوں اور سرکنڈوں کی بہتات کو دیکھ کر میں رک گئی۔ میں نے ان تمام لوگوں کو اس جھنڈ میں بٹھایا اور خود تھوڑی دور موجود سرکنڈے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس سرکنڈے کی جڑوں سے ریت ہٹانی شروع کی۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے مطلوبہ چیز مل گئی۔ یہ ایک موبائل تھا جو کہ میرے دوستوں نے کسی اشد ضرورت کے تحت یہاں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ موبائل نکال کر آن کیا اور اپنے دوستوں کو کال کی۔

جونہی دوسری طرف سے رابطہ ہوا۔ میں نے کہا۔

"میں لوکیشن فور پر موجود ہوں۔ میرے ساتھ ایک سو ستر کے قریب لوگ موجود ہیں۔ جن میں لڑکے لڑکیاں، بچے اور زخمی بھی شامل ہیں۔"

"میڈم! آپ فوری طور پر تمام لوگوں کو یہاں سے لے کر دریا کی طرف نکلیں وہ جو سامنے آپ کو ٹیلہ نظر آرہا ہے اس تک پہنچیں۔ آپ تمام لوگ ٹریس ہوچکے ہیں اور وہ لوگ آپ کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ ذرا جلدی کریں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے یہ کہ کر تمام لوگوں کو اپنے ساتھ لیا اور انتہائی تیزی سے ٹیلے کی طرف بڑھی۔ میں نے ایک ہوشیار قسم کے شخص کو اپنے پاس بلایا اور تیزی سے چلتے ہوئے اسے تمام باتوں سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ اب تم ان لوگوں کی رہنمائی کرو گے اور سامنے نظر آنے والے ٹیلے کے پیچھے تمہیں ایک یا دو لوگ ملیں گے۔ اس سے آگے کا سفر تم ان کے ساتھ طے کرو گے۔ میں اس قافلے کے پیچھے پیچھے آرہی ہوں۔" اس نے مجھے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے کہا۔

"سوال جواب کا وقت نہیں رہا۔ اب کسی بھی وقت فائرنگ شروع ہوسکتی ہے۔ لہٰذا جو میں کہتی ہوں اس پر بلا چون وچرا عمل کرو۔"

میں ایک طرف ہوکر کھڑی ہوگئی اور لوگ جو ایک ریلے کی صورت میں میرے پیچھے آرہے تھے۔ وہ بھی رکنے لگے تو میں نے انہیں ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ چلتے رہیں۔ اب میں سبھی لوگوں کے پیچھے چل رہی تھی۔ میری تمام حسیات بیدار ہوچکی تھیں۔ میرے پاس ایک کمانی دار چاقو کے علاوہ کوئی اسلحہ نہ تھا۔ بے ہوش کر دینے والی گن اور پستول تہہ خانے میں ہی کہیں رہ گئے تھے۔ ابھی ہم ٹیلے سے کچھ فرلانگ کی دوری پر تھے کہ اچانک فضا فائرنگ کی تیز گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھی اور ہمارے پیچھے سے کوئی چیخا۔

"سب لوگ جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔ ورنہ تمہیں گولیوں سے......"

ابھی اس کے الفاظ پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ ٹیلے کے پیچھے سے کسی نے فائر کیا اور بولنے والے کے الفاظ چیخوں میں بدل گئے۔

اس کا مطلب ہے کہ میرے دوست ٹیلے کے پیچھے پہنچ چکے تھے اور بہترین پوزیشن میں تھے۔ اب خاموش رہنا بیکار تھا۔ "میں نے چیخ کر اپنے ساتھ موجود لوگوں سے کہا بھاگو اور جتنی جلد ہوسکے ٹیلے کے پیچھے پہنچو۔"

جان بچانے کی آرزو نے لوگوں میں ایک نیا جذبہ بھر دیا تھا۔ میں خود بھی بھاگ رہی تھی اور خدا کا شکر ہے کہ ہم بغیر کسی نقصان کے ٹیلے کے پیچھے پہنچ چکے تھے۔ اب دوطرفہ فائرنگ شروع ہوچکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ تین افراد مختلف پوزیشنوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ کہیں سے کالے رنگ کا ٹراؤزر پہنے ایک شخص نمودار ہوا اور وہ سیدھا میری طرف آیا اور اس نے کہا۔

"میڈم! کامیابی مبارک ہو۔"

میں اس کے جواب میں خاموش رہی تو اس نے کہا۔ "میڈم ہم تھوڑی دیر سے زیادہ یہاں رک نہیں پائیں گے۔ ان سب لوگوں سے کہہ دیں کہ اب وہ ہمارے لوگوں کے ساتھ تعاون کریں ابھی کچھ لمحوں میں دو افراد یہاں آنے ہی والے ہیں وہ انہیں لے کر دریا کے ساتھ ساتھ نکل جائیں گے۔ تقریباً دو کلومیٹر کی دوری پر دریا کے اوپر ایک پل ہے۔ اس پل سے آگے تھوڑی دوری پر ایک لنک روڈ پر دو کنٹینر کھڑے ہیں۔ ان کنٹینروں کے ذریعے یہ لوگ یہاں سے نکل جائیں گے۔ اتنی دیر میں ہمارے لوگ ان لوگوں کو ادھر الجھائے رکھیں گے اور ہم اللہ کے فضل وکرم سے کامیاب ہوں گے۔"

"انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دو لوگ ایک طرف سے بھاگتے ہوئے آئے اور انہوں نے ہمیں سلام کیا اور ایک طرف خاموشی سے کھڑے ہوگئے۔ میں نے سب لوگوں کو اکٹھا کیا اور مختصراً بتایا کہ انہوں نے اب کیا کرنا ہے۔ وہ میری بات سمجھ چکے تھے۔ کچھ نے میرا شکریہ ادا کرنا چاہا تو میں نے انتہائی سختی سے کہا۔ کہ وقت برباد نہ کرو۔ اور ان دونوں کے ساتھ چلے جاؤ، مگر میں نے دیکھا کہ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ مگر میرے سخت رویے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ اتنے میں ایک بزرگ آگے بڑھے اور انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"بیٹا! ہماری قوم کو تمہارے جیسی حوصلہ مند بیٹیوں پر فخر ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کروں گا کیونکہ شکریہ کا لفظ آپ کے احسان کے آگے بہت چھوٹا ہے۔" اس سے آگے اس بزرگ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ کیونکہ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگا تھا۔

اس کے بعد سب لوگ مجھ سے اظہار تشکر کرنے لگے سب کی آوازوں میں لرزش تھی کچھ کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں تھے۔

کسی نے آہستگی سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "میڈم پلیز، دیر ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کو جانے کی اجازت دیں۔" میں آنسو پونچھتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ آبدیدہ نظروں سے سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ میرے پیارے وطن کے پیارے لوگو۔ خدا حافظ۔"

اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکی۔ درد کی شدت سے میرے حلق میں گولا سا پھنس گیا تھا۔

دو لوگ جن کے پاس بہترین گنیں تھیں آگے بڑھے اور تمام لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ ان تمام باتوں کے دوران دوطرفہ زبردست فائرنگ جاری رہی تھی اور جنگل کی طرف سے تو بے انتہا فائرنگ ہو رہی تھی۔

ان لوگوں کے مناسب فاصلہ طے کرتے ہی ہمیں بھی یہاں سے نکلنا تھا۔ وہ لوگ کافی تیزی سے دریا کے ساتھ سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتے جارہے تھے۔ اور مجھے امید تھی کہ وہ اتنے فاصلے پر پہنچ چکے تھے کہ خیریت سے نکل سکتے تھے۔

ہم ابھی یہاں سے نکلنے کی پلاننگ بھی نہ کر پائے تھے کہ دریا کی دوسری طرف سے کسی نے گرنیڈ پھینکا۔ جو مجھ سے تھوڑی دور آگے گرا۔ میں انتہائی تیزی سے ایک طرف بھاگی، اور ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ

ہوا۔ مگر خیریت گزری کہ میں بال بال بچ گئی۔ کیونکہ دھماکے کے پریشر سے میں زمین پر گر گئی تھی۔ آگ کے گولے میرے گرد رقصاں تھے۔ دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ دریا کے دوسری طرف سے بھی دوطرفہ فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ ان حالات میں میرے دوست جانے کہاں نکل گئے تھے۔ ان کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ ہر طرف بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں ریت کے ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پیچھے پڑی تھی۔ اس افراتفری میں میرے پاس موجود موبائل بھی کہیں گر گیا تھا۔

اب یہاں رکنا خودکشی کے مترادف تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ سروں پر پہنچ جاتے میں انتہائی سرعت سے اٹھی اور ایک طرف تیزی سے بھاگی۔ میرے پیچھے آگ اور دھوئیں کا رقص جاری تھا۔ مگر خیریت گزری کہ کسی نے مجھے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ابھی تک میں دریا کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ فائرنگ کے مقام سے مناسب دوری پر آتے ہی میں نے ایک دفعہ پھر بیلے کا رخ کیا۔ اور گھنے درختوں اور سرکنڈوں کی آڑ لیتی ہوئی بھاگتی رہی۔ ابھی مجھے بیلے میں پھیلے ہوئے اس جنگل میں کافی سفر طے کرنا تھا۔

آج رات سردی بھی اپنے جوبن پر تھی۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا چل رہی تھی اور آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی۔ گرم مفلر سے میں نے اپنے چہرے کو لپیٹ رکھا تھا۔ میرے پاؤں میں گرم جوگر بوٹ تھے جو کہ کافی ہلکے اور آرام دہ تھے اور حقیقت میں یہ بوٹ ورزش وغیرہ کے لیے انتہائی موزوں تھے۔ میں اپنے خیالوں میں گم درختوں اور سرکنڈوں کے درمیان احتیاط سے چلتی ہوئی جا رہی تھی۔ کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے مجھ سے کچھ فاصلے پر کچھ لوگ موجود ہیں۔

میں یکدم رک گئی۔ کہیں سے کچھ لوگوں کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہوا انہی لوگوں کی طرف سے آ رہی تھی اور اس ہوا میں رچی بو سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ لوگ شراب پی رہے تھے۔ میں درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک میری چھٹی حس نے مجھے ادراک دیا کہ کچھ لوگ مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں میں نے جھنڈ سے سر تھوڑا سا باہر نکال کر دیکھا تو مجھے ایک جیپ بھی نظر آئی۔ اور مجھے لگتا تھا کہ یہ وہی جیپ تھی جو میں نے حویلی میں دیکھی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ بیلے میں موجود اشتہاری اور ڈکیت بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میری پشت پر کوئی موجود تھا۔ اور اچانک مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ جو بندہ گھات لگائے مجھے پکڑنے کے لیے تیار تھا۔ میرے اس اقدام سے حیران رہ گیا۔ اس نے پیچھے سے ہوائی فائر کیا اور مجھے روکنے کی کوشش کی۔ مگر اب میں ان کے ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔

اتنی دیر میں جیپ کے پاس کھڑے لوگوں نے جیپ اسٹارٹ کر لی تھی اور ہوائی فائرنگ بھی کی اور جیپ میں بیٹھ کر میری تلاش شروع کر دی۔ کچھ لوگ شاید گھوڑوں پر سوار ہو کر بھی ہماری تلاش میں تھے۔ جس کا پتہ مجھے بعد میں چلا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ یہ جنگل کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ مگر میں نے تیزی سے بھاگنا جاری رکھا۔ آخر کار پندرہ منٹ کی مسلسل جدوجہد کے بعد دور کہیں گاؤں کی روشنیاں نظر آئیں میں نے درختوں سے ذرا سا سر باہر نکال کر دور تک جھانکنے کی کوشش کی تو میں نے ایک گھڑ سوار کے ہیولے کو کچھ دوری پر پایا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ یہ شاید انہی لوگوں کا ساتھی تھا اور گاؤں کے

راستے پر گھات لگائے بیٹھا تھا۔

جنگل میں اب بھی کہیں کہیں فائرنگ کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی گیدڑوں اور جھینگروں کی ملی جلی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اسی دوران تیز ہوا بھی چلنے لگی۔ میں نے سوچا کہ اب کیا کروں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ عین میرے پیچھے درختوں میں ہلچل ہوئی۔ میں جلدی سے نیچے بیٹھی اور آہستگی سے گھٹنوں کو فولڈ کرتے ہوئے زمین پر لیٹ گئی اور اپنی سانسوں کو نارمل کرتے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا تو ایک اسلحہ بردار کو جھاڑیوں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے پایا۔ اتنے میں دور کہیں سے آواز آئی۔ ”ہاں کچھ ملا؟“

”میں ابھی دیکھ رہا ہوں۔“

اتنی دیر میں جانے کہاں سے ایک گیدڑ بھاگتا ہوا اس کے پاس سے گزرا۔ اس نے کہا ”ہت تیرے کی۔ ارے ادھر کچھ نہیں ہے یار یہ تو گیدڑ تھا۔“

”اچھی طرح سے دیکھو۔“

”یار ادھر کچھ نہیں ہے چلو دوسری طرف دیکھتے ہیں۔“

”چلو آؤ جلدی۔“

اسلحہ بردار تیزی سے اس کی طرف چلا گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اس سے تو جان چھوٹی۔ دور گاؤں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور مجھے یہ فاصلہ انتہائی تیزی سے دوڑتے ہوئے طے کرنا تھا۔ جنگل کے ساتھ گندم کی فصل تھی جو کہ ابھی چھوٹی تھی۔ اس لیے کچھ فاصلہ میں نے کرالنگ کرتے ہوئے طے کیا۔ سامنے برگد کا درخت تھا۔ میں اس تک پہنچی اور اپنے جسم کو ریلیکس کرنے کے لئے چند منٹوں تک لیٹی رہی۔ سانسوں کے ہموار ہوتے ہی میں برگد کے درخت کے تنے کے قریب جا کے کھڑی ہو گئی۔ اور ذرا سکون سے میں نے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ جنگل سے اب بھی اکا دکا فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے شکاری شکار کھیل رہے ہوں۔ ہاں یہ لوگ شکار ہی تو کھیل رہے تھے مگر شاید یہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ شکار ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

مگر یہ میری بھول تھی۔ ابھی میں کھڑی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ جانے کہاں سے ایک اسلحہ بردار شخص نمودار ہوا اور میری طرف رائفل تان کر بولا۔

”ہاں جی، میری جان، اب بھاگ کر کہاں جاؤ گی ہمارے ہاتھ آئے ہوئے تو آج تک مرد نہ بھاگ سکے۔ تم تو پھر ایک لڑکی ہو تم نے ابھی ہمارا دیکھا ہی کیا ہے۔“

”پلیز مجھے جانے دیں۔ میں نے آپ لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔“

”تم ہمارا بگاڑ بھی کیا سکتی ہو چڑیا۔“

”تمہارے گھر میں بھی ماں بہن ہو گی۔ خدا کے لئے آپ کو ان کا واسطہ مجھے جانے دیں۔“

”میرا نام ماجھی ڈکیت ہے اور میری نہ کوئی ماں ہے نہ بہن، اور میں ان تمام رشتوں سے آزاد ہوں۔ میری چھمک چھلو! تمہاری رہائی کی صرف اور صرف ایک ہی صورت ہے۔ اگر تم میرا دل پشوری کر سکو تو اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔“

”مجھے ایک بار یہاں سے نکل جانے دو۔ تم جتنی دولت مانگو گے تمہیں مل جائے گی۔“

”میرے لیے سب سے بڑی دولت تمہارا جسم ہے۔ آؤ میری جان میرے گلے لگ جاؤ اور اپنی رہائی کا پروانہ حاصل کر لو۔“ اس نے ہوس بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

جب میں نے دیکھا کہ کسی بھی صورت اس بندے سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ تو میں نے سوچا کہ

اس کا کوئی حل نکالوں۔ جب کہ وقت بھی کم ہے اور مجھے جلد از جلد آبادی تک پہنچ کر اپنا بچاؤ بھی کرنا ہے۔ اس کے ساتھیوں کا جتھا کسی بھی وقت ادھر آسکتا ہے۔

"اگر تم نہیں مان رہے تو......" میں نے تو کو ذرا لمبا کیا اور اپنے آپ کو ایسا ظاہر کیا۔ جیسے کہ میں اس کے آگے ہار چکی ہوں اس قماش کے مردوں کی یہی سب سے بڑی کمزوری ہے اور میں نے اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ میرے اس جملے کو اس نے میری رضامندی جانا۔ اس نے مجھے ایک بار پھر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"آؤ میری جان' آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔" اس نے دونوں بازو وا کر دیے اور کہا۔ "کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ میں رائفل رکھ رہا ہوں اور تم مجھ سے بھاگ کر جاؤ گی بھی کہاں۔ میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ تمہیں چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں۔ میرا نام ماجھی ڈکیت ہے اور دنیا میرے نام سے کانپتی ہے۔ تم میرے لیے کیا چیز ہو۔" یہ کہتے ہی اس نے خود اعتمادی سے رائفل برگد کے درخت کے تنے سے لگا کر رکھ دی اور تیزی سے میری طرف جھپٹا۔

یہیں وہ مار کھا گیا اسے علم نہ تھا کہ اس کے آگے کون کھڑا ہے۔ اس کے آگے کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ میں نے اس پر حملہ کرنے کا سوچا۔ اب تو اس کے ہاتھ میں رائفل بھی نہ تھی اور میں چاہتی تو اسے تگنی کا ناچ نچا سکتی تھی۔ مگر یہ کھیل کا گراؤنڈ نہ تھا۔ یہ عملی زندگی تھی اور دنیا بڑی ظالم ہے۔ تمام حالات ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے پہلا حملہ ہی وہ کیا۔ جو بڑے بڑوں کا پتہ پانی کر دیتا ہے اور بندے کو اس اذیت سے دوچار کر دیتا ہے کہ وہ درد شاید کوئی ذبح ہوتا ہوا جانور بھی محسوس نہ کرتا ہو۔ جی قارئین آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے کیا سوچا جونہی وہ پاگل مجھ سے مناسب فاصلے پر آیا۔ تو میں نے وہ کیا جو کہ اس ہوس زدہ مرد کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

میں نے اپنی داہنی ٹانگ میں اپنے پورے جسم کی قوت سمو دی اور پوری طاقت سے اس کے جسم کے زیریں نازک ترین حصے پر ٹھوکر ماری اور اس کا نتیجہ میری توقع سے بھی زیادہ نکلا۔ وہ شخص جو ابھی فرعون کی طرح اکڑ رہا تھا۔ ڈکراتے ہوئے کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ مغلظات بکنے لگا۔

"خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیے جاؤ گے۔" میں نے جلدی سے رائفل اٹھائی۔ رائفل کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی اور غضب ناک لہجے میں کہا۔

ماجھی ڈکیت شاید حالات کی سنگینی کو سمجھ چکا تھا۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ مگر اس کا چہرہ اس وقت نہایت اذیت ناک تاثر پیش کر رہا تھا۔

"اب میری بات غور سے سنو۔ اپنی پگڑی اتارو۔ اور الٹا لیٹ جاؤ۔" مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے میری بات ماننے ہی میں عافیت جانی۔ وہ جونہی الٹا لیٹا تو میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے دو لوڈڈ میگزین جرمن پسٹل' فالتو کارتوسوں کا تھیلا اور ایک موبائل برآمد ہوا میں نے یہ تمام چیزیں اپنے قبضے میں کر لیں۔ ماجھی ڈکیت کی ہلکی ہلکی کراہیں بے پناہ برداشت کے باوجود نکل رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ اسے بہت زبردست چوٹ لگی تھی۔ میں نے اس کی پگڑی اٹھا کر اس کے ہاتھ جو پہلے ہی پشت پر کیے ہوئے تھے اچھی طرح سے گرہ لگا کر باندھ دیے اور اس کے دونوں پاؤں بھی موڑ کر ہاتھوں کے ساتھ ملا دیے اور ایک دفعہ پھر اچھی طرح گرہ لگا دی۔

ماجھی ڈکیت کی ساری اکڑفوں نکل چکی تھی۔

اب وہ مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر تھا اور اس کی تمام خود اعتمادی ہوا ہو چکی تھی۔ اس کا موبائل میرے پاس موجود تھا۔ میں نے سوچا۔ ابو میرے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ اس لیے ان سے بات کر لینی چاہیے۔

"ابو۔" میں نے ان کا موبائل نمبر ملایا۔ کال ملتے ہی میں نے کہا۔

"بیٹا تم کہاں ہو؟" میری آواز سنتے ہی نیند میں ڈوبی آواز میں بولے۔

"ابو سب سے پہلے تو میں آپ سے معافی مانگتی ہوں کہ میں آپ کو ٹور کی اطلاع نہیں دے سکی۔ بس اچانک پروگرام بن گیا تھا اور میں دوستوں کے ساتھ نکل گئی تھی۔ انشاءاللہ میں کل آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔"

"بیٹا' تمہیں پتہ ہے میں تمہارے لیے کتنا پریشان تھا۔ چلو ٹھیک ہے اب صبح تم آؤ گی تو تمام باتیں ہوں گی۔ رات بہت زیادہ ہو گئی ہے آرام سے سو جاؤ۔"

ابو میری تمام باتوں کو سمجھتے تھے اور مجھے امید تھی کہ جو میں انہیں سمجھانا چاہتی تھی وہ سمجھ چکے تھے۔

اب یہاں سے بھاگ کر نکلنا ہی میرا اولین مقصد تھا مگر میں نے ان لوگوں کو سرپرائز دینے کا فیصلہ کیا۔ برگد کے درخت کا تنا کافی مضبوط اور چوڑا تھا اور یہ میرے لیے بہترین مورچہ تھا۔ میں نے رائفل کی نال برگد کے درخت کے دوشاخے میں ایڈجسٹ کی' رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کیا اور اللہ کا نام لے کر تین چار فائر کیے۔ فائرنگ کی آواز جنگل میں موجود میری تلاش میں سرگرداں لوگوں نے بھی سنی اور انہوں نے بھی جوابی فائرنگ کی۔

اس دوران سرد ہوا کافی تیز ہو چکی تھی۔ چاند جو کہ آخری تاریخوں کا تھا پہلے ہی کہیں بادلوں میں گم ہو چکا تھا۔ جنگل میں اب بھی ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی للکاروں اور جیپ کے انجن کے شور کی آواز سنائی دیتی تھی۔ شاید وہ لوگ ادھر کا رخ کر رہے تھے۔ کبھی کبھی جب بجلی چمکتی تو سارا منظر واضح ہو جاتا تھا۔ اچانک بجلی چمکی تو میں نے چند گھڑ سواروں کو گھوڑوں سے اترتے دیکھا۔ وہ لوگ یقیناً میری طرف ہی آنے والے تھے۔ انہوں نے آہستگی سے ماجھی کو پکارا۔ مگر وہ بیچارہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ کیونکہ اسے پتہ چل چکا تھا کہ اس کا واسطہ کس سے پڑ چکا ہے اور اسے جواب دینے کے کیا نتائج بھگتنا پڑیں گے۔

وہ لوگ اس علاقے کے بادشاہ تھے اور بالکل بے خوف ہو کر ادھر آرہے تھے۔ ماجھی کے جواب نہ دینے پر وہ تذبذب کا شکار ضرور تھے مگر وہ جانتے تھے۔ کہ اس علاقے میں کوئی ان کے مقابلے پر نہیں آسکتا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ ایک نہتی لڑکی ان کا کیا بگاڑ لے گی مگر یہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ کبھی کبھی خدا چڑیوں سے بھی باز مروا دیتا ہے۔ شاید ان لوگوں کی قضا انہیں میرے قریب لا رہی تھی۔ اور یہ سب لوگ بے خبری اور اندھا دھند زعم میں مبتلا اپنی موت کی طرف بڑھ رہے تھے یہ لوگ معاشرے کا ناسور تھے ان کی وجہ سے جانے کتنے لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور میرے دل میں ان کے لیے رحم نام کی کوئی شئے نہ تھی۔

میں نے اپنے خدا کو شدت سے یاد کیا اور بارگاہ خداوندی سے سرخروئی کی دعا کی اور میرے اللہ پاک نے مجھے وہ ہمت عطا کی جو چٹانوں سے ٹکرانے کا جذبہ رکھتی ہے۔ بجلی ایک بار پھر چمکی اور میں جو رائفل برسٹ پر پہلے ہی سیٹ کر چکی تھی۔ ان کی لوکیشن واضح ہوتے ہی میں نے رائفل کا دہانہ کھول دیا اور شاید یہ چار پانچ لوگ تھے۔ جو بڑی بے خوفی اور بے

فکری سے ایک کھال پر چلتے ہوئے آرہے تھے۔ مگر میری رائفل کے ایک ہی برسٹ نے ان میں سے کچھ لوگوں کو یقیناً گھائل کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کی چیخ وپکار بتا رہی تھی کہ رائفل کے برسٹ نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

اچانک ان لوگوں میں سے کسی نے برگد کے درخت کی طرف ایک طویل برسٹ مارا اور گرجدار آواز میں بولا۔

''تم جو کوئی بھی ہو تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔'' یہ تو ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ یہ میں بھی ہوسکتی ہوں۔

اس نے ایک اور برسٹ مارا اور اپنے ساتھیوں کو تسلی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے موبائل فون پر کسی سے بات کی۔ ''ادھر برگد کے درخت کے نیچے کوئی ہے۔ فوراً پہنچو۔ ہاں ہاں آبادی والی سائیڈ پر۔ میرے تین ساتھی شدید زخمی ہیں جلدی پہنچو۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ ان میں سے شاید ایک ہی بندہ فائرنگ کرنے کے لائق ہے اور یہ یقیناً مجھے آسانی سے بھاگنے نہ دے گا۔ مذکورہ کھال جس میں یہ لوگ پڑے ہوئے تھے وہ انہیں بہترین آڑ فراہم کر رہا تھا اس کھال میں ایک موڑ تھا۔ اگر میں اس تک پہنچ جاتی تو اس بندے کو ہٹ کر سکتی تھی۔

میں نے آہستگی سے میگزین لوڈ کی۔ مگر شاید یہ آواز اس شخص نے بھی سن لی تھی۔ اس نے ایک طویل برسٹ برگد کے درخت کی طرف داغا۔ اسے میری لوکیشن کا اندازہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اسی وہم میں چھوڑا اور زمین پر رینگتے ہوئے کھال کی طرف بڑھی۔ آہستہ آہستہ میں کھال کے اس موڑ تک پہنچ گئی۔ جہاں سے وہ بندہ ہٹ ہوسکتا تھا مگر اتنے میں جیپ کے انجن کا شور سنائی دیا اور لوگوں کے للکارے بھی سنائی دیئے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پورا برسٹ کھال میں داغ دیا۔ ایک بار پھر کھال میں پڑے لوگوں پر قیامت بیت گئی اور شاید اب ان میں سے کوئی زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔ مگر میں تمام نتائج کی پروا کیئے بغیر وہاں سے بھاگی۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور پسٹل میں نے نیفے میں اڑس لیا تھا اور میں اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بھاگ رہی تھی۔

میرے پیچھے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی، مگر ابھی تک ان لوگوں کو صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اچانک بجلی چمکی اور ان میں سے کسی نے مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر شور مچایا۔ ادھر دیکھو کوئی بھاگا جا رہا ہے۔ مجھے تو وہی لڑکی لگتی ہے۔ یہ سن کر ان میں سے کچھ لوگ میرے پیچھے بھاگے۔ اب ان لوگوں نے رات کے اندھیرے میں اندازاً مجھے ہٹ کرنے کے لیے فائر بھی کیے۔ مگر اب میں ان کی فائرنگ رینج سے باہر تھی۔

بھاگتے بھاگتے جب میں آبادی کے قریب پہنچنے والی تھی تو اچانک جانے کس چیز میں میرا پاؤں الجھا اور میں گر پڑی۔ میں گندم کے کھیت میں گھسٹتی ہوئی کچھ دور تک گئی۔ میں جلدی سے اٹھی اور بھاگنا چاہا تو میرے بائیں پاؤں نے چلنے سے انکار کر دیا۔ لگتا تھا کہ میرے بائیں پاؤں میں زبردست موچ آگئی تھی۔ اس تھوڑے سے وقفے نے میرے دشمنوں کو مجھ سے اور قریب کر دیا تھا۔ اب میں ان کی فائرنگ رینج میں آچکی تھی اور میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ان لوگوں کی چلائی ہوئی ایک گولی میری بائیں ٹانگ کی پنڈلی میں آن لگی اور گوشت کو پھاڑتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس سے میں ایک بار پھر زمین پر آرہی۔ ایک دفعہ تو درد کی شدید لہر نے میرا دماغ ماؤف کر دیا۔ مگر یہ صرف چند لمحے تھے۔ جلد ہی جان

بچانے کی فطری جبلت نے مجھے ہر درد سے بے نیاز کر دیا۔ میں نے فوری طور پر اپنی رائفل سے ایک ہلکا برسٹ ان کی طرف داغا اور ادھر ادھر جائے پناہ کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ گاؤں ابھی تقریباً دو ایکڑ کے فاصلے پر تھا اور میری حالت یہ تھی کہ فی الحال تو حرکت کرنا بھی میرے لیے محال تھا۔

آسمان بادلوں سے مکمل طور پر ڈھک چکا تھا۔ تیز سرد ہوا جسم کو چیر رہی تھی۔ گندم کی فصل ہوا سے لہرا رہی تھی اور اوپر سے گھپ اندھیری رات۔ ایک عجیب سا خوفناک سماں تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید میری زندگی کا آخری وقت قریب تھا۔ کیونکہ میری ذات سے ان لوگوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا تھا اور ایسے حالات میں پاگل ہو کر وہ لوگ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

میں گندم کے کھیت میں پڑی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اپنے آپ کو ایک کھنڈر کے قریب پایا، میں نے اپنا دوپٹہ جو کمر سے باندھ رکھا تھا جلدی سے اتارا اور ٹانگ کی بائیں پنڈلی کے زخم پر کس کے باندھا اور خود کو گھسیٹتے ہوئے کھنڈر میں جا پہنچی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی قوت سے کھنڈر کی دیوار کو پکڑا اور کھڑی ہو گئی۔ چار سو اندھیرے میں میں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور زندگی کی آخری سانس تک لڑنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے پاس بچی گولیوں کی واحد میگزین کو لوڈ کیا اور رائفل کو سنگل شارٹ پر سیٹ کر کے تین چار راؤنڈ بیلے کی طرف فائر کیے۔

اب میرے پاس اسلحہ کم تھا اور مجھے انتہائی محتاط ہو کر اسے استعمال کرنا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر وقفہ کیا بیلے کی طرف سے اب بھی فائرنگ ہو رہی تھی مگر یہ ہوائی فائرنگ تھی، میں ایک دفعہ پھر اٹھی اور بیلے کی طرف فائرنگ کرنا چاہی مگر اچانک کسی نے پیچھے سے مجھ پر موٹا سا کمبل پھینکا اور میں اسے ابھی اپنے آپ سے علیحدہ بھی نہ کر پائی تھی کہ کسی نے مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں جکڑ لیا۔

☆☆☆☆☆☆

میں بھاگتے ہوئے گھر پہنچا، اندر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اس شخص کو اپنے بیڈ پر لٹا دیا اس کے بعد میں نے بھاگ کر مین گیٹ کو تالا لگا کر بند کر دیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے ایمرجنسی لائٹ جلائی۔ کیونکہ بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اتنے میں میری والدہ بھی اٹھ چکی تھیں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ گھر میں ہم دونوں ماں بیٹا ہی رہتے تھے میرے والد صاحب میرے بچپن ہی میں فوت ہو چکے تھے میرے والد صاحب کی وفات کے بعد میری والدہ نے مجھے ہی اپنی کل کائنات سمجھا۔ ہماری کچھ زمینیں تھیں۔ جن کی آمدنی سے گزارہ ہو رہا تھا۔ اب تو خیر سے میں جوان ہو چکا تھا۔ اور تمام زمینوں کی دیکھ بھال بھی خود کرتا تھا۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ جب میں نے لائٹ جلائی تو میری والدہ بھی اٹھ چکی تھیں میں نے ان کے سامنے ہی بندھے ہوئے شخص کی بندشیں کھولیں۔ امی یہ سب دیکھ کر حیران و پریشان تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔

''بیٹا یہ سب کیا ہو رہا ہے کچھ مجھے بھی بتاؤ گے کیا، اور یہ کون ہے جسے تم اٹھا لائے ہو؟''

''امی ابھی تو مجھے خود معلوم نہیں آپ کو کیا بتاؤں۔ بہرحال ابھی تھوڑی دیر میں ساری صورت حال واضح ہو جائیگی۔''

دھماکے ابھی تک جاری تھے۔ بیلے کی طرف سے آسمان سرخ ہوتا نظر آرہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں سنائی دیتی تھی۔

''باہر حالات بڑے خراب ہیں۔ ساتھ والے

بیلے سے کچھ لوگ اس لڑکی کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں اسے ان لوگوں سے چھڑا کر ادھر لے آیا ہوں۔ آپ پلیز اس کا خیال رکھیں۔" میں نے امی سے کہا اتنے میں لڑکی کراہی تو میرا دھیان اس کی زخمی ٹانگ پر پڑا۔ میں نے ٹانگ دیکھی تو ایک دفعہ تو میں گھبرا گیا اتنے میں لڑکی گویا ہوئی۔

"دیکھئے زیادہ مسئلہ نہیں ہے۔ اگر فرسٹ ایڈ بکس مل جائے تو......"

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں ابھی لا دیتا ہوں۔"

گھر میں ایمرجنسی کے لیے فرسٹ ایڈ بکس رکھا ہوا تھا میں نے جلدی سے دوسرے کمرے میں جا کر فرسٹ ایڈ بکس اٹھایا اور اس کے حوالے کیا اور کہا کہ

"میں ذرا باہر کی صورت حال کا اندازہ لگا لوں۔"

"آپ بے فکر ہو کر جائیں میں امی کے ساتھ مل کر کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔"

"میرے خیال میں آپ صرف تھوڑی دیر انتظار کریں۔ میں خود آ کے اس زخم کو دیکھتا ہوں۔ آپ نے کس کر پٹی باندھی ہوئی ہے۔ اسے فی الحال بندھا ہی رہنے دیں کہیں بے احتیاطی میں خون نکلنا شروع ہو گیا تو مسئلہ بن جائے گا۔"

"ٹھیک ہے آپ جائیں۔"

میں تیزی سے باہر نکلا۔ تو میں نے دیکھا کہ پورا گاؤں جاگ اٹھا تھا۔ لوگ گھروں سے نکل کر گاؤں سے باہر فائرنگ کے مقام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کچھ لوگ چھتوں پر چڑھ کر صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ دھماکوں کی آواز اتنی شدید تھی کہ اس میں فائرنگ کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔ بیلے کی طرف سے آسمان سرخ ہو رہا تھا۔

میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ ہمارے گاؤں میں کافی عرصے سے دشمنیاں چلی آ رہی تھیں۔ لوگوں کی کافی تعداد کے پاس اسلحہ تھا۔ یقیناً کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر لوگ جذباتی ہو چکے تھے اور یہ میرے حق میں بہتر تھا ابھی کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اصل حقائق کیا تھے۔ اس واقعے کی اصل وجہ میرے گھر میں موجود تھی اور وہ یقیناً کسی کی عزت تھی اور میں کسی کی عزت نیلام نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ اس واقعے کی تشہیر سے ہر ممکنہ حد تک بچا جائے۔

گاؤں والوں کو بلہ شیری دینے کے لیے میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ سب سے پہلا جو شخص مجھے وہاں ملا وہ جبرو تھا۔

"جبرو بھائی یہ سب کیا ہے؟"

"ارسلان بھائی! یہ سارا کیا دھرا سالے شمسو کا ہے۔ وہ بیلے والے ڈاکوؤں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ابھی کل ہی اس نے مجھے دھمکی دی تھی۔ یہ میری دیوار دیکھ رہے ہو گولیاں مار مار کے سارا پلستر ادھیڑ کر رکھ دیا ہے حرامزادوں نے۔"

دیواروں کی آڑ میں اور چوباروں پر گاؤں والوں نے مورچے بنا لیے تھے اور فائرنگ کر رہے تھے۔ بیلے کی طرف سے آنے والے لوگ اب سمجھ چکے تھے کہ کھیل ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور وہ آہستہ آہستہ پسپا ہو رہے تھے۔ اس کی اصل وجہ تو بیلے کی طرف سے ہونے والے پے درپے دھماکے تھے۔ اگر یہ دھماکے شروع نہ ہوتے تو شاید یہ لوگ گاؤں پر حملہ کر کے اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر ہی جاتے۔ مگر بیلے میں ہونے والے دھماکوں نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔

"کسی نے کہا ون فائیو پر فون کرو بھاگ رہے ہیں حرامزادے۔"

"وہ کیا کریں گے آ کر۔ الٹا ہمیں ہی پکڑ کر لے جائیں گے خبردار جو کسی نے فون کیا تو ہم نے چوڑیاں نہیں پہنی ہوئی ہم خود اپنا بدلہ لیں گے۔"

خطرہ ابھی مکمل طور پر ٹلا نہیں تھا۔ مگر میرے خیال میں اب میری یہاں ضرورت نہیں تھی۔ مگر گاؤں والوں سے ہم آہنگی کے لیے میں نے بھی دیوار کی اوٹ سے فائرنگ کی اور دو چار للکارے مارے۔

"جیو میرے شیر جیو! آپ جیسے شیر ہمارے ساتھ ہیں تو پھر یہ کتے کے پلے ہمارا کیا بگاڑ لیں گے جبرو بولا۔" اور ساتھ ہی اس نے مخالف فریق کو ایک ناروا گالی سے نوازا۔

اب صورت حال یوں تھی کہ پورا گاؤں ادھر امڈ آیا تھا۔ جس کے پاس اسلحہ نہ تھا۔ وہ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں اٹھائے ہوئے تھے۔

شمسو نامی آدمی دوسرے گاؤں میں رہتا تھا اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے گروہ سے تعلق تھا۔ جبرو اور شمسو کی خاندانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ صورت حال اب کسی اور ہی رنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اصل واقعات کا یہاں کسی کو علم نہ تھا اور ابھی تک تو میں بھی اس حوالے سے اندھیرے میں تھا۔ فائرنگ اور دھماکوں کے حوالے سے لوگ مختلف باتیں کر رہے تھے۔

جبرو کے گھر کے پاس ایک جم غفیر جمع ہو چکا تھا۔ ڈاکوؤں نے یہاں سے تتر بتر ہونے میں ہی بہتری جانی۔ اب ان کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ کا خیال تھا کہ ڈاکوؤں کا پیچھا کرنا چاہئے اور کچھ انہیں ایسا کرنے سے روک رہے تھے۔ اس دوران میں ان لوگوں کے درمیان سے کھسک گیا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے مین گیٹ کو ایک بار پھر تالا لگا دیا۔ میں کمرے میں پہنچا تو بجلی آ چکی تھی۔ ماں جی مصلے پر بیٹھی شاید دعا مانگ رہی تھیں۔ لڑکی میرے بیڈ پر لحاف اوڑھے بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ زخمی ٹانگ کو لحاف سے باہر نکال دے تاکہ میں اس کی مناسب مرہم پٹی کر سکوں میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"ویسے آپ کا کیا خیال ہے۔ گولی اندر ہے یا باہر نکل گئی تھی۔"

"گولی اندر نہیں ہے مگر زخم کافی گہرا ہے کیونکہ گولی گوشت کو پھاڑتے ہوئے نکل گئی تھی۔"

اتنے میں میری والدہ بھی دعا مانگ کر ہمارے پاس آ چکی تھیں۔

"کچھ پتہ چلا یہ لوگ کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے تو اس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"اماں جی! ہمیں کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ اگر یہ مناسب سمجھیں گی تو خود ہی بتا دیں گی۔ ورنہ ہمارا کام تو مظلوموں کی مدد کرنا ہے اور وہ ہم کرتے ہی رہیں گے۔"

"بیلے میں آج کیا مسئلہ ہے۔ ادھر اتنے دھماکے ہوئے ہیں۔"

"امی جان، ہو گا کوئی مسئلہ، ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔ آپ اس بارے میں نہ سوچیں۔ آپ کی طبیعت پہلے ہی خراب رہتی ہے۔ آپ زیادہ ٹینشن نہ لیا کریں۔"

اس کے بعد میں نے لڑکی کے زخم کی صورت حال دیکھی۔ خون تقریباً رک چکا تھا۔ مگر زخم کافی گہرا تھا۔ اور اسے یقیناً ٹانکوں کی ضرورت تھی۔ پٹی کھولنے پر دوبارہ خون کا بہاؤ شروع ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے زخم کو صاف کر کے دوبارہ پٹی باندھ دی۔ میں کوئی ڈاکٹر یا ڈسپنسر نہیں تھا۔ فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ بھی میں نے کالج دور میں لی تھی اور فرسٹ ایڈ کا بکس بھی اشد ضرورت کے تحت ہی رکھا ہوا تھا کیونکہ گاؤں میں کوئی ڈاکٹر یا ڈسپنسر موجود نہ تھا اور قریبی شہر پہنچتے پہنچتے بھی موٹر سائیکل پر ایک گھنٹا لگ جاتا تھا۔

اتنے میں ماں جی نے سلنڈر پر چائے پکالی تھی اور گھر کا پکا ہوا گجریلا بھی گرم کر کے لے آئی تھیں۔

"لو بیٹا گرم گرم چائے پیو۔ تمہیں سکون کی اشد ضرورت ہے۔ میرے خیال میں آپ کو لیٹ کر آرام کرنا چاہئے! اور آپ بھی بیٹا چائے لوناں آج ویسے بھی سردی کافی ہے۔"

ابھی امی یہ بات کر ہی رہی تھیں کہ بادل زور سے گرجے اور اس کے ساتھ ہی زورشور سے بارش شروع ہوگئی۔ وہ لوگ جو ڈاکوؤں کے پیچھے گئے ہوئے تھے۔ وہ واپس گھروں کو لوٹ رہے تھے کیونکہ گلی میں ان کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔

"لڑکی نے کہا۔" امی جان! کیا آپ کے پاس موبائل ہوگا۔"

"کیوں نہیں۔" امی نے مجھ سے کہا۔ "ارسلان بیٹا اسے اپنا موبائل دے دو۔"

"آپ کو کس سے بات کرنی ہے' بتانا پسند کریں گی آپ۔"

"مجھے ابو سے بات کرنی ہے۔"

"پلیز آپ فی الحال انہیں اپنی خیریت کی اطلاع دے دیں۔ باقی یہاں سے آپ کو نکالنے کی میں کوئی ترکیب سوچتا ہوں۔ کیونکہ ابھی مسئلہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ وہ لوگ جنہوں نے تمہیں اغوا کیا تھا اتنی آسانی سے تمہیں یہاں سے نکلنے نہ دیں گے۔"

"میں یہاں سے نکلنے کی تمام ذمہ داری آپ کو سونپتی ہوں۔ کیونکہ ایک تو مجھے یہاں کے راستوں کا علم نہیں۔ دوسرے مجھے یقین ہے کہ اس حوالے سے آپ جو بھی فیصلہ کریں گے میرے لیے بہتر ہی ہوگا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے یہ لیں موبائل اور اپنے ابو سے بات کرلیں۔"

لڑکی نے موبائل پر اپنے والد کا نمبر ملایا اور مختصر بات کی۔

"ابو میں بالکل خیریت سے ہوں آپ قطعاً فکر نہ کریں۔ میں یہاں سمجھیں اپنے ہی گھر میں ہوں۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ اگر یہ لوگ میری مدد نہ کرتے تو شاید میں اب آپ سے بات کرنے کے لیے زندہ بھی ہوتی یا نہیں' او کے جی بالکل آپ فکر نہ کریں۔ جی نہیں پولیس کو اطلاع کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ نہیں نہیں یہاں پر باہر زبردست بارش ہورہی ہے اور ایسے میں آپ کا یہاں آنا بہت مشکل ہے۔ جی میں بات کرواتی ہوں آپ کی۔"

"میرے ابو آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" لڑکی نے مجھ سے کہا۔

میں نے لڑکی سے موبائل لے کر کان سے لگایا اور کہا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام بیٹے! آپ نے جو نیکی کی ہے اس کا صلہ میں چاہوں بھی تو نہیں دے سکتا۔ اس کا صلہ آپ کو میرا سوہنا رب ہی دے گا۔"

"انکل آپ مجھے شرمسار کر رہے ہیں میں اس قابل کہاں کہ کسی کے ساتھ نیکی کرسکوں! بس یہ سب تو اس کی عطا ہے۔"

"آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہو' بہرحال یہ سب باتیں ہم کسی اور وقت کے لیے چھوڑتے ہیں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ اس وقت آپ کی درست لوکیشن کیا ہے۔"

"جی ضلع قائدآباد' رحیم نگر گاؤں میں اس وقت ہم موجود ہیں۔ آپ قائدآباد آجائیں اور موبائل پر مجھ سے رابطے میں رہیں۔ میں انشاء اللہ آپ کی بیٹی کے ساتھ وہاں موجود ہوں گا۔ لاہور سے آپ کا سفر پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے کا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم آپ سے پہلے وہاں موجود ہوں گے۔ چار بج چکے ہیں۔ انشاء اللہ چھ بجے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"بیٹے کوئی رسک لینے کی ضرورت نہیں' میں ابھی آئی جی پنجاب سے بات کرتا ہوں اور پوری پولیس فورس کے ساتھ وہاں پہنچتا ہوں۔"

"انکل پولیس میں کالی بھیڑوں کی کمی نہیں۔ آپ اور پولیس فورس کے آنے سے پہلے یہ لوگ ہمارا صفایا کردیں گے۔ آپ کی بیٹی نے جوان کے ساتھ کیا ہے۔ کم ہی کسی نے کیا ہوگا۔ میرے خیال کے مطابق اس وقت انتہائی رازداری سے یہاں سے نکلنے کی ضرورت ہے۔"

"جی بیٹا ٹھیک ہے' جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ ہم آپ کے قائدآباد پہنچنے سے پہلے وہاں موجود ہونگے۔"

"میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں میں ابھی قائدآباد کے لیے نکل رہا ہوں۔"

"اچھا میری ذکیہ بیٹی سے بات کروادو۔"

میں نے موبائل ان کی بیٹی کے حوالے کیا۔

"جی پاپا...... ہاں...... جی یہ سارا کیا دھرا کسی اور کا نہیں ہمارے اپنوں کا ہے۔ جی رب نواز خود وہاں موجود تھا۔ نہیں آپ جلد بازی میں کوئی بھی فیصلہ نہ کریں یہ لوگ آپ کے نہیں میرے مجرم ہیں۔ ہاں آپ کو پہلے سے بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے' خاص کر ان لوگوں سے۔ او کے بائے۔ جی آپ فکر نہ کریں۔ انشاءاللہ۔ اللہ حافظ۔"

☆☆☆☆☆☆☆

بتاتا چلوں کہ میرے والد صاحب انتہائی شریف النفس انسان تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ کافی زمینوں کے مالک ہونے کے باوجود ان کی نہ تو کسی سے دشمنی تھی اور نہ ہی وہ خود کسی سے جھگڑا کرنے کے عادی تھے' ہمارے گاؤں میں ان کی کافی عزت تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ غریبوں اور ناداروں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد میری والدہ اور میں خود بھی اس نیک کام کو جاری رکھنے کی حتی الوسع کوشش کرتے رہتے تھے۔

پانچ بجے جب میں نے فیکے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثر کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہا۔

"ارسلان بھائی! خیریت آج صبح صبح' مجھے بلالیا ہوتا آپ نے کیوں تکلیف کی؟"

"کام مجھے تھا رفیق بھائی! تو میں نے سوچا کہ خود ہی آپ سے مل لوں۔"

"ٹھہریئے' میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا اور اس نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر بلالیا۔

"جی ارسلان بھائی حکم کیجئے۔"

حکم نہیں' ایک درخواست ہے رفیق بھائی' آج سبزی منڈی میں سبزی لے کر جاؤ گے کیا؟"

"جی جاؤں گا ارسلان بھائی۔"

"ایک وعدہ کرو کہ آج جو کام تم میرے کہنے پر کرو گے۔ وہ زندگی بھر کسی کو نہیں بتاؤ گے۔"

"دو جوتے ماریئے' مجھے آپ کا وہ احسان کبھی نہیں بھولے گا۔ جب ایک دن میرا بچہ مرنے کے قریب تھا اور مجھے کہیں سے پیسے نہیں مل رہے تھے اور آپ نے نہ صرف پیسوں کا بندوبست کیا تھا بلکہ اپنی موٹر سائیکل پر مجھے اور میرے بچے کو شہر اسپتال تک چھوڑ کر آئے تھے۔"

"وہ میرا احسان نہیں فرض تھا اور پھر تم نے پیسے واپس بھی تو کردیئے تھے۔ ایسی باتوں کو میرے پاس مت دہرایا کرو۔ تمہارا بیٹا میرا بھی تو بیٹا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کا مسئلہ بھی میرا مسئلہ ہے۔ بتائیے ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔"

"اچھا.....اچھا ٹھیک ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ میں نے رفیق کو اعتماد میں لے کر اس کی گدھا گاڑی پر ذکیہ کو گدے اور رضائی میں لپیٹ کر سبزیوں کے درمیان لٹا دیا۔ البتہ میں نے اس کی سانس کی آمدورفت کے لیے تھوڑی سی درز رکھ چھوڑی تھی۔ رفیق نے ریڑھا نکالا تو اس کے بعد میں گھر واپس آیا۔ اور موٹر سائیکل پر والدہ کو بٹھایا اور میں بھی ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میری والدہ پچھلے کچھ عرصہ سے بیمار رہتی تھیں اور پورے گاؤں والوں کو علم تھا کہ میں انہیں علاج کے سلسلے میں اکثر شہر لے جاتا رہتا تھا۔ بارش اب مکمل طور پر رک چکی تھی۔ مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا۔

رحیم نگر سے کوٹلی تک کا سفر ہمیں کچی سڑک پر ہی طے کرنا تھا۔ کوٹلی جا کر مجھے اپنے دوست کامران کے گھر رکنا تھا۔ اور وہیں پہ فیکا بھی گدھا گاڑی سمیت آ جاتا اور وہاں مجھے والدہ کو چھوڑ کر ذکیہ کو لے کر شہر جانا تھا۔ اس کچی سڑک کے اردگرد خودرو درختوں کی بھرمار تھی اور کہیں کہیں سرکنڈے بھی کافی تعداد میں اگے ہوئے تھے۔ کوٹلی تک کا یہ راستہ بالکل اجاڑ اور ویران تھا۔ صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ میرے پاس ون ٹو فائیو موٹر سائیکل تھا۔

ابھی گاؤں سے ہم ایک کلومیٹر دوری پر ہی آئے تھے کہ میں نے فیکے کی گدھا گاڑی کو راستے میں رکا ہوا دیکھا۔ میں نے گدھا گاڑی کے قریب جا کے بریک ماری۔ رات شاید ہوا اور بارش کے زور سے کوئی درخت سڑک پر گرا پڑا تھا۔ جس کی وجہ سے راستہ بلاک ہو گیا تھا۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ راستہ جان بوجھ کر بند کیا گیا تھا۔ میری چھٹی حس کا ادراک صحیح تھا۔ موت کے ہرکارے راستے میں گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

مگر یہ کیا..... سامنے تو پولیس جیپ کھڑی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

جیپ سے سپاہی اتر کر آ رہے تھے۔ رفیق بھی شاید ابھی پہنچا ہی تھا اور حیران پریشان نظروں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ کسی نے جیپ کی ہیڈ لائٹس آن کر دی تھیں۔ ایک بندہ جو رینک کے اعتبار سے اے ایس آئی نظر آ رہا تھا اس نے فیکے سے پوچھا۔

"اوئے اتنی صبح صبح کہاں جا رہے ہو اور یہ گدھا گاڑی پر کیا لاد رکھا ہے۔"

فیکے نے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ فیکے نے کہا۔

"حضور! سبزی ہے۔ منڈی میں بیچنے جا رہا ہوں۔"

"اوئے ان کی گدھا گاڑی اچھی طرح چیک کرو، مجھے تو یہ بندہ مشکوک سا لگتا ہے کہیں سبزی کے بجائے کوئی اور چیز تو نہیں ہے۔" اس نے اپنے پاس موجود ایک سپاہی سے کہا۔

ایک سپاہی تیز رفتاری سے گدھا گاڑی کو چیک کرنے کے لیے بڑھا۔

ہم نے ادھر اُدھر سبزیاں رکھنے کے بعد درمیان میں خالی جگہ پر ذکیہ کو لٹا کر اوپر ایک تختہ رکھ کے پھر سبزیوں کے بورے رکھ دیئے تھے۔ اور اوپر ترپال ڈالا ہوا تھا۔ امید تو نہیں تھی کہ سپاہی اس وقت ہر چیز اٹھا کر گدھا گاڑی چیک کرے گا اگر وہ چیک کر لیتا تو ہم بڑی مصیبت میں پڑ سکتے تھے خیر یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ اتنے میں اس نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم اتنی صبح صبح کہاں جا رہے ہو اور تمہارے ساتھ یہ کون ہے میں نے کہا۔

"سر یہ میری والدہ ہیں رات سے ان کی طبیعت کافی

خراب ہے میں انہیں لے کر اسپتال جا رہا ہوں" اس نے بیٹری کی لائٹ جلا کر میری والدہ کو دیکھا اور کہا۔

"کیا مسئلہ ہے انہیں؟"

"دل کا عارضہ ہے' آدھی رات سے درد ہو رہا ہے۔ میں تو رات کی مجبوری کی وجہ سے صبح کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی آپ ہمیں جانے دیں۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔"

"ہم آپ لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی چیکنگ کر رہے ہیں۔ سنا ہے رات جب بیلے میں دھماکے ہو رہے تھے تو یہاں دو گروہوں میں زبردست فائرنگ ہوئی ہے۔"

"جب دھماکے ہوئے تھے۔ اس وقت فائرنگ کی آوازیں تو میں نے بھی سنی تھیں اور دھماکوں کے تھوڑی دیر بعد فائرنگ بھی ختم ہو گئی تھی۔ مگر میں والدہ کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے باہر ہی نہیں جا سکا۔"

اتنے میں ایک سپاہی کی حیرت بھری آواز ابھری' سر جی ادھر گدھا گاڑی میں سبزیوں کے درمیان کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔"

"اوئے چیک کرو سب لوگ ذرا تیزی سے۔" اے ایس آئی نے کہا۔

پولیس موبائل وین میں سول کپڑوں میں ملبوس تین چار بندے موجود تھے وہ بھی چھلانگیں لگا کر اترے اور گدھا گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہم نے سبزیوں کو ترتیب سے رکھنے کے بعد مضبوطی سے موٹے رسے سے باندھ دیا تھا۔ وہ لوگ اب رسے کو تیزی سے کھول رہے تھے۔ فیکا جو تھوڑی دور کھڑا تھا۔ اسے دو تین سپاہیوں نے پکڑ کر نیچے گرا لیا تھا۔ اور اسے بے دریغ مار رہے تھے۔ وہ ایک ہی بات کہے جا رہا تھا۔ سر جی میری بات سن لیں' میری بات سن لیں۔ مگر کوئی بھی اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ سول کپڑوں میں ملبوس ایک بندے نے کہا

"یہی ہے سالا ہیرو کی اولاد' اسے ذرا اچھے طریقے سے پھینٹی لگاؤ۔ ابھی سارا کچھ اگل دے گا۔"

رفیق بے چارہ پٹ رہا تھا۔ اور کہے جا رہا تھا کہ اس کی بات سن لیں۔ مگر اسے مارنے والے جانے کس چیز کا بدلہ لے رہے تھے۔ ایک بندہ اس کی گردن پر سوار تھا۔ اور اس نے فیکے کے ہاتھ اس کی چادر سے ہی اس کی پشت پر باندھ دیئے تھے۔

میں نے اے ایس آئی سے کہا۔

"سر! یہ شریف آدمی ہے میرے ہی گاؤں کا ہے۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ کم از کم اس کی بات تو سن لیں سر! سنیں تو سہی کہ وہ کہتا کیا ہے۔"

"اوئے تو ہے کون ہماری باتوں میں دخل دینے والا! تو اپنی بک بک بند کر اور ذرا دور ہو کے کھڑا ہو جا' ورنہ تمہیں بھی اس کے ساتھ شامل کر کے ایسا کیس بناؤں گا کہ ساری زندگی جیل میں سڑتے رہو گے۔"

"ملزم پکڑا گیا سر۔" اتنے میں ایک سپاہی نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ سپاہی گدھا گاڑی کے اوپر ہی کھڑا تھا۔ اور اس نے دو تین تھیلے ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے اور تھیلوں میں سے بلیوں کی میاؤں میاؤں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سبھی لوگ گدھا گاڑی کے پاس جمع ہو چکے تھے اور ہنس رہے تھے۔ ایک سپاہی نے کہا۔

"سر جی میں نے پہلے بھی کئی بار آپ سے کہا ہے۔ کہ آپ اسلم کی بات پر دھیان نہ دیا کریں۔ یہ ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دیکھ لیا آپ نے کھودا پہاڑ نکلا چوہا اور وہ بھی مرا ہوا۔"

اسلم اس سپاہی کا نام تھا۔ جس نے کہا تھا کہ سبزیوں کے درمیان کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ اب وہ بے چارہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ فیکے کی خاصی مرمت ہو

چکی تھی اور وہ بے چارہ اپنی جگہ پر پڑا کراہ رہا تھا۔
اے ایس آئی بھی اب خجل سا ہو رہا تھا اس نے کہا۔
"اوئے گدھا گاڑی کے کوچوان کو ادھر لاؤ۔" فیکا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق لنگڑاتا ہوا آیا۔
"میں نے تو بڑا کہا سر کہ آپ میری بات سن لیں مگر آپ نے میری بات ہی نہیں سنی۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔
"اوئے یہ بلیاں کدھر لے کر جا رہے ہو۔" اے ایس آئی نے کہا۔
"جناب ان بلیوں نے میرا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ گھر کی تمام چیزیں خراب کر دیتی ہیں۔ جہاں تھوڑی سی جگہ دیکھتی ہیں۔ گند کر دیتی ہیں۔ آج میں انہیں دریا کے اس پار بیلے میں جا کر چھوڑنا چاہتا تھا۔ تا کہ مجھے ان سے چھٹکارا نصیب ہو جائے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ان کی وجہ سے آج میری اتنی پھینٹی لگے گی۔ آپ کے بندوں نے تو مار مار کر میرا کچومر نکال دیا ہے سر جی۔"
"اوئے زیادہ بک بک نہ کر۔ اپنی سبزیاں لادو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ اور سب سے پہلے اس درخت کو راستے سے ہٹاؤ۔ ہمیں گاؤں جا کر رات والے واقعے کی تفتیش بھی کرنا ہے اوئے باؤ، تم بھی ذرا اس کی مدد کر دو۔ پھر چلے جانا شہر، اور ہاں خبردار! جو کسی نے کسی سے ان باتوں کا ذکر کیا۔ جو ابھی ہوئی ہیں۔"
"ٹھیک ہے سر جی! ہم کسی سے بھی ان باتوں کا ذکر نہیں کریں گے۔" فیکے نے عاجزی سے کہا۔
"تم میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو چلو بیٹھو گاڑی میں۔" اے ایس آئی نے سپاہیوں سے کہا۔
میں نے فیکے کے ساتھ مل کر درخت کو راستے سے ہٹایا اور اپنی موٹر سائیکل بھی ایک سائیڈ پر کر دی اتنے میں پولیس والوں کی گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ انہوں نے زن سے گاڑی نکالی اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔
فیکا جو کہ کافی سخت جان تھا۔ سڑک پہ ہی سجدے میں گرا رو رہا تھا اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ میں نے فیکے کو اٹھایا اور گلے سے لگا لیا۔
"شاباش میرے شیر، آج تو تو نے میرا دل جیت لیا۔ ویسے یہ اسکیم بھی تمہاری ہی تھی اور تم ایسی اوٹ پٹانگ اسکیمیں بناؤ گے تو مار تو پڑے گی ناں۔"
یہ تینوں بلیاں فیکے کی پالتو بلیاں تھیں۔ اور اس سے بہت زیادہ مانوس تھیں۔ ہوا یوں تھا۔ کہ یہ ڈرامہ کرنے کی ساری ذمہ داری ذکیہ پر تھی۔ تینوں بلیاں خود فیکے نے تین مختلف تھیلوں میں ڈال کر ذکیہ کے پاس موٹی رضائی میں پہنچا دی تھیں۔ اس وجہ سے بلیوں کی آواز باہر نہیں نکل رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ذکیہ خود ان کے تھیلوں کے اوپر سے بلیوں پر ہاتھ پھیرتی آئی تھی۔ جس وجہ سے وہ پر سکون تھیں۔ اس مقصد کے لیے ایک خلا رکھا گیا تھا۔ دھنیا کا ایک چھوٹا گٹو خلا میں رکھا ہوا تھا۔ مناسب وقت پہ ذکیہ کو صرف یہ کرنا پڑا کہ دھنیے کا گٹو اپنی طرف تختے کے اندر کھینچ لیا۔ اور بلیوں کا تھیلا خلا میں رکھ دیا۔ اس سے بلیوں نے جونہی اپنے آپ کو سردی میں محسوس کیا اور پر حرارت ہاتھوں سے جدا پایا۔ تو انہوں نے شور ڈال دیا۔ ویسے پہلی حرکت خود ذکیہ نے کی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ لڑکی بھی اپنی ذات میں انوکھی تھی۔
ہم نے سبزی لوڈ کر لی تھی اور ذکیہ کی خیر خیریت بھی معلوم کر لی تھی۔ اب ہم یہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔ کوٹلی پہنچ کر میں نے والدہ کو کامران کے گھر

چھوڑا۔ یہاں سے کامران میری والدہ کو آٹھ بجے کے قریب شہر لے جاتا اور شہر سے میری واپسی اکٹھے ہوتی۔ فیکا پہنچا تو اس نے اپنی گدھا گاڑی حویلی کے اندر روکی اور ہم نے ذکیہ کو سبزیوں کے تھیلوں سے نکالا اور دوبارہ سبزیوں کو ترتیب سے رکھ کر فیکے کو روانہ کر دیا۔ اب ذکیہ کو باقی سفر میرے ساتھ طے کرنا تھا۔
میں نے ذکیہ کو موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھایا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ موٹر سائیکل پر ہی میں نے اعظم ملاح کو کال کی۔ اعظم جسے لوگ اعظو ملاح کے نام سے جانتے تھے۔ کال ملنے پر میں نے کہا۔
"ہیلو اعظم، ارسلان بول رہا ہوں۔"
"جی ارسلان بھائی۔ خیریت، آج ہم غریبوں کی یاد کیسے آ گئی آپ کو۔"
"بس یار! ایک کام پڑ گیا ہے آپ سے۔"
"کیا کام ہے بادشاہو، آپ حکم کرو آپ کے لیے ہماری جان بھی حاضر ہے۔"
"مہربانی اعظم بھائی، بات یہ ہے کہ ہمیں دریا پار کرنا ہے۔ ہمارے پاس ایک موٹر سائیکل بھی ہے اور ایک مہمان بھی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہم پتن سے دریا پار نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ یہ انتہائی رازداری کا مسئلہ ہے۔"
"میں سمجھ گیا ارسلان بھائی، آپ آؤ، ہم اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیتے ہیں۔"
"میں اس وقت پتن پر آپ کے پاس نہیں آ سکتا یہ انتہائی اہم اور خفیہ مسئلہ ہے۔"
"ٹھیک ہے پھر آپ اس جھگی میں پہنچیں۔ جس میں ہم ایک دو دفعہ پہلے بھی ملے تھے۔ میں بلوچوں کے ڈیرے تک پہنچ چکا ہوں۔ آپ ذرا جلدی آئیں۔"
"ابھی سات بجے ہیں ارسلان بھائی، میں انشاء اللہ جلد ہی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ آپ وہیں پر میرا انتظار کریں۔ اللہ حافظ۔"
"اللہ حافظ۔"
میں نے موٹر سائیکل کی رفتار نارمل ہی رکھی تھی۔ کیونکہ میرے پیچھے ذکیہ بیٹھی ہوئی تھی اور میری تیزی سے اس کی ٹانگ کے زخم سے خون جاری ہو سکتا تھا اور میں سوائے مجبوری کے تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب بیلے کا علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ کچے راستے پر کیچڑ ہونے کی وجہ سے بھی موٹر سائیکل کی رفتار کم تھی۔ ذکیہ نے مکمل طور پر برقع پہنا ہوا تھا۔ رات ہی میری والدہ نے میرے کہنے پر اسے سب سے پہلے میرا ایک سوٹ پہنا کر اوپر اپنا ایک سوٹ پہنا دیا تھا۔ گرم سویٹر اور گرم شال بھی اس کے ہمراہ کر دی تھی۔ اور گرم پانی سے اس کا منہ ہاتھ دھلوا کر اس کا ہلکا سا میک اپ بھی کر دیا تھا۔ ناشتہ کروانے کے بعد میں نے اسے پین کلر گولیاں بھی کھلا دی تھیں۔ اس لیے وہ اب کافی پر سکون نظر آ رہی تھی۔
مذکورہ جھگی جس تک ہمیں پہنچنا تھا۔ وہ میرے ایک دوست نے بنائی ہوئی تھی۔ جو کہ گرمیوں کے موسم میں تربوزوں کی رکھوالی کے کام آتی تھی۔ آجکل یہ جھگی بالکل ویران پڑی ہوئی تھی۔
کچی سڑک بھی کی ختم ہو چکی تھی۔ میں ناہموار راستوں پر موٹر سائیکل چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہ تھا۔ بس اندازے سے میں منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اور ذکیہ دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ ذکیہ نے رات ہی مختصرا اپنے اغوا اور فرار کی کہانی بتا دی تھی۔
زیادہ مسئلہ رات ہونے والے پے در پے دھماکوں کی وجہ سے تھا۔ اور ان دھماکوں کی وجہ سے میڈیا اور اعلیٰ حکومتی اداروں کے لوگ ادھر متوجہ ہو چکے تھے۔ اور جانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا۔ ہمارے گاؤں میں

بھی اب انکوائری شروع ہوسکتی تھی۔ کیونکہ ان لوگوں کو رپورٹ مل چکی ہوگی کہ اس ساری کارروائی کی ذمہ دار لڑکی کو آخری بار ہمارے گاؤں میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

"کن سوچوں میں گم ہوگئے آپ ارسلان۔" ذکیہ شاید میری خاموشی سے تنگ آچکی تھی۔

"جب شیر کے منہ سے نوالہ اس طرح سے چھینا ہو کہ شیر کو بھی پتہ نہ چلے تو سوچنا تو پڑتا ہے۔"

"آپ ایک اجنبی لڑکی کے لیے اتنا کچھ کیوں کر رہے ہیں۔"

"مظلوم اور ضرورت مند میرے لیے اجنبی نہیں اپنے ہوتے ہیں۔"

"تو کیا اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ میں آپ کی اپنی ہوں۔"

"جی میں نے یہ تو نہیں کہا مگر......"

ابھی یہ بات میری زبان پر ہی تھی کہ مذکورہ جھگی آگئی۔ اور ہماری بات درمیان میں ہی رہ گئی میں نے ذکیہ کو موٹر سائیکل سے اترنے میں مدد دی اور اسے جھگی تک پہنچایا۔ وہاں ایک جھلنگا سی چارپائی موجود تھی۔

"آئندہ جانے حالات کیا ہوں اس لیے اپنے زخم کی پٹی کو ایک بار ڈھیلی کرکے تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ باندھ لیں تاکہ ٹانگ کے نچلے حصے میں بھی خون پہنچ سکے۔ کیونکہ زیادہ دیر خون بند رکھنے سے ٹانگ کا نیچے والا حصہ بیکار بھی ہوسکتا تھا۔" اس کے بعد میں نے موٹر سائیکل کو بھی جھگی میں کھڑا کیا۔ اور خود باہر نکل آیا۔

اعظم ملاح ابھی تک نہیں پہنچا تھا میں اس کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ میں نے دو بندوں کو دریا کی طرف سے آتے دیکھا ان لوگوں نے دھوتیاں باندھ رکھی تھیں۔ ایک بندے کے ہاتھ میں حقی تھی اور وہ اس کے چھوٹے چھوٹے کش لگا رہا تھا۔ چہرے مہرے سے تو یہ لوگ چرواہے نظر آتے تھے۔ مگر موجودہ حالات میں کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔ میرے پاس ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کا مناسب بندوبست موجود تھا۔ وہ بندے بھی مجھے دیکھ چکے تھے۔ ادھر ہی آرہے تھے۔ اب اِدھر اُدھر ہونے کا مطلب خود کو مشکوک بنانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ میرے قریب آئے تو انہوں نے مجھے سلام کیا اور کہا۔

"کہاں جانا ہے بھائی اور ادھر کیوں کھڑے ہو۔"

"یہ زمینیں ظہور بلوچ کی ہیں اور کسی نے مجھے کہا تھا کہ وہ انہیں ٹھیکے پر دینا چاہتا ہے میں ذرا ان زمینوں کا جائزہ لے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اتنی صبح صبح! اتنی سردی میں، تھوڑی دھوپ نکلتی تو آجاتے۔"

"رات کوٹلی میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور میں نے اپنے گھر بھی جانا تھا تو میں نے سوچا کہ چلو زمینیں دیکھتا ہی چلوں۔"

"اچھا تو آپ ٹھیکے دار ہو، ہم ادھر پاس ہی رہتے ہیں۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی جی، جب میں یہاں آؤں گا تو ضرور آپ لوگوں کی مجھے ضرورت پڑے گی۔"

"اچھا جی اللہ حافظ۔" یہ کہہ کر وہ لوگ اپنی راہ کو ہو لیے۔ خدا کا شکر ہے کہ جھگی چاروں طرف سے سرکنڈوں کی سرکیوں سے بند تھی اور ذکیہ اس کے اندر ہونے کی وجہ سے انہیں نظر نہیں آئی ورنہ وہ لوگ نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچتے۔ ابھی ان لوگوں کو گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ سرکنڈوں کے درمیان سے اعظم ملاح آتا ہو نظر آیا، آتے ہی وہ مجھ سے بغل گیر ہوگیا اور خیریت دریافت کی۔

"ارسلان بھائی آپ کے ساتھ اور کون ہے جسے

دریا پار کرنا ہے۔" اس نے کہا۔

"اعظم تمہیں ان باتوں پر اپنا دماغ کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ضرورت ہے نا میرے دوست ضرورت ہے، آپ کو پتہ نہیں صبح صبح ایس ایچ او اختر بھروانہ کی کال آئی تھی کہ اگر کوئی ایک ٹانگ سے زخمی لڑکی اور بندہ چن سے پار جانا چاہے تو انہیں کسی طریقے سے روک کر فوری طور پر اسے اطلاع کرنی ہے۔ یہ لڑکی اکیلی بھی ہوسکتی ہے اور اس کے ساتھ کوئی بندہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا آرڈر ہے کہ انہیں کسی بھی حال میں دریا سے پار نہیں جانا چاہیے۔"

"اعظم میرے دوست، میرے ساتھ وہی لڑکی ہے۔ جس کے پیچھے یہ لوگ پاگل ہوچکے ہیں۔ مجھے بتاؤ تم میرا ساتھ دیتے ہو یا نہیں۔"

"کیوں نہیں میری جان، میں نے کب انکار کیا ہے۔ کیا لڑکی پیدل چل سکے گی۔"

"یہ ناممکن تو نہیں اس کی ٹانگ میں کافی بڑا زخم ہے اور اگر یہ کھل گیا تو بڑا مسئلہ بن جائے گا۔"

"ارسلان بھائی، وہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور اگر ایس ایچ او بھی ان کے ساتھ مل گیا ہے تو پھر ان کی طاقت کا اندازہ تو آپ نے لگا ہی لیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے حالات میں کوئی خطرہ مول لیا جائے۔"

"پھر تم ہی بتاؤ کہ کیا کرنا چاہئے؟"

"میرے خیال میں آپ ایسا کریں کہ آپ لڑکی کو کندھوں پر اٹھالیں اور موٹر سائیکل کو میں دھکا لگا کر لے جاتا ہوں بس تھوڑی ہی دور تک چلنا ہے۔ وہاں میں نے ایک چھوٹی کشتی ایسے کاموں کے لیے چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو ہم جلد ہی دوسرے کنارے پر ہوں گے جلدی کریں ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنا چاہئے۔"

ذکیہ بھی جھگی میں بیٹھی یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے مجھے آواز دی اور کہا۔

"ارسلان، تمہارا دوست صحیح کہہ رہا ہے۔ موٹر سائیکل کی آواز سے وہ لوگ ہوشیار ہوجائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ اعظم کی بات مان لی جائے۔"

"اعظم بھائی، اللہ کا نام لے کر آپ موٹر سائیکل نکالیں۔ ہم آپ کے پیچھے ہی آرہے ہیں۔ ارسلان تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ رات تو تم بڑے ہیرو بنے ہوئے تھے اور مجھے اٹھا کر یوں بھاگ رہے تھے۔ جیسے بھاگنے کا عالمی مقابلہ چل رہا ہو؟ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" ذکیہ نے میرے پیچھے کھڑے اعظم کو دیکھا تو اسے سلام کیا اور کہا۔

"رات کی بات اور تھی رات جب میں نے تمہیں اٹھایا تھا تو مجھے معلوم نہ تھا کہ جسے میں اٹھا کر بھاگنے والا ہوں وہ صنف نازک ہے اور پھر آپ کو رات کی سچویشن کا بھی پتہ ہے کہ کیا تھی ایسے حالات میں اگر مجھے پتہ ہوتا بھی تو میرے پاس کوئی دوسرا آپشن بھی تو نہیں تھا۔"

"اب بھی آپ کے پاس دوسرا کوئی آپشن نہیں ہے، آؤ آؤ جلدی کرو۔"

چاروناچار مجھے ذکیہ کو ایک بار پھر کندھوں پر اٹھانا پڑا۔ مگر اب کی بار ذکیہ کے کندھوں پر سوار ہونے سے میں کافی خجالت محسوس کر رہا تھا۔ مگر ذکیہ کے رویے سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ اس سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ ہم جلد ہی کشتی کے پاس پہنچ گئے۔ اعظم نے ایک جگہ درختوں کے جھنڈ میں موٹر سائیکل کھڑی کی اور درختوں میں ہی گھاس پھونس کے نیچے سے اس نے ایک چھوٹی سی کشتی برآمد کی اور جلدی سے موٹر سائیکل کشتی میں رکھ دی۔ ہم دونوں نے مل کر کشتی کو دھکیلا اور درختوں کے جھنڈ سے باہر نکالا۔ دریا کے

کنارے سے لگا دیا۔ اعظم ملاح نے کشتی کا رسہ ایک قریبی درخت سے باندھ دیا۔ میں جلدی سے پیچھے مڑا اور ذکیہ کو ایک بار پھر کندھوں پر لادا اور لا کر کشتی میں لٹا دیا۔ اعظم ملاح نے آسمان کی طرف منہ کر کے کوئی دعا مانگی۔ اللہ کا نام لے کر کشتی کا رسہ کھول کر جلدی سے کشتی میں سوار ہو گیا۔ دریا کا پانی کافی پرسکون تھا۔ اور ہم جلد ہی دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

اعظم نے کشتی کنارے پر لگا کر ایک بار پھر رسے کی مدد سے قریبی درخت سے باندھ دی اور موٹر سائیکل نکالا۔ اتنے میں، میں بھی ذکیہ کو کندھوں پر اٹھا چکا تھا۔ ایک بار پھر ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا پڑا۔

"بس ارسلان بھائی! اب اللہ کا نام لے کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرو اور جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔" جب ہم مناسب فاصلے پر پہنچے تو اعظم نے کہا۔

"اعظم بھائی! آپ دو منٹ رکیں، ہمیں موٹر سائیکل پر سوار کروا کے چلے جانا۔" میں نے ذکیہ کو کندھوں سے اتارا اور اعظم سے کہا۔

اس کے بعد میں نے ذکیہ سے کہا۔

"ذکیہ اب جبکہ ساری باتیں کھل چکی ہیں وہ لوگ کتے کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ میرے خیال میں اب پلان نمبر دو پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ آپ جلدی سے اپنا برقع اور اوپر والے کپڑے اتار کر مجھے دے دیں اور نیچے جو تم نے میرا سوٹ پہنا ہوا ہے وہی ٹھیک ہے اور سر پر ٹوپی لے کر مفلر سے اپنا چہرہ چھپا لیں۔ اوپر سے میری چادر کی بکل مار لیں۔"

ذکیہ نے جلدی سے میرے کہنے پر عمل کیا۔ اس کے لیے مجھے بھی اس کی تھوڑی سی مدد کرنا پڑی۔ کیونکہ اس کی ٹانگ بھی تھوڑا سا مسئلہ کر رہی تھی۔ اس کے اتارے ہوئے کپڑے میں نے ایک شاپر میں ڈالے۔ جو کہ میں گھر سے اپنی جیب میں ڈال کر لایا تھا۔ میں نے کپڑوں کا شاپر موٹر سائیکل کے اگلے اسٹینڈ پر لٹکایا۔ ایک ایک پسٹل ہم دونوں کے پاس موجود تھا اور اس کے کچھ فالتو راؤنڈز اور لوڈڈ میگزین بھی ہمارے پاس جیبوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ بھاری اسلحہ ساتھ رکھنا مناسب نہ تھا۔ ویسے بھی مجھے اپنی قوت بازو پر بھروسا تھا۔ ذکیہ کی تو خیر بات ہی الگ تھی۔ جس لڑکی نے نامی گرامی ڈاکوؤں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے وہ کوئی عام لڑکی تو ہرگز نہ تھی۔ وہ وقت پڑنے پر یقیناً دشمنوں کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے موٹر سائیکل اعظم ملاح کو پکڑایا اور ذکیہ کو سہارا دے کر موٹر سائیکل پر سوار کروایا اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔

"او کے اعظم بھائی آپ کا بہت شکریہ زندگی نے وفا کی تو انشاءاللہ جلد ملیں گے۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ ارسلان بھائی۔" اعظم ملاح واپس چلا گیا۔

میں نے اللہ کا نام لے کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔ صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔ سورج کو مشرق سے طلوع ہوئے پورا ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ اگر کوئی مسئلہ نہ بنتا تو انشاءاللہ ہم آدھ گھنٹے کے بعد شہر میں داخل ہو چکے ہوتے۔ ذکیہ نے مجھے پیچھے سے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ کیونکہ یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہ تھا۔ کہیں کہیں گھاس چرنے والے جانوروں کی آمدورفت کی وجہ سے راستہ بنا ہوا تھا اور کہیں خود بنانا پڑتا تھا۔ بہر حال ہمارے نیچے ون ٹو فائیو موٹر سائیکل تھی جو کہ ایسے راستوں پر چلنے کے لیے بہترین سواری تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم کسی بھی مصیبت کا شکار ہوئے بغیر پکی سڑک تک پہنچ گئے۔ اب صورت حال یہ تھی

کہ کوئی ہمیں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ دو منچلے موٹر سائیکل کی سواری کا مزہ لے رہے ہوں۔ میں نے پکی سڑک پر پہنچتے ہی ذکیہ سے کہا کہ وہ مجھے مضبوطی سے تھام لے اور پھر ون ٹو فائیو ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

ہم سیدھے بریگیڈیئر انکل زوہیب کے گھر پہنچے گیٹ کیپر نے ہماری شناخت کرنے اور گھر سے تصدیق کرنے کے بعد ہمیں گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی بریگیڈیئر انکل زوہیب سے آج صبح ہی میری بات ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ایک نرس، ایمبولینس اور اسٹریچر بھی موجود تھا۔ ذکیہ کو جلدی سے اسٹریچر پر ڈال کر اندر کمرے میں لے جایا گیا۔ نرس اور ڈاکٹر نے مل کر ذکیہ کی زخمی ٹانگ کو ٹانکے لگا کر پٹی باندھ دی۔ موٹر سائیکل کی تیز رفتاری کی وجہ سے زخم تقریباً کھل چکا تھا اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔ مگر ہم بروقت پہنچ گئے تھے۔

بریگیڈیئر زوہیب جو کہ میرے والد صاحب کے کلاس فیلو تھے اور میرے ابو کے بہترین دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ میرا سگے بیٹوں کی طرح خیال رکھتے تھے۔ وہ کبھی کبھار ہمارے گھر بھی آتے رہتے تھے۔ میری والدہ کو وہ سگی بہنوں کی طرح سمجھتے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی مجھے کئی معاملات میں آسانی رہتی تھی۔ ورنہ جو لوگ ذکیہ کے پیچھے تھے۔ میں اکیلا ان کا مقابلہ کہاں کر سکتا تھا۔ اب کسی کو ذکیہ کے ٹھکانے کا پتہ چل بھی جاتا تو وہ ذکیہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

یہاں سے میں نے ذکیہ کے ابو کو کال کی اور انہیں موجودہ صورت حال کے بارے میں بتایا اور اسے انکل زوہیب کے گھر کا پتہ بھی بتا دیا اور میں ذکیہ کو بتائے بغیر ہی انکل زوہیب سے اجازت لے کر اسپتال چلا گیا۔ میری والدہ اور کامران وہاں موجود تھے۔ وہ چیک اپ کروا کے دوائیاں لے چکے تھے اور میں اپنی والدہ اور کامران کے ساتھ واپس گھر لوٹ آیا۔

☆☆☆☆☆☆

میرے وہاں سے آنے کے بعد ذکیہ کے والد بریگیڈیئر انکل زوہیب سے ملے اور انکل زوہیب نے ان کی بیٹی کو ان کے حوالے کر دیا۔ باپ بیٹی مل کر بہت خوش ہوئے مگر جب انہوں نے میرے بارے میں پوچھا تو انکل زوہیب نے کہا کہ وہ خبطی سا لڑکا ہے اور اس سے ابھی ملنا نامناسب ہے۔ آپ کے لیے بہتر تو یہی ہو گا کہ آپ اسے بھول جائیں۔ اس سے کوئی رابطہ بھی نہ کریں کیونکہ اس سے اس کے لیے کافی مسائل پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆

میں لاہور اپنے گھر پہنچ چکی تھی۔ میں اپنے محسن ارسلان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر جب میں ابھی قائد آباد میں تھی تو مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ شخص مجھے انکل زوہیب کے گھر چھوڑتے ہی نکل گیا تھا۔ مگر کچھ باتیں جو انکل زوہیب نے ارسلان کے حوالے سے بتائیں وہ میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ارسلان خبطی اور دیوانہ ہے جب گھر میں ہوتا ہے تو سارا دن یا تو دریا پر پایا جاتا ہے یا پھر سائیں ٹوپے شاہ کے مزار پر، چھوٹے بچوں کی ٹولی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ کبھی دریا کے کنارے پر دیگیں پک رہی ہوتی ہیں تو کبھی سائیں ٹوپے شاہ کے مزار پر جو کچھ بھی اسے ماں دیتی ہے یا زمینوں کی آمدنی اس کے ہاتھ لگتی ہے۔ وہ ایسے ہی لوگوں پر لٹا دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ مہینوں گھر سے غائب رہتا ہے۔ اس کی ماں بے چاری کڑاتی رہتی ہے۔ اللہ بخشے اس کا والد میٹرک تک میرا کلاس فیلو تھا اور ہم بہترین دوست تھے۔

دس مربعے ان کی آبائی زمین ہے جو کہ سونا اگلتی

ہے۔اس کے والد کی وفات کے بعد اس کی ماں نے ہی اسے پالا پوسا اور جوان کیا۔ جونہی اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسے دورے پڑنے لگے۔ اس کی والدہ نے کئی پیروں فقیروں کو بھی دکھایا۔ میں نے بھی کئی ڈاکٹروں اور ماہر نفسیات کو چیک کروایا۔ مگر اس سب کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ماشاءاللہ صحت بھی اچھی تھی۔ کھاتا پیتا بھی صحیح تھا۔ مگر کبھی کبھی بالکل پاگلوں اور دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا تھا اور پھر ایک دن وہ غائب ہو گیا۔ مگر غائب ہونے سے پہلے وہ ماں سے ملا۔ پھر بہکی بہکی باتیں کرنے لگا اور اچانک ماں کی گود سے یہ کہتے ہوئے نکل بھاگا کہ ماں عرفان مجھے بلا رہا ہے۔ میں اس سے مل کر آتا ہوں اور پھر پورے پانچ سال ماں بے چاری پاگلوں کی طرح اس کی تلاش میں پھرتی رہی۔ مگر وہ نہ ملا۔ آخر کار پانچ سالوں کے بعد ایک دن وہ خود ہی سبز چولا پہنے ہاتھ میں کشکول لیے گلے میں کئی قسم کی مالائیں ڈالے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا صدا لگا رہا تھا۔ ماں جب آٹے کا برتن بھر کر خیرات دینے آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سامنے اس کا اپنا بیٹا کھڑا تھا۔

ماں نے اسے پورے پانچ سالوں کے بعد دیکھا تھا۔ اس عرصے میں اس کا حلیہ کافی تبدیل ہو چکا تھا۔ اور کچھ اس کا گیٹ اپ بھی ایسا تھا۔ کہ ماں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا بیٹا ایسا روپ دھار چکا ہو گا مگر ماں تو ماں ہوتی ہے۔ اس کی ممتا نے پہچان لیا کہ وہ اسی کا لخت جگر ہے۔ ماں بیٹا ملے اور کافی دیر تک روتے رہے۔

گاؤں میں اسی دن اس کی ماں نے واقعی سات کالے بکروں کا صدقہ دیا اور لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔ غریبوں مسکینوں اور ناداروں کی جھولیاں بھریں۔ گاؤں کے لوگ بھی خوش تھے کہ پانچ سالوں کے بعد ہی سہی۔ ان کی ہر دل عزیز خالہ صغرہ کا بیٹا لوٹ آیا ہے۔ اسکے بعد اس کی ماں نے اس کے کسی کام میں دخل نہیں دیا۔ وہ بے چاری اسی پر خوش رہتی ہے کہ اس کا بیٹا اس کے پاس ہے۔ اور کبھی نہیں جاتا کبھی ہے تو کچھ ماہ کے بعد لوٹ آتا ہے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ زمانے میں اس سا کوئی عقل مند ہے ہی نہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ دنیا کا سب سے احمق ترین شخص ہی یہی ہے۔ آپ شکر کریں کہ آپ کی بیٹی کو یہاں لانے تک اس کی پھرکی نہیں گھومی۔ ورنہ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہنستا ہوا آپ کی بیٹی کو چوٹی سے پکڑ کر دوبارہ انہی لوگوں کے حوالے کر دیتا اور میں سچ کہتا ہوں اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔

میں نہیں مانتی انکل کہ ارسلان ایسا بھی ہو سکتا ہے میں نے تو اس جیسے مضبوط اعصاب کا مالک شخص آج تک نہیں دیکھا۔ بہترین منصوبہ ساز، بروقت فیصلہ کرنے والا اور دوستوں پر جان لٹانے والا۔ میرا اور اس کا ساتھ صرف چند گھنٹوں پر محیط ہے مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں اسے صدیوں سے جانتی ہوں۔ نہیں انکل ارسلان ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی اور کے بارے میں یہ سب باتیں کر رہے ہیں۔

نہیں میری بیٹی میں اسی ارسلان کی بات کر رہا ہوں۔ جو تمہیں موٹر سائیکل پر یہاں چھوڑ کر گیا ہے۔ اور جسے گاؤں کے لوگ ارسلان کم اور سلو ملنگ کے نام سے زیادہ جانتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

میں ارسلان کے اس موبائل نمبر پر کئی دفعہ کال کر چکی تھی۔ جس نمبر سے اس نے ابو سے میری بات کروائی تھی اور خود بھی بات کی تھی وہ نمبر شاید خود اس نے بند کر دیا تھا۔ اب میری ٹانگ بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔ ارسلان میرا محسن تھا۔ میں اس سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر

اس نے جانے کیوں موبائل بند کر رکھا تھا۔ اس وجہ سے میں کافی پریشان تھی۔ میرے یوگا کے انسٹرکٹر اشرف صاحب جو کہ میرے انسٹرکٹر کم اور دوست زیادہ تھے۔ پچھلے کچھ دنوں سے پریکٹس میں میری ذہنی عدم موجودگی کو نوٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"بیٹا! کیا بات ہے آج کل تم کافی اپ سیٹ ہو۔"

پہلے تو میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ مجھ سے سارا مسئلہ پوچھ کر ہی رہے۔

"ہماری شہزادی کا کہیں ان پر دل تو نہیں آ گیا نا؟" وہ مجھ سے پیار پیار میں مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ ہنس کر کہنے لگے۔

"ایسا مسئلہ فی الحال تو نہیں۔ ہاں البتہ میں اس سے جلد نہ ملی تو شاید ایسا بھی ہو جائے۔ کیونکہ میں جتنا بھی اسے بھولنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ مجھے اتنا ہی شدت سے یاد آتا ہے۔ اگر یہی پیار ہے تو پھر مجھے جلد ہی یہ مرض لاحق ہونے والا ہے۔" میں نے بھی ہنس کر ہی جواب دیا۔

"بیٹی! ایسے لوگ زندگی میں کبھی بھلائے بھی نہیں جا سکتے۔ میں آپ کے لیے اس بندے کا نہ صرف کھوج لگاتا ہوں۔ بلکہ موصوف کے تمام حدود اربعہ سے بھی آپ کو آگاہ کرتا ہوں۔ پلیز آپ پریشان نہ ہوں اور اپنے معمولات زندگی پہلے کی طرح ہی انجام دیں۔ انشاءاللہ آپ کا یہ انکل چند دنوں میں آپ کے تمام مسائل حل کر دے گا۔"

☆☆☆☆☆☆

انکل کو گئے ہوئے آج دو ہفتے ہو چکے تھے مگر ان کا کوئی پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں میں اب پچھتا رہی تھی کہ میں نے انکل کو ایسی بات کہی ہی کیوں تھی۔ میں ان کے پیچھے رحیم نگر جانے ہی والی تھی کہ ایک شام انکل اشرف کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ گھر لوٹ آئے ہیں۔ میں نے ان کے گھر کے نمبر پر فون کیا۔

"بیٹی میں ابھی گھر پہنچا ہی ہوں۔ انشاءاللہ کل تفصیلاً بات ہو گی۔" انہوں نے کہا۔

"آپ خیریت سے تو ہیں نا، آپ کی آواز کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ فکر مند کیوں ہوتی ہیں۔ میں نے کہا نا کہ کل بات ہو گی۔ دراصل وہاں آپ کے کام کے لیے میں اتنا مصروف رہا کہ میں تھک گیا ہوں۔ انشاءاللہ کل تسلی سے بات کریں گے۔"

"او کے انکل، تو پھر میں کل آپ کا شدت سے انتظار کروں گی ذرا جلدی آئیے گا۔"

دوسرے دن انکل آئے تو کافی بجھے بجھے سے تھے۔ ان کی شکل سے عیاں تھا کہ وہ کوئی اچھی خبر نہیں لائے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ اب گھما پھرا کے مجھے تسلی دینے کی کوشش کریں گے۔

قصہ مختصر یہ کہ انکل اشرف دو ہفتوں سے سیلانی ملنگ کے روپ میں سائیں ٹوپے شاہ کے مزار پر موجود رہے تھے۔ ان کے مطابق انہوں جو کچھ وہاں دیکھا وہ قطعاً حوصلہ افزا نہ تھا۔

"اندر کی بات یہ ہے کہ وہ کئی برائیوں میں ملوث ہے۔ اوٹ پٹانگ باتیں تو وہ کرتا ہی رہتا ہے۔ ہر جمعرات کو وہ وہاں ہیجڑوں کا لباس پہن کر ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتا ہے۔ رقص کرتے ہوئے وہ اکثر وجد کے عالم میں کہتا ہے۔ وہ دیکھو عرفان آ گیا۔ عرفان آ گیا اور اس کے ہیجڑے ساتھی بھی یہی راگ الاپتے ہیں۔ رقص کے بعد اس کی جیب میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ سارا ہیجڑوں اور ڈھول والے کی نذر کر دیتا ہے۔ تماش بین اور لنگر کھانے والوں کی کثیر تعداد

جمعرات کو وہاں جمع ہوتی ہے۔ لنگر پانی کا تمام خرچ اس کی والدہ کے ذمے ہے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اس کے والد کی دس مربع زمین تھی جو کہ سونا اگلتی ہے اور ان کے تمام خراجات پورے ہو رہے تھے اور اکثر جب وہ اپنی موج میں اکیلا بیٹھا ہوتا ہے اور کوئی اس کے قریب دعا وغیرہ کروانے جاتا ہے۔ تو وہ قریب پڑا ہوا نکیلا ڈنڈا اٹھا لیتا ہے۔ اور اسے مارنا شروع کر دیتا ہے۔ لوگ اسے بھی اس کا فیض سمجھتے ہیں۔ وہاں کے لوگ یہی کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو سلو ملنگ سے ڈنڈے کھاتے ہیں۔ ان کے کام ہو جاتے ہیں۔ مگر میں نے تو ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔"

"انکل آپ بھی جھوٹ بولتے ہیں جس ارسلان کے ساتھ میں نے وقت گزارا ہے۔ اس میں کوئی ایسا عیب ہو ہی نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔

"بیٹی! اچھے کام تو وہ کبھی کبھی کرتا ہے تاکہ اس کی نیک نامی بھی قائم رہے۔ وہاں موجود ایک ہیجڑا بتا رہا تھا کہ سلو بھائی کے اکثر غائب رہنے کی وجہ سے ان کی آمدنی بھی کم ہوتی ہے۔ جب وہ کچھ دن یہاں ہوتے ہیں تو ان کی روزی روٹی بھی چلتی ہے۔ بیٹی میں تو آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ اسے بھول جائیں۔ یہ بندہ دردسر کے سوا کچھ بھی نہیں۔" انکل نے کہا۔

"انکل! آپ مجھے یوں ڈس ہارٹ تو نہ کریں۔"

"بیٹی خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ جب آنکھ کھلے گی تو تم اپنی عقل پر ماتم کرو گی۔ تب میرا کہا تمہیں یاد آئے گا۔ تب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوگا۔ اتنا کہ کر وہ چلے گئے۔

میں جانے کتنی دیر بے رحم خیالوں میں گم اپنے کمرے میں خلاؤں میں تکتی رہی۔ مجھے ہوش آیا تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اور میرے دل کی حالت تو بیان ہی سے باہر تھی۔

☆☆☆☆☆☆

ایک عجب سی بے کلی اور اداسی نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ کسی بات میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی میں بس وقت گزارنے کے لیے چلی جاتی تھی۔ ورنہ میرا دل تو وہ پنچھی تھا۔ جو میرے جسم کے پنجرے سے کبھی کا نکل چکا تھا۔ آج صبح ہی سے بارش ہو رہی تھی۔ میں بے دلی سے یونیورسٹی کے لیے نکلی۔ پہلے پیریڈ کے بعد میرا یونیورسٹی میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ گھر ہی چلتی ہوں۔ میں اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ میرے ابو کے کمرے سے انکل اشرف کی آواز آئی۔

"سر وہ شخص پاگل تو بالکل نہیں ہے۔ میں نے ساری تحقیق کر لی ہے۔ میرے اپنے بھی کچھ خفیہ ذرائع ہیں۔ وہ بندہ انٹیلی جنس میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہے۔ مگر اس کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ گاؤں والا سارا سیٹ اپ اس کی ذات پر پردہ ڈالنے کے لیے ہے۔ وہ شخص حقیقت میں ہمارے ملک کا سرمایہ ہے۔"

"پھر تم نے میری بیٹی ذکیہ سے جھوٹ کیوں بولا؟ تم نے اس کی حالت دیکھی ہے۔ کیا ہو رہی ہے؟"

"سر، میرا دل بھی اس کی حالت دیکھ کر کڑھتا ہے۔ مگر میں کیا کروں، میں ارسلان سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ میں اس کی حقیقت کے بارے میں ذکیہ کو بالکل نہیں بتاؤں گا۔ وہ شاید کبھی نہ کھلتا۔ مگر میں نے اسے اس کے کسی عزیز ساتھی کا فون کروایا تھا۔ تب جا کر وہ مانا۔ مگر اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ذکیہ کو اصل حقائق سے بے خبر رکھوں۔ تاکہ وہ اپنی زندگی اس کے پیچھے برباد نہ کرے۔ کیونکہ ایسے اداروں میں جو لوگ کام کرتے ہیں۔ موت ہمیشہ ان کے تعاقب میں رہتی ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ذکیہ خدانخواستہ

اپنی زندگی......"

میں اصل حقائق کو سمجھ چکی تھی اور اب مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ میری زندگی کا سب سے خوش گوار دن تھا۔ اب مجھے اپنے اس شک پر یقین آ چکا تھا کہ یہ وہی شخص تھا۔ جسے میں بہت بہتر طور پر جانتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

رحیم نگر میں رات کوئی سارے گاؤں میں ایک عجیب سا اشتہار لگا گیا تھا۔ اس اشتہار کی لکھائی ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی اور کسی نے اس کی فوٹو کاپیاں کروا کر دیواروں پر چسپاں کر دی تھیں۔ یہ اشتہار سائیں ٹوپے شاہ کے متعلق تھا۔ لکھا تھا کہ سائیں ٹوپے شاہ کے روحانی خلیفہ سائیں بھولے شاہ جو کہ عرصہ دراز سے کافرستان کی پہاڑیوں میں چلہ کشی میں مصروف تھے۔ اپنی منزلیں مکمل کرنے کے بعد واپس اپنے مرشد سائیں ٹوپے شاہ کے مزار پر حاضری دینے کے لیے بروز جمعرات یکم جنوری کو تشریف لا رہے ہیں۔ ہر خاص و عام کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں رات کو محفل سماع کا انعقاد ہوگا۔ جس میں ملک کے مایہ ناز قوال استاد لدھے خاں، ٹوجھے خاں اور ہمنوا کلام عارفانہ پیش کریں گے۔ لنگر کا خصوصی انتظام بھی کیا گیا ہے۔ رات کو محفل سماع سے پہلے شربت عرفانیہ پیش کیا جائے گا۔ جو کہ آپ کی چشم باطنیہ پر لگے زنگ کو سرف کی طرح دھو دے گا۔ لہٰذا آپ کی شمولیت انتہائی ضروری ہے۔

منجانب! نیازمندان سائیں ٹوپے شاہ۔

گاؤں میں ارسلان عرف سلو ملنگ کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ایک دن سائیں ٹوپے شاہ کے مزار پر صدر امریکہ باراک اوباما خود حاضری دینے آئیں گے اور جب میں اسے شربت کافوری پلاؤں گا تو وہ ڈھول کی تھاپ پر اپنا مشہور سیاسی رقص بھی پیش کریں گے۔ لیڈی ڈیانا تو پہلے ہی ان کی روحانی مریدنی ہے جو کہ ہر جمعرات کو آ کر سائیں ٹوپے شاہ کے مزار پر جھاڑو دیتی ہے۔

"سلو بھائی! ہم نے تو سنا تھا کہ وہ کافی عرصہ ہوا مر گئی تھی؟" کسی نے کہا۔

"نا ہنجار، بے وقوف، عقل کے اندھے میری چشم شب سیاہ سے دیکھو تو تمہیں پتہ چلے کہ سائیں ٹوپے شاہ کے مزار پر اندرا گاندھی بھی روز بھجن گاتی ہے۔"

"مگر حضور! میں نے تو اس کے بارے میں بھی سنا تھا کہ اسے بھی مرے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔"

"تم سب ایک نمبر کے ملحد ہو، تم تو اب یہ بھی کہو گے کہ وہ جو سامنے بل کلنٹن ہاتھ باندھے کھڑا سائیں ٹوپے شاہ سے مدد مانگ رہا ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔"

"مگر سلو بھئی وہاں تو رسو مصلی کھڑا ہے۔"

"یہی تو تم لوگوں کو پتہ نہیں کہ بل کلنٹن بھی سائیں ٹوپے شاہ کے مزار پر آ کر رسو مصلی بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ یہی تو عاجزی ہے میرے بھائی اور یہی سائیں ٹوپے شاہ سے فیض لینے کا طریقہ ہے کہ اپنے آپ کو مٹا دو، عقل کے اندھو کبھی قومیں سدھر گئیں مگر خدا جانے تمہاری آنکھ کب کھلے گی۔ تمہیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ سائیں ٹوپے شاہ کو ٹوپے شاہ کیوں کہتے ہیں۔"

"کیوں کہتے ہیں سلو بھائی؟"

"میں تم لوگوں کو کیوں بتاؤں؟ یہی تو وہ راز ہے جو کہ صدر امریکہ نے ہماری حکومت سے کہا تھا کہ ڈاکٹر وزیر خان سے پوچھ کر بتائے۔ مگر اس نے نہیں بتایا۔ اسی لیے تو وہ بے چارہ حکومت کے عتاب کا شکار ہو گیا تھا۔ وہی راز ڈاکٹر وزیر خان نے مجھے راگ تنبورا کی چائے میں مکس کر کے پلا دیا تھا۔"

"راگ تنبورا اور چائے! بھلا یہ کیا بات ہوئی سلو بھائی......؟"

”تم کیا جانو کہ اس مکسچر میں کتنے امراض کی شفا پائی جاتی ہے تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ رات ڈاکٹر وزیر خان کہاں تھا؟“
”کہاں تھا سلو بھائی؟“
”تمہیں بتائے دیتا ہوں کسی کو بتانا مت‘ اپنا سگا پچا ہے وزیر خان‘ سائیں ٹوپے شاہ کا مرید خاص ہے۔ ڈاکٹر وزیر خان کے پاس جتنے بھی سائنسی فارمولے ہیں ناں‘ یہ سب سائیں ٹوپے شاہ نے اسے خواب میں آکر بتائے تھے۔ بڑا مانتا ہے وہ سائیں ٹوپے شاہ کو‘ اور وہ کشتی دیکھ رہے ہو ناں تم لوگ جو دریا میں تیرتی ہوئی ادھر آرہی ہے۔ لوگوں نے دور دریا کی طرف دیکھا تو وہاں کشتی نام کی کوئی شئے نہ تھی‘ دیکھو عقل کے اندھو میری آنکھوں سے دیکھو اس کشتی میں میرا دوست عرفان آرہا ہے۔ مگر یہ کشتی شاید بھنور میں پھنس چکی ہے۔ مجھے جاکر اسے نکالنا چاہئے ورنہ وہ ڈوب جائے گا۔“ یہ کہ کر وہ دریا کی طرف بھاگا۔ لوگوں نے اسے راستے میں ہی پکڑ لیا۔
”دیکھو دوستو‘ مجھے چھوڑ دو‘ مجھے میرا دوست عرفان بلا رہا ہے۔ وہ مر رہا ہے اسے بچالو میرے بھائیو۔ اگر وہ مر گیا تو تم سب ختم ہو جاؤ گے۔ کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ لوگ سمجھ چکے تھے کہ سلو بھائی کو آج پھر دورہ پڑ گیا ہے انہوں نے اسے مضبوطی سے پکڑا اور اسے اس کی ماں کے پاس لے گئے۔ اور ایسے وقت میں ماں کی گود ہی اسے سکون دیتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

سائیں ٹوپے شاہ کا مزار رنگ برنگی جھنڈیوں سے سج چکا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کافرستان سے سائیں ٹوپے شاہ کے روحانی خلیفہ سائیں بھولے شاہ اپنی پوری آب وتاب سے تشریف لا چکے تھے اور انہیں بڑی عقیدت واحترام سے حجرۂ خصوصی میں لایا گیا تھا۔ باہر پنڈال میں لنگر کی تقسیم جاری تھی۔ حلوائیوں‘ پکوڑا‘ سموسہ‘ چائے اور غباری والوں کی دکانیں لگ چکی تھیں۔ بچوں کے جھولے بھی باہر میدان میں آراستہ ہو چکے تھے۔ میلے میں گہما گہمی عروج پر تھی۔ سلو اور اس کے ملنگ ساتھی بھی آج نئے سبز چولوں میں ملبوس تھے۔ مگر جانے کیوں سلو آج صبح سے چپ چپ سا تھا۔ مگر اس نے سائیں ٹوپے شاہ کے خلیفہ سائیں بھولے شاہ کا بھرپور انداز میں استقبال ضرور کیا تھا اور اب وہ لنگر خانے میں کھڑا تمام انتظامات کا جائزہ لے رہا تھا۔

رات عشاء کی نماز کے بعد محفل سماع کے انعقاد سے ذرا پہلے سب لوگوں کو شربت عرفانیہ سے نوازا گیا۔ البتہ یہ شربت بچوں کے لیے ممنوعہ قرار پایا۔ اس لیے بچوں کو اس سے دور رکھا گیا۔ ابھی محفل سماع میں کچھ وقت تھا۔ مگر اس سے پہلے پنڈال میں سبھی حاضرین محفل پہنچ چکے تھے۔ جس میں سلو ملنگ‘ اس کے حواری اور روحانی خلیفہ سائیں بھولے شاہ بھی بہ نفس نفیس شرکت فرما تھے۔ اور حاضرین محفل کو اپنے نورانی جلوؤں سے سرفراز فرما رہے تھے۔

اچانک سلو ملنگ نے نعرۂ مستانہ بلند کیا اور ادب سے کانپتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور روحانی خلیفہ سائیں بھولے شاہ سے عرض کی۔ ”حضور گستاخی معاف‘ کیا میں آپ سے کچھ روحانی سوالات کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔
”کیوں نہیں بچہ اجازت ہے۔“
”حضور وہ جو دوسرے آسمان پر پچھلی بارشوں میں سیلاب سے ایک بڑا سوراخ ہو گیا تھا کیا وہ بند ہو گیا ہے؟“
”بچہ کیا تم دتے مصلی کو جانتے ہو جو دوسرے آسمان کے چاندنی نمبر چار کے تھرڈ فلور پر رہتا ہے؟“
”جی‘ حضور جانتا ہوں۔“ سلو ملنگ نے حیرانی سے کہا۔
”تو پھر تمہیں یہ بھی پتہ ہونا چاہئے کہ سائیں ٹوپے شاہ نے اسے ایک کفو عطا فرمایا تھا اور اس نے کفو لگا کر وہ سوراخ بند کر دیا تھا۔“
سلو ملنگ اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا اور روحانی خلیفہ سائیں بھولے شاہ کے ہاتھوں پر عقیدت سے بوسہ دیا اور کہا سبحان اللہ اور ایک زوردار نعرہ مستانہ بلند کیا۔
”حضور‘ درویشوں کے نزدیک کچھ طبق وغیرہ کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے اور آپ تو ماشاءاللہ تمام طبقوں سے واقف ہوں گے۔ کیونکہ آپ کافرستان سے تمام منزلیں طے کر کے یہاں پہنچے ہیں۔“
”بچہ! یہ چودہ طبق ہیں جو کہ ہر انسان کے دل کے اندر ہیں۔ مگر نظر تب آتے ہیں جب تالا کھلتا ہے اور تالا تب کھلتا ہے جب سائیں ٹوپے شاہ کی نظر ہوتی ہے۔“
”سائیں ٹوپے شاہ کی نظر کب ہوتی ہے۔“ سلو ملنگ نے کہا۔
”جب انسان اپنی ہستی کا خاتمہ کر لیتا ہے تو من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔“
اب سلو ملنگ وجد کے عالم میں جھومنے لگا اور جھومتے جھومتے اس نے ایک بار پھر نعرہ مستانہ بلند کیا اور ساری محفل بھی جھومنے لگی (اس جھومنے میں کچھ تعلق شربت عرفانیہ کا بھی تھا)۔
”حضور آپ نے پندرہویں طبق کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں‘ جو کہ میرے نزدیک سب سے اہم طبق ہے۔“
”بچے! پندرہواں طبق نہیں‘ طبقہ ہے غریب عوام کا طبقہ‘ مفلوک الحال لوگوں کا طبقہ‘ مظلوموں‘ مزدوروں اور بے نواؤں کا طبقہ‘ اور یہی وہ طبقہ ہے۔ جو تمہارا خواب پریشاں ہے۔ جس کا سایہ تجھے اکثر

چمٹا رہتا ہے۔ اب یہ تمہارے لاشعور میں سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اسی طبقے کی سوچ کو تم ٹانکہ لگانا چاہتے ہو۔ مگر تمہیں اس کے لیے جو سوئی اور دھاگہ درکار ہے۔ وہ نہیں مل رہا' اور یہی وہ طبقہ ہے جو چودہ طبقوں کے چکر میں اپنا طبقہ بھی بھول بیٹھا ہے۔ مگر یہ لوگ نہیں جانتے کہ چودہ طبق اسی کے روشن ہوتے ہیں جو ان تمام طبقوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔"

"حضور' وہ جو امریکی کتا پچھلے دنوں جہاز پر بیٹھا امرستان کی جاسوسی کر رہا تھا اور امرستان کے گدھے نے اسے دولتی مار کے مار گرایا تھا' اس کا کیا بنا؟"

"بیٹا' اس کتے کے پٹے سے ڈالروں کا بیگ بندھا ہوا تھا۔ گدھے کی سینئر برادری نے ڈالروں کا بیگ لے کر اسے چھوڑ دیا تھا۔"

"حضور وہ جو پہلے آسمان پر چاند کھڑا رات کے پچھلے پہر تاروں سے نیاز بھری باتیں کر رہا تھا وہ کیا تھیں؟"

"وہ تاروں سے کیا راز بھری باتیں کرے گا بے چارہ' تم نے اسے قریب سے دیکھا ہی کب تھا وہ رو رہا تھا میرے بچے' کسی کے ہجر میں۔"

"حضور کیا چاند کو بھی کسی سے پیار ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں' اسے بھی اسی ذات سے پیار ہے جس کے صدقے یہ نظام کائنات چل رہا ہے۔"

یہ سن کر سلو ملنگ کی آنکھیں ایک بار پھر اشک بار ہو گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

محفل سماع شروع ہوئی' استاد لدھے خاں' وجھے خاں اور ہمنوا نے راگ الاپنا شروع کیا۔ صفت و ثناء کے بعد کلام عرفانیہ شروع ہوا کلام شروع ہوتے ہی محفل وجد میں آنے لگی۔ چند لوگوں کی ٹولی جو پنڈال کے آخر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑی تیزی سے جھومنے لگی۔ باقی ساری محفل کا جوش ایک طرف اور ان لوگوں کا جوش ایک طرف۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ لوگ وجد کے عالم میں کسی اور ہی جہان میں پہنچے ہوئے ہوں۔ قوال ابھی مصرع شروع بھی نہ کرتا تھا۔ کہ یہ لوگ واہ واہ شروع کر دیتے تھے۔

سلو ملنگ کو جانے کیا ہوا کہ وہ بے خودی کے عالم میں جھومتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور ایک نعرہ مستانہ بلند کیا اور ڈانس کرنے لگا۔ استاد نے جب یہ دیکھا تو اپنی سیٹ پر واپس آ گیا۔ سلو ملنگ کے حواری اٹھے اور انہوں نے سلو ملنگ پر نوٹوں کی برسات کر دی (لگتا تھا کہ یا تو نوٹ جعلی تھے یا پھر قوالوں سے ان کا کوئی مک مکا ہو گیا تھا) وہ جو پیچھے مستانوں کی ٹولی بیٹھی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی اٹھتا اور تیزی سے رقص کرتا ہوا پاس بیٹھے ہوئے لوگوں پر گر جاتا۔ ان سے بچنے کے لیے لوگ ادھر ادھر ہو رہے تھے۔

اتنے میں مستوں کی ٹولی سے ایک بندہ اٹھ کر آیا اور سلو ملنگ کے کانوں میں رازداری سے کوئی بات کی جس کے بعد سلو ملنگ نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور اس کی مٹھی میں دبا دیئے وہ بندہ جھومتا ہوا پھر اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

آخر کار دو بجے کے قریب محفل سماع تمام ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ مگر جن لوگوں نے شربت عرفانیہ پیا تھا۔ وہ وہیں پنڈال میں لڑھکے پڑے تھے۔ بچے' بالے پہلے ہی اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ سلو ملنگ نے روحانی خلیفہ کو اپنی موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھایا اور اسے لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ارسلان عرف سلو ملنگ کی والدہ ابھی تہجد کی نماز سے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ باہر ارسلان کی موٹر سائیکل

کے رکنے کی آواز آئی۔ وہ اٹھی اور اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ اس نے دیکھا کہ نورانی چہرہ' لمبی داڑھی' گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ایک درویش بھی ان کے ساتھ ہے' وہ سن چکی تھی کہ آج کافرستان سے سائیں ٹوپے شاہ کا روحانی خلیفہ آ رہا ہے۔ وہ عقیدت میں آگے بڑھی تو ارسلان نے اسے روک دیا۔

"نہیں ماں جی! ابھی تھوڑی دیر رکیے۔ آپ ذرا چائے بنا لائیں تو پھر آپ کو تسلی سے ان کے درشن کراتے ہیں۔"

ابھی یہ الفاظ سلو کی زبان پر ہی تھے کہ روحانی خلیفہ سائیں بھولے شاہ ماں جی کے قدموں میں گر پڑا اور زار و قطار رونے لگا۔ مگر یہ کیا یہ تو کسی لڑکی کے رونے کی آواز تھی۔ اتنے میں لڑکی نے سر سے عمامہ اتار دیا اور چہرے سے نقلی داڑھی بھی اتار پھینکی۔ اب ماں جی بھی اسے پہچان چکی تھیں۔ انہوں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اور اپنے ساتھ کمرے میں لے کر چل دیں۔

ارسلان موٹر سائیکل کھڑی کر کے اور حویلی کے صدر دروازے کو تالا لگا کے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ ذکیہ اپنی اصل شکل و صورت کے ساتھ ماں جی کے قدموں سے لگی رو رہی تھی۔ اور ایک ہی بات کی رٹ لگائے جا رہی تھی کہ ماں جی مجھے معاف کر دیں' ماں جی مجھے معاف کر دیں۔

"میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی ماں جی۔"

"اچھا بیٹا معاف کیا اب تو اٹھو اور بیڈ پر بیٹھ جاؤ۔" ماں نے کہا۔

"ماں جی اس سے پہلے آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"مجھے پتہ ہے پگلی' تم کیا کہو گی۔"

☆☆☆☆☆☆

اس مسئلے کا آغاز اس وقت ہوا تھا۔ جب ہماری ایجنسی کو اس جگہ کے بارے میں کچھ خطرناک قسم کی رپورٹس ملیں۔ ایک بات جو ان لوگوں نے اس حویلی اور تہہ خانے کے بارے میں اندر کے لوگوں میں پھیلا رکھی تھی کہ یہ خفیہ حکومتی سائنسی ریسرچ سنٹر تھا۔ یہ بالکل غلط تھی۔ یہ ایک غیر ملکی فارماسیوٹیکل کمپنی تھی اور اس کمپنی کی آڑ میں یہ لوگ انتہائی گھناؤنا کھیل کھیل رہے تھے۔ یہ الگ بات کہ کچھ بے ضمیر اور بے حس حکومتی اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ ان کی پشت پناہی کر رہے تھے اور جب ہماری ایجنسی نے ایوان بالا کے حکمرانوں سے اس بارے میں بات کرنا چاہی تو انہوں نے ٹال مٹول سے کام لیا اور پھر ہماری ایجنسی کے ذمہ دار افراد کو فارغ کیا جانے لگا۔ ان حالات میں ہماری ایجنسی کے چند محب وطن اور غیور لوگوں نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا' کہ کوئی ایسا شخص ہو جس کا ایجنسی سے کوئی تعلق نہ ہو مگر وہ قابل اعتبار اور محب وطن ہو۔ اس کے ذمے یہ کام لگایا جائے۔ اس بارے میں ان لوگوں نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں جو پہلے بھی کئی دفعہ ایجنسی کی کارکن نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ کچھ مہمات میں حصہ لے چکی تھی۔ اور چند چیدہ چیدہ لوگ مجھے جانتے تھے۔

مجھے خدا نے کچھ خصوصیات سے نوازا تھا اور کچھ ایجنسی کے لوگوں نے بھی مجھ پر محنت کی تھی۔ اس لیے میرے تمام چھپے ہوئے ہنر نکھر گئے تھے۔ کچھ چیزوں کا مجھے بچپن ہی سے شوق تھا۔ جس میں میک اپ اور بہروپ کا علم سرفہرست تھا اور کمپیوٹر سے تو مجھے دلی لگاؤ تھا اور آوازوں کی نقل کرنا ایک خداداد صلاحیت ہے جو کہ مجھ میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ مجھے اس مہم کے لیے خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ جس میں کمپیوٹر ہیکنگ سرفہرست تھی۔ جس کے لیے ایجنسی کے ماہرین نے

مجھے ایسے ایسے گر بتائے جنہیں سن کر میں حیران رہ جاتی تھی۔ دو ماہ کے بعد میری ٹریننگ مکمل ہوگئی۔

جہاں تک میرے ابو کا تعلق ہے تو وہ بذات خود ایک محب وطن شخصیت ہیں۔ ایجنسی نے کافی دیر پہلے جب ایک دفعہ انہیں میک اپ کے سلسلے میں میری ضرورت پڑی تھی تو انہوں نے ابو کو اعتماد میں لیا تھا اور اس کے بعد میرے شوق کو دیکھتے ہوئے چند مہربانوں کی وجہ سے مجھے وطن کی خدمت کا موقع ملتا رہا۔ ابو تو ویسے بھی مجھے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ اور میرا تو دل ہی خدا نے ایسا بنایا تھا کہ اس میں وطن کی محبت ایک نشے کی طرح رواں دواں تھی۔ اس لیے میرے ابو نے نہ صرف مجھے خفیہ ایجنسی سے تعاون کی اجازت دی بلکہ انہوں نے اس کے لیے کئی بار مجھے مالی سپورٹ بھی فراہم کی۔

میری ٹریننگ مکمل ہونے کے دوران ہی مجھے اس فارماسیوٹیکل کمپنی میں پہنچانے کا بے داغ منصوبہ بھی تیار ہو چکا تھا۔ میرا تایازاد بھائی وڈیرہ رب نواز جو کہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھا اور اس ریکٹ کا ایک حصہ تھا۔ میری ان سے بچپن سے نسبت طے تھی۔ میں تو ویسے ہی اس کے کرتوتوں سے آشنا ہونے کے بعد اس سے شادی کرنے کے حق میں نہ تھی۔ اس لیے اس منگنی کو ابو نے توڑ دیا۔ اور اس کے بعد وہی ہوا۔ جو ہم نے سوچا تھا۔ یعنی کہ مجھے اغواء کر کے اس فارماسیوٹیکل کمپنی میں پہنچا دیا گیا اور ارسلان عرف سلو کی تو بات ہی الگ ہے۔ میں اس انمول شخص کے ساتھ تین چار مہمات میں حصہ لے چکی تھی۔ مگر مہم کے ختم ہوتے ہی وہ ایسے غائب ہو جاتا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کئی بار میں نے اس سے اس کا پتہ پوچھنا چاہا تو اس نے مجھے ٹال دیا۔ شاید وہ میرے اس جذبے سے واقف ہو چکا تھا۔ جو میرے دل کے آنگن میں ایک سایہ دار درخت کی طرح پرورش پا رہا تھا۔ مہم کے دوران پہلی دفعہ جب اس سے میرا واسطہ پڑا تو مجھے شک ہوا کہ یہ وہی شخص ہے۔ اس لیے میں نے کسی بہانے سے اپنے یوگا کے انسٹرکٹر سے اس کے بارے میں تحقیقات کروائیں۔ اور وہی ہوا جس کا مجھے شک تھا۔ میں اس بندے کو ٹریس کر چکی تھی۔ جو میرے لیے روح کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور امید پر دنیا قائم ہے کے مصداق مجھے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی میرے لیے اس کے دل میں وہ جذبہ جاگ اٹھے گا جس کی میں منتظر تھی۔

خرم لاہور میں اپنی بہن نگو اور والدین کے ساتھ پہنچ چکا تھا اور اب ہماری فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ نرس مدیحہ بھی اپنے گھر میں اپنے بچوں کے درمیان خوشی سے زندگی بسر کر رہی ہے۔ البتہ اب وہ اپنے آبائی شہر کو چھوڑ کر لاہور میں ہی رہتی ہے۔ اور ابو کی گارمنٹ فیکٹری میں ڈسپنسری انچارج ہے۔

جہاں تک وڈیرہ رب نواز، ڈیوڈ، لوسی اور باس کا تعلق ہے تو ان کی اس رات ساڑھے تین بجے اس فارماسیوٹیکل کمپنی کے تہہ خانے میں میٹنگ تھی۔ ہماری ایجنسی کی رپورٹ کے مطابق وہ تین بجے وہاں پہنچے تھے اور دھماکوں کے وقت اندر ہی تھے۔

اور وہ دو افراد جو انتہائی ایمرجنسی میں وہاں سے میں نے اسپتال میں بھیجے تھے وہ اب بالکل خیریت سے تھے اور وہ لوگ ایک انتہائی حساس ادارے کے ملازم تھے۔ جس ادارے کا میں یہاں ذکر مناسب نہیں سمجھتی۔ بہر حال وہ اب مکمل طور پر صحت مند تھے اور اپنے محکمے میں ڈیوٹی کر رہے تھے۔

ختم شد

⌘

طعام خاص

نسیم سحر

ایک قاتل کی روداد، عدالت نے اس کے فعل کو جائز قرار دے کر رہا کر دیا تھا۔
ایک ایسے فنکار کا احوال، جو قاتل ہونے کے باوجود قومی ہیرو کا درجہ رکھتا تھا۔

فرانسیسی ادب سے ایک خوب صورت انتخاب

پیرس کے بے شمار وکلا اور ججوں کے لیے یہ خبر بے حد تعجب خیز تھی کہ مشہور وکیل باشمیل نے ایک ملزم ڈاکلوس کی وکالت کرنا قبول کر لیا ہے۔ امریکہ کی حکومت نے حکومت فرانس سے درخواست کی تھی کہ یہ ملزم کو اس کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ وہ امریکی ریاست کانکٹی کٹ میں ایک قتل کے سلسلے میں مطلوب تھا اور ڈاکلوس نے قتل کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ اس لیے بظاہر مقدمے میں کوئی جان نہیں تھی اور یہ بات یقینی تھی کہ اسے حکومت امریکہ کے حوالے کر دیا جائے گا جو اس پر قانون کے مطابق مقدمہ چلائے گی۔ چنانچہ لوگوں کی حیرانی قابل فہم تھی۔ باشمیل نے آج تک اتنے معمولی مقدموں میں کبھی ہاتھ نہیں ڈالا تھا اور اب یوں لگتا تھا کہ یہ مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے اپنی ساکھ کو نقصان پہنچانے کا سامان کیا ہے۔

باشمیل کوئی معمولی وکیل نہ تھا۔ اسے ایک نہایت ذہین قانونی مدبر کی حیثیت حاصل تھی اور ویسے بھی وہ پیرس کی اونچی سوسائٹی میں اعلیٰ اور لذیذ کھانوں کے باذوق شائق کی حیثیت سے بہت مشہور تھا۔ چنانچہ پیرس کے تمام حلقوں میں یہ مقدمہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور جب اس نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مقدمے کی سماعت کو موسم بہار تک ملتوی کروالیا تو لوگ اور حیران بھی ہوئے لیکن باشمیل کا کوئی کام بلا سبب نہیں ہوتا تھا۔ موسم بہار تک اس مقدمے کا التوا نہایت ضروری تھا کیونکہ اس مقدمے میں ایک ایسا نازک مسئلہ درپیش تھا جس کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی باذوق اور اعلیٰ کھانوں کے شائق جج کی ضرورت تھی اور موسم بہار کے اجلاس میں عدالت کا صدر ایک ایسا شخص تھا جسے کھانوں کا اعلیٰ ذوق رکھنے والی انجمن کا صدر بھی منتخب کیا جا چکا تھا۔ باشمیل نے بڑے رازدارانہ لہجے میں اپنے موکل کو بتایا تھا کہ اس نے یہ مقدمہ اس سے قبل اس لیے پیش نہیں ہونے دیا کہ موسم گرما کے عدالتی اجلاس کی صدارت ایک نہایت بدذوق شخص کر رہا تھا جسے کچھ باذوق لوگوں نے ایک مرتبہ ابلے ہوئے انڈے پر صرف نمک استعمال کرتے ہوئے دیکھا اور ان کے نزدیک جو شخص کالی مرچ اور نمک کو ایک خاص مقدار میں انڈے پر استعمال نہ کرے، وہ بدذوق ہونے کے ساتھ ساتھ کم عقل بھی تھا اور ایسا شخص عدالت میں کسی ایسے مقدمے کا منصفانہ فیصلہ ہرگز نہیں کر سکتا تھا جس میں نفاست اور مہارت سے تیار کی گئی کسی چیز کا اہم معاملہ درپیش ہو۔

باشمیل کے پاس اس مقدمے کو ہاتھ میں لینے کی وجہ بھی موجود تھی۔ ڈاکلوس نے باشمیل پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک بہترین اور سلیقہ شعار باورچی ہے اور اس طرح اس نے باشمیل کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ باشمیل کو اعلیٰ اور عمدہ کھانا پکانے اور کھانے کا بے پناہ شوق تھا اور وہ اکثر نت نئے

کھانوں کی تیاری میں مشغول رہتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکلوس کوئی معمولی اور گھٹیا باورچی نہ تھا اس نے ایک عام قسم کی چٹنی میں معمولی سی تبدیلی کر کے اس کے ذائقے میں ایسی حیرت انگیز لذت پیدا کر دی تھی کہ فرانس کے لوگوں کے خیال میں اس تبدیلی کی بدولت اس شخص کو تاریخ کے صفحات پر زریں حروف میں جگہ ملنی چاہیے تھی اور اسی وجہ سے باشمیل نے یہ مقدمہ لڑنا منظور کر لیا تھا' کیونکہ اس میں کامیابی حاصل کرنے کی صورت میں اس کے لیے باذوق کھانے پکانے والوں کی انجمن کا ممبر بن جانا آسان ہو جاتا اور یہ انجمن صرف اچھے کھانے کھانے والوں کی انجمن ہی نہیں تھی بلکہ فرانس کے ہر شعبے میں اس انجمن کے ممبران موجود تھے اور پیشہ وکالت میں بھی مزید آگے بڑھنے کے مواقع حاصل کرنے کے لیے ان ممبران کی مدد ضروری تھی۔

ادھر ڈاکلوس کو اس وکیل کی موجودگی میں مقدمہ جیت لیے جانے کے واضح امکانات نظر آ رہے تھے۔ اس لیے اس نے آئندہ کے لیے منصوبہ بھی بنا لیا۔ رہا ہوتے ہی وہ اپنے آبائی قصبے میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا اور وہاں اپنی پسند کی شادی کر کے دوبارہ پیرس آنا چاہتا تھا۔ جہاں اس کا ارادہ ایک ہوٹل کھولنے کا تھا۔ باشمیل نے اس سے دریافت کیا کہ وہ اپنے آبائی قصبے میں کتنی مدت تک ٹھہرے گا تو ڈاکلوس نے بتایا کہ تقریباً ایک مہینہ اس پر باشمیل دل ہی دل میں مسکرایا۔ وہ سوچ رہا تھا' ایک مہینہ تو بڑی مدت ہوتی ہے اور وہ اس ایک ماہ میں ڈاکلوس کی عدم موجودگی میں ایک خاص کام کرنا چاہتا تھا۔

......☆☆☆......

مقدمے کی سماعت اسی جج نے کی جس کے بارے میں باشمیل کو قوی امید تھی۔ عدالت کا کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کیونکہ اس نوعیت کا مقدمہ فرانس کے ہر فرد کے نزدیک قابل دید و شنید تھا۔ امریکی سفارتخانے کا ایک سفارتکار بھی بہ نفس نفیس موجود تھا جسے حکومت امریکہ کی طرف سے خاص ہدایات ملی تھیں کہ وہ عدالت کی کارروائی سن کر حکومت کو تفصیلی رپورٹ پیش کرے۔

استغاثہ نے بڑے واضح الفاظ میں مقدمہ پیش کیا۔ مقدمے میں کوئی پیچیدگی موجود نہیں تھی۔ گواہوں کے بیانات میں کوئی تضاد نہ تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ملزم ڈاکلوس نے کانکٹی کٹ (امریکہ) میں ایک ہوٹل کھولا ہوا تھا۔ ایک شام اس نے اپنے چند مستقل گاہکوں کو کھانے پر مدعو کیا اور کھانے کے دوران ہی میں بظاہر کسی وجہ کے بغیر اس نے ایک گاہک دلوبی کو چھری سے قتل کر ڈالا تھا۔ ملزم نے ارتکاب قتل کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ موجودہ عدالت کے زیر سماعت یہ امر نہیں تھا کہ ڈاکلوس مجرم ہے یا نہیں' بلکہ اصل مسئلہ صرف یہی تھا کہ قاتل ڈاکلوس کو حکومت امریکہ کے حوالے کیا جا سکتا ہے اور اس پر امریکی قانون کے تحت مقدمہ چلانے کی اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں۔

جب باشمیل اٹھا تو لوگوں کو یقین تھا کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مقدمہ صاف طور پر ہارا جا چکا تھا۔ باشمیل نے بڑے ڈرامائی انداز میں آغاز کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرے گا کہ استغاثہ کے وکیل نے واقعات درست طور پر بیان کیے ہیں۔ واقعی اس کے موکل نے اپنے ایک گاہک کو قتل کیا ہے لیکن وہ معزز عدالت سے صرف یہ اجازت چاہتا ہے کہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ یہ قتل بالکل حق بجانب تھا اور فرانسیسی روایات کے تحفظ کے تحت اس قتل پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ باشمیل نے کہا کہ وہ یہ بھی ثابت کرے گا کہ ڈاکلوس کو مجرم گردان کر اسے حکومت امریکہ کے حوالے کرنا قانون کا مذاق اڑانے کے مترادف ہوگا کیونکہ ڈاکلوس ایک فنکار اور قومی ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔

ساتھ ہی اس نے کہا۔ ”اور میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس امریکی صوبے کانکٹی کٹ اور وہاں کے لوگوں کے رہن سہن سے بھی آگاہ کر دوں کیونکہ یہ بات اس مقدمے میں درپیش مسئلے کے صحیح ادراک کے لیے اہم حیثیت رکھتی ہے۔ میں خالص فرانسیسی خوش خوراک اور باذوق لوگوں کے نقطہ نظر سے وہاں کی زندگی کے ایک عام دن کا منظر پیش کروں گا کیونکہ میرا معزز موکل بھی اس معاملے میں یہی حیثیت رکھتا ہے۔“ پھر باشمیل نے بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا کہ کس طرح امریکی صبح سویرے اٹھ کر افراتفری کے عالم میں ناشتا کرتے بس یا ریل گاڑی کے پیچھے دوڑتے ہیں اور دن بھر مشین کی طرح کام میں جتے رہنے کے بعد جب رات کو گھر آتے ہیں تو انہیں بھوک کی شدت کے عالم میں صرف پیٹ بھرنے سے مطلب ہوتا ہے اور وہ کسی کھانے کی عمدگی اور ذائقے پر زیادہ توجہ دیے بغیر کھا کر سو جاتے ہیں کیونکہ پھر انہیں جلدی سونا اور علی الصبح بیدار ہونا ہوتا ہے۔ اس کے بعد باشمیل نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ امریکی طرز کے کھانے کس طرح جلدی میں تیار کیے جاتے ہیں اور فرانسیسی کھانوں کے ذائقے اور اشتہا انگیز خوشبو سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ جج کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یہ نہیں سمجھ پایا کہ آخر اس مقدمے کا امریکی اور فرانسیسی کھانے پکانے کی تراکیب سے کیا تعلق ہے؟ لیکن وہ اور جیوری کے ممبران اعتراض کرنے کے بجائے اس دلچسپ ذکر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شاید ان کے منہ میں پانی بھر آ رہا تھا۔

”اور جناب والا......“ باشمیل کہہ رہا تھا۔ ”فرانسیسی شہرت کے بارے میں سننے اور انہیں پرکھنے کے بعد امریکہ میں بھی کوشش کی جانے لگی ہے کہ وہ ہمارے کھانوں کی نفاست اور ذائقے کی معراج تک پہنچ سکیں لیکن کوئی بھی فن ہو' اسے چند دنوں یا چند برس میں پایہ تکمیل کو نہیں پہنچایا جا سکتا۔ اس کے لیے صدیوں کی کوشش اور نسلوں کی محنت سے کام لینا پڑتا ہے۔ امریکی قوم جس طرح سائنسی ترقی میں کئی صدیوں کی محنت کے بعد آج تمام قوموں پر برتری حاصل کر چکی ہے۔ اسی طرح اسے فرانسیسیوں کے سے ذائقے کی حس اور لذت کا ذوق پیدا کرنے کے لیے بھی کئی نسلیں لگیں گی۔ تاہم پچھلے کچھ دنوں سے کچھ امریکی خوش ذوق اور خوش خوراک بن گئے تھے اور انہیں اعلیٰ طریقوں سے پکائے ہوئے کھانوں کا شوق بھی ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ چند لوگ میرے موکل ڈاکلوس کے مستقل گاہک بن گئے تھے۔ جس نے اپنا فرانسیسی طرز کا ہوٹل کانکٹی کٹ میں کھولا ہوا تھا لیکن ان لوگوں کو صرف اچھے کھانے ہی کا ذوق تھا۔ جہاں تک عمدہ کھانے پکانے کا تعلق ہے وہ اس کام میں بالکل کورے تھے۔ وہ چند معمولی طرز کے کھانے پکا لیتے تھے لیکن جب وہ اس سے آگے بڑھ کر فرانسیسی خوش ذوق باورچیوں کی معراج تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو انہیں ناکامی ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ لوگ اس بنیادی حقیقت سے واقف نہیں کہ کسی کھانے کے ذائقے میں کسی شے کی ایک چٹکی کم یا زیادہ پڑ جانے سے زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ یہ لوگ تو اس معاملے میں بے پروائی کی اس انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں کہ اگر کسی وقت سرخ مرچ میسر نہ آ سکے تو وہ کالی مرچ استعمال کرنے میں کوئی

عار محسوس نہیں کرتے۔"
یہاں باشمیل نے توقف کیا تاکہ سرخ مرچ اور کالی مرچ میں کوئی امتیاز نہ کرنے کی فاش غلطی پر جج اور جیوری کے اراکین کو پوری طرح غور کرنے کا موقع ملے۔ جج صاحب باشمیل کے طرز بیان سے متاثر دکھائی دیتے تھے اور بار بار خشمگیں نگاہوں سے امریکی اتاشی کو دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ اب تک مقدمے کے بارے میں ایک کام کی بات بھی نہیں ہوئی تھی لیکن اب صاف طور پر فضا ملزم کے حق میں ہموار ہو رہی تھی۔ حاضرین میں بھی امریکیوں کے کھانے پکانے کی بے پروائی پر سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

"می لارڈ......" باشمیل نے کہنا شروع کیا۔ "میرے موکل کے مستقل گاہکوں میں یہ شخص ولوبی بھی تھا۔ ایک ایسا شخص جو کھانا پکانے کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا لیکن جو اپنے آپ کو اہل ذوق میں شمار کرتا تھا وہ آملیٹ بنا کر یہ سمجھتا تھا کہ اس نے کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ حالانکہ اس شخص کی دیدہ دلیری کا عالم یہ تھا کہ وہ برسرعام یہ کہتا پھرتا تھا کہ مکھن کے بجائے بناسپتی بھی آملیٹ تلنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔" یہاں پہنچ کر باشمیل نے جج کی طرف دیکھا اور جج کی آنکھیں شدت کرب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ جج فرانس کا اعلیٰ ترین آملیٹ بنانے کے لیے مشہور تھا اور اسے آملیٹ میں بناسپتی گھی استعمال ہونے کے ذکر ہی سے اذیت ہو رہی تھی۔

"تو جناب والا...... اب میں اس مقدمے کے لیے ضروری پس منظر مہیا کرچکا ہوں۔ اب ہم اس دن کے واقعات پر بحث کرتے ہیں جب یہ نام نہاد قتل ہوا تھا۔ میرے خیال میں ڈاکلوس کو مجرم سمجھ کر سزا دینے کے بجائے آپ اسے فرانس کا اعلیٰ ترین اعزاز دینا چاہیں گے۔ میں اب قتل کا پس منظر پیش کرتا ہوں۔ میرا معزز موکل فن طباخی کو بہتر سے بہتر بنانے میں اپنی زندگی گزار چکا ہے۔ اور یہ 'خوش ذوقی' یہ اعلیٰ تراکیب اسے نسل در نسل منتقل ہوئی ہیں' اس نے فرانس کی ایک سادہ ترین ڈش یعنی چٹنی بنانے میں اپنی مہارت کا لوہا منوالیا ہے...... بالخصوص جب وہ کانٹی کٹ میں تھا تو چٹنی کے اجزائے ترکیبی میں ایک معمولی سے ردوبدل کے بعد وہ انتہائی خوشبودار چٹنی تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں اس ذائقے کی تبدیلی کی نوعیت سمجھانے میں زیادہ وقت نہیں لوں گا کیونکہ معزز عدالت کو تھوڑی دیر کے بعد بہ نفس نفیس اس چٹنی کی تیاری کے مراحل ملاحظہ کرنے اور اسے چکھنے کی سعادت حاصل ہوگی۔ میں اتنا کرنے پر اکتفا کروں گا کہ یہ چٹنی اس معمولی سے ردوبدل کے بعد فرانس کا ایک بیش بہا اور مایہ ناز سرمایہ سمجھی جاسکتی ہے' اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی نئی شے کا اضافہ نہیں کیا گیا بلکہ عام اجزا کی مقدار میں معمولی سے ردوبدل سے یہ عظیم انقلاب پیدا کیا گیا ہے اور اس چٹنی کو میرے معزز موکل نے اپنے ہوٹل کی خصوصی ڈش بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے امید تھی کہ بہت جلد چٹنی اپنے ذائقے کی بدولت خصوصی اہمیت حاصل کرلے گی اور اس کا نام میرے موکل کے نام "ڈاکلوس چٹنی" پڑ جائے گا' جس کے بعد وہ فرانس میں ایک بہت معزز اور ایک قابل احترام فرد کی حیثیت سے واپس آنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب وہ اس چٹنی کی بدولت دولت مند ہو کر فرانس واپس آتا تو قیمتی زرمبادلہ اس کے ساتھ ہوتا اور یہاں پیرس میں ہوٹل کھولنے کے بعد امریکی اور دوسرے

سیاحوں کی بدولت وہ ملک کے لیے غیر ملکی کرنسی کمانے میں کامیاب رہتا۔

جناب والا میرے موکل نے فرانس کا نام روشن کرنے اور اس چٹنی کو خوش ذوق امریکیوں سے متعارف کرانے کے لیے اپنے خاص کرم فرماؤں کی ایک محدود تعداد کو اپنے ہوٹل میں کھانے پر مدعو کیا۔ ان ہی لوگوں میں مقتول ولوبی بھی شامل تھا جسے اس کے ذاتی اوصاف یا ذائقے کی نفاست وذوق کی بناپر نہیں بلکہ اس کی دولت اور شہرت کی بنا پر بلایا گیا تھا اور یہ دولت اور شہرت اس بات کی متقاضی تھی کہ اسے میرے موکل کے بائیں ہاتھ پر پہلی کرسی پر جگہ دی جائے پھر اس چٹنی کو ایک خاص قسم کے گوشت کے پارچوں کے ساتھ مہمانوں کے سامنے ڈنر کی ابتدا کے طور پر پیش کیا گیا۔ ایسے ہی گوشت کے پارچے تھوڑی دیر میں معزز عدالت کے سامنے بھی پیش کیے جائیں گے۔ مدعوئین نے چٹنی کے ذائقے اور نفاست پر اپنی عمدہ رائے کا اظہار کیا۔ یہ چٹنی ان کو اس قدر پسند آئی کہ چند ایک نے میرے موکل کے علاوہ اس چٹنی کا جام صحت بھی تجویز کردیا اور کچھ لوگوں نے حیرت انگیز لہجے میں میرے موکل سے دریافت بھی کیا کہ یہ کس طریقے سے اور کن کن اجزائے ترکیبی سے بنائی گئی ہے۔ میرا موکل مسکرا مسکرا کر ان کی پسندیدگی کا شکریہ ادا کرتا رہا لیکن اس نے کسی کو اس راز سے آگاہ نہیں کیا' وہ لوگ اندازہ لگاتے رہے کہ اس میں کون سی نئی چیز ڈالی گئی ہے اور کون کون سی چیزوں میں کمی بیشی کی گئی ہے۔ لیکن یہ اندازہ انہیں حقیقت سے آگاہ نہ کرسکے۔

اس کے بعد میرا موکل اٹھ کر باورچی خانے میں گیا تاکہ دوسرے کھانوں کی تیاری کے آخری مراحل کی نگرانی کرے۔ یہ شخص ولوبی بڑی مکاری سے گفتگو کا بہانہ کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ اس سے قبل کہ میرے موکل کو اس کے اصل ارادوں کا علم ہوسکے' اس شخص نے "ڈاکلوس چٹنی" کی وہ دیگچی دیکھ لی جس میں کچھ مقدار بچ رہی تھی اور وہیں دیگچی کے پاس وہ تمام اشیاء بکھری ہوئی تھیں جن سے چٹنی تیار ہوتی تھی۔ ولوبی ان سب چیزوں پر گہری نظر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ میرا موکل بے حد پریشان ہوا' لیکن خالص فرانسیسی اخلاق سے کام لیتے ہوئے وہ چپ رہا اور اس نے دوسرے کھانے بھجوانے کا حکم خانساماں کو دے کر دوبارہ میز پر اپنی نشست سنبھال لی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس شخص ولوبی نے جو کہ امریکی روایات کے مطابق نشے میں دھت تھا' جھک کر میرے موکل کے کان میں وہ افسوسناک اور بھیانک الفاظ کہے۔ "ڈاکلوس ڈیئر اگلے بدھ کو میں تمہیں ڈنر پر بلا رہا ہوں یہی چٹنی تمہیں وہاں بھی نظر آئے گی۔" اور یہ کہہ کر ولوبی نے ان تین خاص اجزا کے نام لیے جنہیں چٹنی میں استعمال کیا گیا تھا اور جن کی شیشیاں وہ باورچی خانے میں تھوڑی دیر پہلے دیکھ کر آیا تھا۔ اپنا فقرہ مکمل کرنے کے بعد ولوبی مسکرانے لگا۔

باشمیل یہاں تک کہہ کر چند لمحے چپ رہا حتیٰ کہ صورت حال کی نزاکت پوری طرح فاضل جج اور ممبران جیوری کی سمجھ میں آگئی۔

"مائی لارڈ...... میرے معزز وکیل نے فوج میں بھی ملازمت کی ہے جہاں اسے پھرتی سے سوچنے اور عمل کرنے کی خاص تربیت دی گئی تھی۔ ابھی ولوبی نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ ڈاکلوس نے نتائج کا پوری طرح اندازہ کرلیا۔ اس نے اس کربناک منظر کا نقشہ ذہن میں کھینچا جب یہ شخص ولوبی جسے اس چٹنی کے اجزا کی صحیح مقدار کا کوئی اندازہ نہیں تھا ایک بدذائقہ

اور بدشکل سا ملغوبہ بنا کر اسے ڈاکلوس چٹنی کا نام دینے کی جسارت کرے گا اور اس طرح اس کی ساری محنت اور فرانس کا وقار خاک میں مل جائے گا۔

"جناب والا! کسی ذہن سے کوئی بات محو کردینا ناممکن ہے' دلوبی کو جو کچھ معلوم ہوچکا تھا وہ اس سے واپس نہ لیا جاسکتا تھا اور میرے موکل نے ان حالات میں عین وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ یہ مقدس اور عظیم کام کرتے ہوئے کتنے بڑے خطرے سے دوچار ہے لیکن اس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کام کیا اور وہ زبان ہمیشہ کے لیے خاموش کردی جو اسے اور فرانس کو تباہ کرسکتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ اس سے واقف ہیں۔ خوش قسمتی سے ڈاکلوس وہاں کے بدذوق اور ابلی غذائیں کھانے والے نام نہاد انصاف پسندوں کے چنگل سے بچ کر یہاں تک آ پہنچا۔ اس کی زندگی بچنے کی خوشی سے زیادہ مجھے اس چٹنی بنانے کی ترکیب کے بچ جانے کی خوشی ہے۔ میں ان تفصیلات میں جا کر عدالت کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا کہ ڈاکلوس نے فرانس تک پہنچنے میں کس طرح کامیابی حاصل کی یہی بہت ہے کہ یہاں پہنچتے ہی اس نے اپنا اصل نام دوبارہ اختیار کرلیا کیونکہ اسے اپنے حق بجانب ہونے کا پورا یقین تھا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا' وہ صرف اس جھوٹے الزام سے اپنی بریت چاہتا ہے اور انصاف کا خواہش مند ہے' اسے مجرم قرار دینا فرانس کے لیے باعث توہین ہوگا۔ وہ فرانس کا قومی ہیرو ہے اور بہترین سلوک کا مستحق۔"

باشمیل کی تقریر ختم ہوئی تو جج نے کہا کہ اب یہ ضروری ہوچکا ہے کہ عدالت کے سامنے "ڈاکلوس چٹنی" پیش کی جائے تا کہ انصاف کے تقاضے پورے ہوسکیں۔ ایک ٹرالی پر پکانے کے برتن اور بہت سی چیزیں جن سے چٹنی تیار ہوتی ہے' سجا کر عدالت کے سامنے لائے گئے۔ ڈاکلوس سفید ایپرن باندھے آگے بڑھا اور تعظیم کے بعد بغیر کچھ بولے اپنے مشاق ہاتھوں سے چٹنی بنانے کا نازک کام کرنے لگا۔ ایک پلیٹ میں روسٹ کیے ہوئے گوشت کے پتلے پتلے پارچے سجا کر پہلے ہی جج صاحب اور ممبران جیوری کی میز پر رکھے جاچکے تھے اور یہ لوگ ڈاکلوس کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ان پارچوں پر بھی بیتابی کی نظر ڈال رہے تھے۔ انہیں ڈاکلوس چٹنی کے جلد از جلد تیار ہونے کا شدت کے ساتھ انتظار تھا لیکن ڈاکلوس دنیا ومافیہا سے بے خبر بے حد اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنا کام کررہا تھا اور بنے تلے ہاتھوں سے وہ مختلف مصالحہ جات اٹھا کر دیگچی میں مطلوبہ مقدار کے مصالحے ڈال رہا تھا۔ ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر اس نے ایک چھوٹا سا لفافہ کھولا اور اس میں سے تین شیشیاں نکالیں اور وہ سب دیگچی میں خالی کردیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے آگ بجھادی اور پورے پینتالیس سیکنڈ تک چٹنی کو ٹھنڈا ہونے دیا اور بالآخر اسے ایک نفیس ڈش میں ڈال کر جج اور ممبران جیوری کے سامنے مودبانہ طریقے سے پیش کردیا۔ جیسے جیسے یہ لوگ گوشت کے پارچوں پر یہ چٹنی لگا کر اس کے ذائقے سے لطف اندوز ہورہے تھے دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہورہا تھا کہ ڈاکلوس کے لیے ان کے چہروں پر احترام اور قدر کے جذبات نمودار ہورہے ہیں۔ یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ باشمیل یہ مقدمہ جیت جائے گا۔

فیصلہ سنانے سے پہلے عدالت کا اجلاس تھوڑی دیر کے لیے برخاست ہوگیا۔ باشمیل سکون سے

فیصلے کا منتظر تھا۔ اسے اپنی فتح کا یقین ہوچکا تھا کیونکہ خوش خوراک اور باذوق جج اور جیوری کے اراکین کے لیے اس کے برعکس فیصلہ کرنا اپنے نام پر دھبہ لگانے کے مترادف تھا ایسے عظیم فنکار کو سزا دے کر وہ نہ صرف اس چٹنی سے آئندہ کبھی لطف اندوز نہ ہوسکے بلکہ فرانس کے زیادہ تر لوگوں کی نظروں میں وہ مطعون معتوب ٹھہرتے۔ باشمیل اندر ہی اندر اس بات پر بھی خوش تھا کہ وہ بڑی حد تک ڈاکلوس چٹنی بنانے کی ترکیب سے واقف ہوچکا تھا۔ ڈاکلوس سے بات کرنے کے بہانے وہ عین اس وقت اس کے قریب گیا تھا جب اس نے لفافے میں سے تین شیشیاں نکالی تھیں اور باشمیل ان تینوں اجزائے ترکیبی کو پہچان گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ججوں نے اپنا فیصلہ سنادیا۔ عدالت نے قومی مفاد اور فن کے تقدس کی بنا پر فیصلہ دیا تھا کہ امریکی حکومت امریکی قوانین کے لیے تمام تر احترام رکھنے کے باوجود اس شخص کو' جسے امریکہ میں بدقسمتی سے مجرم سمجھا جارہا تھا۔ امریکہ کے حوالے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دونوں ممالک کے رہن سہن اور روایات میں بنیادی تضادات موجود ہیں اور کسی ایسے ملک میں فرانس کے اس عظیم فنکار سے انصاف کیے جانے کی توقع ہرگز نہیں ہوسکتی جہاں آملیٹ میں بناسپتی استعمال کیا جاتا ہو اور جہاں کے لوگ کالی مرچ اور سرخ مرچ کے ذائقے میں کوئی فرق اور امتیاز روا نہیں رکھتے۔

آگے چل کر فیصلے میں یہ بھی کہا گیا تھا" اس کے علاوہ مقتول دلوبی نے بھی جرم کیا تھا' وہ ایک نادر اور قیمتی ترکیب کی چوری کا مجرم تھا اس طرح کے چور کو ہلاک کرنا قانون کی نگاہ میں عین وہی حیثیت رکھتا ہے جیسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کسی چور کو گولی ماردینا۔ بلکہ دلوبی نے ایک عام چور کی نسبت کہیں زیادہ خطرناک جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ چنانچہ، ہم امریکی حکومت کی یہ درخواست رد کرتے ہیں کہ مسٹر ڈاکلوس کو ان کے حوالے کیا جائے۔"

کمرہ عدالت میں موجود تماشائیوں نے پرزور تالیاں بجائیں۔ امریکی اتاشی تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔ باشمیل نے ڈاکلوس کو گلے لگالیا۔

اگلی صبح کوئی دس بجے کے قریب ایڈوکیٹ باشمیل نے اپنے دفتر کے اسٹاف سے کہا کہ وہ کسی اہم کام سے چند گھنٹوں کے لیے باہر جارہا ہے۔ وہ دفتر سے سیدھا اپنے گھر پہنچا اور گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھا باورچی خانے میں چلا گیا۔ اس نے ایک میز پر وہ تمام اشیاء اکٹھی کیں جن سے "ڈاکلوس چٹنی" تیار ہوتی تھی چند لمحوں بعد وہ چولہا جلا کر اپنے کام میں مصروف ہوچکا تھا۔ اس نے ایک الماری کا تالا کھول کر اندر سے ویسی ہی تین چھوٹی چھوٹی شیشیاں نکالیں جو اس نے ڈاکلوس کے پاس دیکھی تھیں اور جنہیں وہ کل عدالت سے واپسی پر خرید لایا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ بالکل ڈاکلوس جیسی چٹنی تیار کرسکے گا کیونکہ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ان تین شیشیوں میں سے ہر شے کتنی کتنی مقدار میں ڈالنی ہوگی لیکن اس نے متواتر کوشش کا ارادہ کرلیا تھا۔ بار بار کوشش کرنے اور تینوں اشیاء کی مقدار بتدریج گھٹانے بڑھانے سے بالآخر وہ بالکل ہی ویسی چٹنی بنانے کے بارے میں پرامید تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ڈاکلوس ایک مہینے کے لیے اپنے آبائی قصبے ہی میں رہے گا۔ اس لیے اس عرصے میں وہ لگاتار کوشش کرکے ویسی ہی چٹنی بنانے میں کامیاب ہوسکتا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ عدالت کے صدر کو اس چٹنی کی ایک بوتل پیش کرکے اسے

حیران کردے گا۔ اس کے بعد اپنے چند معاملات میں عدالت کے صدر کی حمایت حاصل کرنا مشکل نہ رہے گا۔

☆☆☆

پہلی مرتبہ اس نے ایک شیشی میں سے نصف چمچہ دوسری میں سے چوتھائی چمچہ ڈالا۔ نہ جانے ڈاکلوس نے تیسری شیشی میں سے کتنی مقدار میں چیز ڈالی تھی؟ یہ سب تو اسے تجربے سے معلوم ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے تیسری شیشی میں سے ایک قطرہ اس چیز کا ڈال دیا۔ لیکن جو چٹنی تیار ہوئی اس کا ذائقہ کوئی خاص نہ تھا۔ دوبارہ کوشش کی جانی چاہیے۔ سہ بارہ...... بار بار...... نہ جانے وہ کب تک اسی طرح اپنے کام میں محو رہا لیکن تناسب اب بھی درست نہ تھا۔ ہر مرتبہ مایوس ہو کر وہ نئے سرے سے کام شروع کر دیتا اور اس عالم میں اسے جب اچانک اپنے قریب کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ سے چمچہ گر گیا اور پھر اسے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو مسٹر باشمیل۔“

یہ ڈاکلوس تھا جسے اس وقت تک اپنے آبائی قصبے میں ہونا چاہیے تھا اور اب ڈاکلوس، باشمیل کے اور بھی قریب آچکا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ نئی ٹائی اور نئے بوٹ پہن رکھے تھے اس کی بغل میں کوئی لمبی سی چیز کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی۔

”میں ابھی اسٹیشن کی طرف ہی جارہا تھا کہ......“ ڈاکلوس نے اپنے اسی اکھڑ لہجے میں کہا جو باشمیل جیسے اعلیٰ سوسائٹی کے فرد کے لیے ناپسندیدہ تھا۔ ”میں صرف آپ سے یہ کہنے آیا تھا کہ آپ کی فیس میں ایک ہفتے کے بعد وہیں سے روانہ کردوں گا۔ اور ہاں...... یہ دیکھیے تو، میں نے آج کیا شے خریدی ہے۔“ اس نے بغل سے وہ لمبی سی چیز نکال کر کاغذ ہٹا دیا۔ یہ ایک چمکتی ہوئی لمبی چھری تھی۔

”میں اسے سوفرانک میں خرید کر لایا ہوں، آپ کے خیال میں زیادہ مہنگی تو نہیں ہے؟ اور یقین کیجیے مسٹر باشمیل کہ یہ چھری بالکل ویسی ہی ہے جو میں نے اس کم بخت دلوبی کا خاتمہ کرنے میں ضائع کردی تھی۔ وہ میرے کام ہی کی نہ رہی تھی۔ اس لیے مجبوراً لینی پڑی۔“

باشمیل کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ اب ڈاکلوس کی نگاہ میز پر سجی ہوئی اشیاء پر جا پڑی تھی جن میں تین چھوٹی چھوٹی شیشیاں بھی نمایاں طور پر نظر آرہی تھیں، اب ڈاکلوس کے لہجے میں اچانک تبدیلی آگئی۔

”ہوں تو مسٹر باشمیل...... تم بھی تجربات میں مصروف ہو، تم بھی یہی چٹنی تیار کرنے کے چکر میں ہو؟ بہت خوب...... لیکن تم نے ایک غلطی کی ہے وہ جو سرخ رنگ کی چھوٹی شیشی ہے نا؟ اس میں سے تو میں چٹنی میں کچھ نہیں ڈالتا تھا، وہ صرف عام لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے دوسری شیشیوں کے ساتھ رکھ دیا کرتا تھا سمجھے؟ اب تمہیں چٹنی تیار کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہوچکا ہے، دونوں شیشیوں میں سے ایک چمچہ ڈالا جاتا ہے اور تیسری میں سے کچھ نہیں ڈالا جاتا۔ لیکن اب تم آسمان پر ہی یہ چٹنی تیار کرو گے۔“

جب ڈاکلوس چھری اٹھائے باشمیل کی طرف بڑھ رہا تھا تو وہ عدالت کے فیصلے کے یہ الفاظ بلند آواز سے دہرا رہا تھا۔

”اس طرح کے چور کو ہلاک کرنا قانون کی نگاہ میں عین وہی حیثیت رکھتا ہے جیسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کسی چور کو گولی مار دینا۔“

❁

تمغہ شجاعت

فوزیہ ناہید

جذبے کسی خطے رنگ نسل اور صنف کے محتاج نہیں ہوتے یہ اچانک دل میں جنم لیتے ہیں اور تن آور درخت بن کر پورے ماحول کو اپنی ٹھنڈی چھاؤں تلے سمیٹ لیتے ہیں۔

محاذ جنگ پر ایک فوجی اور اک بے زبان کی محبت کا احوال

فوجیوں کو وہ اس مینشن کے ایک بیڈروم میں ملی جس پر انہوں نے تین دن کی مسلسل لڑائی کے بعد قبضہ کیا تھا کسی کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ شبانہ روز گولہ باری اور فائرنگ کے باوجود اندر کوئی زندہ بچ گیا ہوگا۔ ہوا بھی یہی...... جب فاتحین کا پہلا دستہ بھرا مار کر اندر داخل ہوا تو ہر طرف دشمنوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف گنر تھا جس کے سینے پر مارٹر کا مہلک گولہ لگا تھا۔ دوسری طرف بوریوں کی آڑ میں پڑی ہوئی ان گنت لاشیں پہلا دستہ ابھی ان لاشوں کو گھسیٹ کر ایک طرف ڈال رہا تھا کہ دوسرا دستہ اندر آیا اور اس نے کمروں کی تلاشی لینی شروع کردی۔ تب وہ ایک ایسے کمرے کے نفیس بیڈ پر لیٹی ہوئی ملی جو گولہ باری میں تباہ ہونے سے بچ گیا تھا۔

اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اور انہیں دیکھ کر وہ خوف سے بیڈ میں سمٹ گئی۔ اس کی گہری بھوری آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہوئی اور وہ بیڈ کی پشت گاہ تک چلی گئی۔ اس نے خود کو کمبل میں چھپانا چاہا مگر ناکام رہی اور جونہی ایک بہت زیادہ بے چین فوجی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے تو وہ چلا اٹھی۔

”میاؤں...... میاؤں......!“

وہ سب یکبارگی ہنسنے لگے تو اس موٹی اور خوب صورت بلی کا خوف بھی قدرے دور ہوگیا۔ انہوں نے اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا جو کچھ دیر قبل کمانڈنگ آفیسر بریفنگ کے لیے استعمال کرچکا تھا۔ وہ ان سب کو اپنی چمکدار گول گول آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اس طرح اپنے پنجے چاٹنے لگے جیسے قیلولہ کررہی ہو اور جیسے اسے اِردگرد تباہی کا کوئی اندازہ ہی نہ ہو۔

فوجی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے لیکن انہیں جب بھی فرصت ملی وہ اس کے گرد آ کر ضرور بیٹھ گئے وہ ان کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بلی نے جنگی ماحول میں ان کی اعصابی کشیدگی کو بہت کم کردیا تھا۔

وہ اسے دیکھ دیکھ کر ہنستے رہے جبکہ وہ خاموشی سے بیٹھی رہی کچھ اس طرح جیسے وہ ان کے قہقہوں سے خود بھی لطف اندوز ہورہی ہو۔

پھر اچانک کارپول رینڈی علاقے میں گھوم کر واپس آیا تو نجانے کیوں وہ لپک کر اس کی طرف دوڑ پڑی دیکھنے والوں کو ایسا لگا جیسے رینڈی ہی نے اسے پال پوس کر جوان کیا ہو بلی کے انداز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا وہ رینڈی کے گرد اور کیچڑ آلود پیروں سے لپٹ گئی۔ کارپول نے مسکراتے ہوئے اسے اٹھا کر پیار کیا تو سب بے ساختہ طور پر قہقہے لگانے لگے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے رینڈی جیسے بد صورت آدمی سے اظہار محبت کیا تھا۔

"کیٹی۔" ایک سارجنٹ نے بلی کو پچکارتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس آؤ‘ ہم تمہیں بی کمپنی کی ملکہ بنا کر رکھیں گے۔" سارجنٹ نے بلی کے ریشمیں بدن پر ہاتھ رکھنے کی بھی کوشش کی تھی مگر وہ میاؤں کر کے رینڈی سے بری طرح چمٹ گئی جیسے کوئی برسوں بعد کسی سے ملا ہو رینڈی نے اسے اپنے کندھے پر بٹھا لیا تو فاتحانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس وقت تمام لوگوں کو وہ مسکراتی ہوئی لگی۔

"دیکھو کیا کہہ رہی ہے؟" ایک رنگروٹ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "کہہ رہی ہے کہ تم سب میری رعایا ہو اور کارپورل رینڈی میرے سر کا تاج ہے۔"

اس پر اتنا زوردار قہقہہ پڑا کہ جو کبوتر گولہ باری بند ہونے کے بعد واپس آ گئے تھے۔ ایک بار پھر پھرا مار کر اڑ گئے۔

اس روز کے بعد سے وہ رینڈی کے ساتھ سونے اور کھانے پینے لگی۔ اگر کوئی اسے اپنے پاس سے کھلانے کی کوشش کرتا تو وہ دوسری طرف منہ پھیر لیتی۔ بی کمپنی کے تقریباً ہر شخص نے حتیٰ کہ باورچی نے بھی اسے اپنانے کی کوشش کی مگر ہر شخص ناکام رہا۔ ایک مرتبہ جب باورچی نے اسے پیالے میں دودھ پلانے پر اصرار کیا تو اس نے پنجہ مار کر پیالہ الٹ دیا اور سارا دودھ بہہ گیا۔ لہٰذا اس کے بعد لوگوں نے اس کو لبھانے کی کوششیں ترک کر دیں حالانکہ اب بھی بہت سے یہی چاہتے تھے کہ وہ ان کی گود میں بھی آ کر بیٹھے۔

رینڈی کے لیے بلی کی محبت بڑا انوکھا تجربہ ثابت ہوئی۔ وہ کسی ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ جب بھی اسے وقت ملتا‘ وہ اس کے ریشمیں بالوں کو صاف کرتا تھا۔ اس کو روزانہ نہلاتا تھا اور اپنے محدود راشن کا بڑا حصہ کیٹی کی نذر کر دیتا تھا۔ بعض اوقات اسے خود بھوکا رہنا پڑتا تھا لیکن وہ کیٹی کو بھوکا نہیں رکھتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ بلی کا سارا حسن اس کی صحت اور فربہی میں تھا اور رینڈی کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر کیٹی کو ڈھنگ سے کھانا نہ ملا تو وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جائے گی۔

رینڈی جو پہلے اپنی بدصورتی کی وجہ سے احساس محرومی کا شکار تھا آہستہ آہستہ اس لعنت سے نجات حاصل کرنے لگا۔ وہ دس بھائی بہنوں میں چوتھے نمبر پر اور سب سے بدہیبت تھا اور کیٹی سے قبل کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

دن گزرتے رہے‘ اعلیٰ حکام کی ہدایت کے مطابق پورے علاقے پر جلد ہی کنٹرول مکمل کر لیا گیا اور جب پوزیشن مستحکم ہو گئی تو یہ نیا حکم آیا کہ بی کمپنی کو مزید پیش قدمی کر کے اچانک حملے میں استعمال کیا جائے تاکہ بیس میل دور گھنے جنگل میں دشمن کے ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کیا جا سکے۔

کمانڈنگ آفیسر نے فوجی حکمت عملی کی وضاحت کے لیے ایک لمبی تقریر کرنے کے بعد کارپورل رینڈی کی طرف دیکھا اور پھر بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ مشن توقعات کے برخلاف بہت مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی ایسی چیز ساتھ نہیں جائے گی جو فوجی امور سے توجہ ہٹانے کا باعث بنے کیٹی کی موجودگی پوری کمپنی کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دے گی لہٰذا بلی کو یہیں چھوڑ کر جانا پڑے گا اگر وہ ساتھ آئی یا اس نے کمپنی کا تعاقب کیا تو اسے دیکھتے ہی گولی ماردی جائے گی اور ایسا نہ کرنے والے کورٹ مارشل کیا جائے گا۔"

رینڈی کے لیے یہ پابندی بہت کربناک تھی۔ لیکن فوجی ضابطوں کے آگے وہ ہی نہیں بلکہ سی او بھی مجبور تھا۔

کمپنی کی روانگی سے قبل‘ رینڈی نے جی بھر کر کیٹی کو پیار کیا اور پھر اسے ایچ کمپنی کے میس میں لے آیا جہاں بلی کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ کیٹی ہی کی طرح کے ایک موٹے سے باورچی نے فوراً اسے گود لینے کا اعلان کر دیا۔

کیٹی سے جدائی کے غم کی شدت کا احساس صرف رینڈی کو ہی ہو سکتا تھا لیکن خود کیٹی کی حالت ابتر تھی شاید اس کی کسی حس نے خبردار کر دیا تھا کہ اس کا مالک اسے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ لہٰذا جب رینڈی بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا واپس چلا تو اسے اداس نظروں سے دیکھتی رہی۔ رینڈی کو احساس تھا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اسے پلٹ کر دیکھ سکتا۔ وہ چلتا رہا اور پھر اس نے تقریباً دوڑتے ہوئے باقی فیصلہ طے کیا۔

☆......☆☆......☆

تاریکی کسی سیاہ پیراشوٹ کی طرح جنگل میں پھیلی ہوئی تھی۔ رینڈی سو رہا تھا اس کے خراٹے جھینگروں کی آواز میں مل کر عجیب سی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ اس کے قریب کئی اور فوجی سو رہے تھے۔

پھر دفعتاً رینڈی کی آنکھ کھل گئی۔

کوئی نرم چیز اس کے گال پر تھی اور اس کی خندق میں بلی کی خرخراہٹ گونج رہی تھی۔

وہ چونک پڑا یہ خواب بہرحال نہیں تھا۔

کیٹی اس کے کندھے پر لیٹی ہوئی تھی۔

وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ مگر اسی لمحے اسے کمانڈنگ آفیسر کا حکم یاد آیا کہ بلی اگر محاذ پر نظر آئی تو اسے گولی ماردی جائے گی۔

وہ سمجھ گیا کہ کیٹی یہاں کس طرح پہنچی ہے۔ کمپنی

جواہر ریزے

i) تینوں کو یاد رکھو۔ نصیحت‘ احسان‘ موت۔

ii) تینوں کا احترام کرو۔ استاد‘ والدین‘ قانون۔

iii) تینوں پر ایمان رکھو۔ خدا‘ رسول‘ قیامت۔

iv) تینوں کی کوشش کرو۔ نماز‘ جہاد‘ رزق حلال۔

v) تینوں کے لئے لڑو۔ قوم‘ ملک‘ حق۔

vi) تینوں سے دور رہو۔ شیطان‘ جھوٹ‘ چوری۔

(بینظیر مغل‘ چمبڑ سندھ)

سنہرے حروف

☆ محبت بے سبب نہیں ہوتی۔ کبھی اس کا سبب انسان کی کوئی خواہش ہوتی ہے‘ کبھی کسی پر ترس کھا کر محبت کی جاتی ہے اور کبھی انسان محبت کی طلب میں محبت کرتا ہے۔

☆ اپنے دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھو کیونکہ بعض خوشیاں دستک دینے کی قائل نہیں ہوتیں۔

☆ ایک مکمل اور خوشگوار زندگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ تمہارا ساتھی اپنی یادوں اور دعاؤں میں تمہیں کتنا قریب رکھتا ہے۔

(عدنان رفیع الحق......کراچی)

کچھ کھٹی میٹھی باتیں

☆ اگر آپ کو کہیں گہرا زخم ہو تو اس میں سرخ مرچیں اور نمک ڈالیں۔

☆ ہمیشہ مسکراتے نہیں بلکہ روتے ہیں۔

☆ اگر رات کو لائٹ چلی جائے اور آپ کو ڈر لگے تو آپ زور زور سے چلانا شروع کر دیں۔

☆ آج کا کام کل پر نہیں بلکہ پرسوں پر چھوڑ دو۔

☆ تین چیزوں کا استعمال نہ کریں۔ دماغ‘ کان‘ ہاتھوں کا۔

(مہرین‘ چوٹالہ)

کی روانگی کے موقع پر وہ یقیناً یاچ کمپنی والوں کی نظروں سے بچ کر باہر آ گئی ہوگی اور پھر اس نے بیس میل کے دشوار گزار اور دلدلی علاقے میں کمپنی کا تعاقب کیا ہوگا۔ صرف رینڈی کے پاس رہنے کے لیے رینڈی کے ہاتھوں سے کھانا کھانے کے لیے مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صبح ہوتے ہی جس کی بھی نظر کیٹی پر پڑے گی۔ وہ اسے گولی مار دے گا۔

رینڈی ایک المیے سے دوچار ہوگیا۔

کیٹی کو ایچ کمپنی کے علاقے میں واپس لے جانا۔ فوج سے فرار کے مترادف ہوتا اور اسے دھتکار کر بھگا دینا ظلم کی انتہا ہوتی۔

وہ اس کے گال چاٹنے لگی۔ بلی نے اگلے دونوں پنجے اس کے کندھے پر رکھ دیے اور اس کی پیشانی سے منہ رگڑنے لگی۔ وہ بھوکی تھی۔

تب ہی رینڈی کو ایک خیال آیا۔

''اگر کیٹی کو بچانا ہے تو اسے کھانا مت دو۔'' اس نے بڑے کرب سے فیصلہ کیا۔ یہ بھوک سے تنگ آ کر ایچ کمپنی کے باورچی کے پاس واپس چلی جائے گی۔

کیٹی نے ایک بار میاؤں کی آواز نکالی مگر رینڈی کی ششں کا مطلب سمجھ کر وہ خاموش ہوگئی اس کی میاؤں میاؤں سن کر دوسروں کے بے دار ہونے کا خطرہ تھا۔

''میرے پاس تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کیٹی جاؤ، گھر واپس چلی جاؤ۔'' رینڈی نے دھیرے سے کہا مگر اسے یقین نہیں تھا کہ بلی اس کے کہنے پر عمل کرے گی تاہم وہ فوراً اچھل کر ایک طرف ہوگئی اور پھر خندق سے باہر نکل گئی۔

جب صبح ہوئی تو کیٹی کسی کو بھی نظر نہ آئی۔

☆......☆☆......☆

لیکن تیسری رات وہ پھر آ گئی اس نے اپنے بدن کو رینڈی کے پیروں پر رگڑا اور جب اس کی آواز نکلی تو رینڈی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ یہ انتہائی نحیف میاؤں تھی پہلی رات اندھیرے کی وجہ سے وہ بلی کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ مگر اب اس نے ٹارچ اٹھا کر بڑی احتیاط سے جلائی، اور کانپ کر رہ گیا۔

وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ اس کے ریشمیں بدن پر گرد اور کیچڑ کا غلاف چڑھ چکا تھا۔ اس کے پنجے خون آلود ہو چکے تھے اور اس کی آنکھیں بجھ چکی تھیں۔

ان آنکھوں میں خفگی نہ تھی صرف درخواست تھی۔

یہ التجا تھی کہ مجھے اپنے آپ سے جدا مت کرو۔

رینڈی نے سب کچھ بھول کر بچے کھچے کھانے کا ٹن کھولا جسے دیکھ کر بلی ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

مگر اچانک ہی رینڈی کو خیال آیا کہ وہ اسے کھانا کھلا کر اس کی موت کے پروانے پر دستخط کردے گا۔

وہ غصے اور بے چارگی سے روہانسا ہوگیا۔ ''بھاگ جاؤ۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا مگر بلی اس مرتبہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ رینڈی نے ٹارچ اس کی کمر پر دے ماری۔ ٹارچ بجھ گئی اور کیٹی پر دیر تک بے حس و حرکت پڑی رہی اور پھر سی کی آواز کے ساتھ اٹھ کر بھاگ گئی۔

اگلی شب نہ تو بلی آئی اور نہ ہی رینڈی سو سکا وہ خندق میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے رہ رہ کر بلی پر اپنا ظلم یاد آنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

☆......☆☆......☆

پانچویں روز بی کمپنی کو بڑی احتیاط سے پیش قدمی کا حکم ملا۔ تمام جوان دبے قدموں دن بھر آگے بڑھتے رہے اور جب انہیں پڑاؤ کا حکم ملا تو معلوم ہوا کہ وہ انتہائی خطرناک علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔

اب یہاں پل پل بھاری ہونے لگا۔

رینڈی اور اس کے ساتھی مارٹن کو سی او نے طلب کر کے علاقے کی صورت حال سمجھائی اور حکم دیا کہ دونوں آگے جا کر اسکاؤٹنگ کے فرائض انجام دیں اور جاپانی ہیڈ کوارٹر پر نظر رکھیں۔

یہ کام بہت مشکل تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ جاپانی کتنے خونخوار اور چوکس ہوتے ہیں۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ اگر ان پر جاپانیوں کی نظر پڑ گئی تو زندہ بچ کر واپس آنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوگا۔

مگر وہ فوجی تھے انہوں نے یہ چیلنج بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔

ایک گھنٹے تک گھٹنوں کے بل چلتے اور رینگتے ہوئے وہ آگے بڑھتے رہے انہوں نے اس دلدلی علاقے کو بھی پار کرلیا جو جاپانی کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کی پہلی اور ناقابل تسخیر دفاعی لائن کہا جاتا تھا۔ مگر راستے میں دشمن سے ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ ان کے اعصاب مکمل خاموشی اور بے عملی کے باعث تڑخنے لگے اور انہوں نے اپنی رفتار تیز تر کرلی تاکہ وہ جلد از جلد وہاں تک پہنچ جائیں۔

پھر اچانک درختوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

وہ ایک میدان میں نکل آئے اور ان کی نظریں سامنے پڑی ہوئی جھونپڑیوں پر جم گئیں۔

یہی دشمن کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

انہوں نے جھونپڑیوں کی طرف دیکھا اور اندھیرے کے باوجود یہ اندازہ لگالیا کہ دشمن انہیں خالی کرچکا ہے پانی کے کاغذی گلاس دور دور تک بکھرے ہوئے تھے اور ناکارہ اشیاء کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک درخت پر کسی جاپانی فوجی کی ایک قمیص لٹک رہی تھی۔

وہ دبے قدموں آگے بڑھے اور ایک ایسی جھونپڑی کے قریب پہنچ گئے۔ جس کے باہر ایک میز پر کھانے پینے کا سامان رکھا ہوا تھا۔

''اوہ، جاپانی اتنے بزدل تو نہیں کہ کھانا چھوڑ کر ہی فرار ہو جائیں۔'' مارٹن نے دھیرے سے کہا۔

''ممکن ہے انہیں یہ اطلاع مل گئی ہو کہ ہم دو طرفہ حملہ شروع کرنے والے ہیں۔'' رینڈی نے جواب دیا اور پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دفعتاً اس کی نظریں ایک ہیولے پر پڑیں۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ سانس رک گئی اور دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ ہیولا جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔

وہ اسے گھورتا رہا اور پھر اچانک ہیولہ سامنے آ گیا۔ رینڈی خطرے کے احساس کے باوجود خوشی سے جھوم کر رہ گیا کیٹی مسلسل اس کا تعاقب کر رہی تھی اور یہاں بھی پہنچ گئی تھی۔

اس سے قبل کہ مارٹن کی نظر کیٹی پر پڑتی وہ بھاگ کر جھونپڑی میں چلی گئی۔ مگر مارٹن اس کی ایک جھلک دیکھنے میں پھر بھی کامیاب ہوگیا۔ ''واہ...... رینڈی...... تم نے بلی کو دیکھا۔ ممکن ہے اسی کی آمد سے جاپانی ہوشیار ہوگئے ہوں۔'' پھر وہ بڑی جرأت مندی سے میز کی طرف بڑھنے لگا۔ ''چھوڑو یار کچھ کھالو، چکن بھی ہے اور بیئر کے ڈبے بھی۔''

اس سے قبل کہ مارٹن میز تک پہنچتا کیٹی زقند بھر کر میز پر چڑھ گئی۔ مارٹن نے غصے سے بل کھا کر ایک پتھر اٹھایا اور بلی کی طرف پھینک مارا۔

رینڈی کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ بلی چکن کھالے کیونکہ اتنے طویل تعاقب کا کم سے کم انعام یہی ہو سکتا تھا۔

بلی نے پتھر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو زقند بھر کر میز سے اتر گئی اور پتھر بلی کے بجائے چکن کی پلیٹ پر گر گیا۔

رینڈی اور مارٹن ایک ساتھ اچھل کر کئی قدم پیچھے گر گئے ان کے اچھلنے کی وجہ سے وہ زوردار دھماکا تھا جو پتھر گرنے کے ساتھ ہی پیدا ہوا تھا۔

دونوں دیر تک زمین پر پیٹ کے بل لیٹے رہے اور جب دھواں چھٹا تو نظریں گھما کر جھونپڑی کی طرف دیکھنے لگے۔

اب وہاں نہ تو جھونپڑی تھی اور نہ ہی میز۔

جھونپڑی کے تختوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔

''بوبی ٹریپ'' رینڈی نے مارٹن کی بھرائی ہوئی آواز سنی۔ ''اگر بلی میز پر نہ چڑھتی تو ہم مر چکے ہوتے۔ رینڈی اس نے ہمیں بچالیا۔''

''ہاں۔'' رینڈی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ میز پر نہیں چڑھتی تو ہم خود چکن کی پلیٹ اٹھاتے اور اب تک گوشت کے درجنوں لوتھڑوں میں بدل چکے ہوتے۔''

''شاید دھماکے سے بلی بھی مر گئی ہو رینڈی۔''

''ممکن ہے۔'' رینڈی کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آرہے تھے۔

''اس نے اپنی قربانی دے کر ہماری جان بچالی رینڈی۔'' مارٹن کی آواز بھی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

رینڈی کوئی جواب نہ دے سکا کیونکہ اس کے گلے میں پھندے پڑنے لگے تھے وہ لیٹا رہا...... اداس...... دلگیر...... اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی اتنے کڑے دکھ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ آج اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی دنیا اجڑ گئی ہو۔ جیسے اس کا اپنا بچہ مر گیا ہو۔

''میاؤں۔''

وہ دونوں اچھل پڑے۔ یہ آواز عقب سے آئی تھی۔ انہوں نے بیک وقت ضابطہ کی خلاف ورزی کی اور اپنی اپنی ٹارچ روشن کرلی۔

وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

دھماکے کی وجہ سے رینڈی اور مارٹن کی طرح وہ بھی اچھل کر دور جا گری تھی مگر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

وہ رینڈی کی گود میں آگئی۔ مارٹن بھی اسے چومنے لگا اور پھر دونوں اسے لے کر کمپنی میں واپس آگئے۔

☆......☆☆......☆

''مزید پیش قدمی کل شروع ہوگی۔'' کمانڈنگ آفیسر نے جاپانی ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کرنے کے بعد اعلان کیا۔ ''اور اس پیش قدمی کے دوران تمام فوجی ضابطوں پر انتہائی سختی سے عمل کیا جائے گا۔ کوئی ایسی چیز ساتھ نہیں جائے گی جس سے فوجی امور متاثر ہوں صرف کیٹی کو استثنیٰ حاصل ہے لیکن اسے نظیر نہ بنایا جائے۔ کیٹی غیر معمولی بلی ہے۔ جسے ہیڈ کوارٹر سے شجاعت کا تمغہ ملنے والا ہے کیٹی کی دیکھ بھال صرف کارپورل رینڈی کرے گا۔ کوئی دوسرا اس میں دلچسپی نہیں لے گا۔ ہاں...... میں کبھی کبھی اسے گود میں ضرور لے سکتا ہوں۔ کیونکہ میں کمانڈنگ آفیسر ہوں۔''

جوانوں نے دل کھول کر زبردست قہقہہ لگایا اور سب ہی کیٹی کی طرف دیکھنے لگے جو رینڈی کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں نیلے رنگ کا ویسا ہی ربن بندھا ہوا تھا جیسا کمپنی کے جوان اپنی ٹوپیوں پر لگاتے تھے۔

وہ بڑی محبت سے رینڈی کا ہاتھ چاٹ رہی تھی۔

موت لمحہ

اسرار احمد

موت اک ایسی علامت ہے جس کے تصور سے ہی انسانوں کی اکثریت جھرجھری لے کر رہ جاتی ہے شاید ہی کوئی ہو جو خوشی سے موت سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہو لیکن اسے اپنی موت کا کوئی خوف نہیں تھا کیونکہ اس کی موت سیکڑوں افراد کی زندگی تھی۔

مغربی ادب سے انتخاب خوش ذوق قارئین کے لیے

آج اتنی گرمی کیوں ہے......؟ جانسن نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے ناگواری سے سوچا اور ایئرپورٹ ٹرمینل کی طرف بڑھتے ہوئے موسم کو برا بھلا کہنے لگا۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا اور قمیض جسم سے چپک گئی تھی۔ اس کے پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی اور اس کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے وہ اس کی شدت سے رو پڑے گا لیکن اسے ہر حال میں خود کو پرسکون رکھنا تھا۔ اس کے مشن کا یہی تقاضا تھا اور اس کا سارا دارومدار اسی پر تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے عام سے لہجے میں ایتھنز کی فلائٹ ایک سو ایک کی روانگی کا وقت معلوم کیا اور جلدی سے اپنی دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔ اچانک اسے اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا اور اس کا جسم اکڑ گیا۔ ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے ہولسٹر میں موجود ریوالور کی جانب رینگ گیا لیکن اگلے ہی لمحے ایک آواز سن کر ساکت ہوگیا۔ ''معاف کیجیے گا' مسٹر جانسن آپ کا فون ہے۔''

اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور فون کی جانب بڑھ گیا۔ دوسری طرف سے بولنے والا' کینیڈی تھا۔ ''جانسن' سنو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' جانسن کی سماعت سے اس کی آواز ٹکرائی۔ ''پل' کرٹی' پیٹر اور جونز گرفتار ہوگئے ہیں...... منصوبے کے مطابق عمل کرو...... میں نے......!''

اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہوگئی۔ بہر حال' جو کچھ بھی ہوا ہو' اسے وہ کام پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا جو آرگنائزیشن نے اس کے سپرد کیا تھا اور جس کی اسے تربیت دی گئی تھی چند لمحے کے بعد طیارے میں سوار ہو کر اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کا خوف دور ہونے لگا اور وہ پرعزم ہوتا چلا گیا۔ اسے اپنی کارروائی کا آغاز کرتے میں ایک گھنٹہ باقی تھا اور وہ جانتا تھا کہ وقت قریب آنے پر اس کا اعصابی تناؤ لوٹ آئے گا لیکن اس وقت تک وہ خود کو پرسکون رکھ سکتا تھا۔ اچانک اسے اپنی بائیں سیٹ پر ایک بچے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ ایک کھلونا پستول سے کھیل رہا تھا۔ یہ کولٹ کا اعشاریہ چار پانچ تھا۔ بچے نے ریوالور کا ٹرائیگر دبایا۔ کلک کی آواز ہوئی اور بچہ ہنس پڑا۔ ''اے مسٹر...... تم مر گئے۔'' وہ بولا۔

''جونی' تم انہیں پریشان مت کرو۔'' اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ایک نوجوان خاتون نے اس کو ڈانٹا۔ پھر جانسن کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ یہ بہت پرجوش ہو رہا ہے۔ کیونکہ آج زندگی میں پہلی بار کسی طیارے میں سوار ہوا ہے۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' جانسن نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں نے قطعی برا نہیں مانا۔''

لیکن یہ جملہ ادا کرتے کرتے اسے افسوس ہونے لگا۔

اسے بے شک برا لگا تھا اور لگنا بھی چاہیے تھا کیونکہ وہ طیارے کے کسی بھی مسافر سے رفاقت بڑھانے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ خود اس کے دو بچے تھے لیکن اس نے انہیں پچھلے دو سال سے جب سے اس کے اور برنیڈا کے درمیان طلاق ہوئی تھی' نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہی اختتام ثابت ہوا تھا۔ اس کا اور برنیڈا کا رومانس ناکامی پر ختم ہوا تھا۔ س کی وجہ ایک پارٹی میں کینیڈی سے اس کی ملاقات تھی اور پھر کینیڈی نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا اور آج وہ اس وقت کینیڈی کے حکم پر اپنے مشن کی خاطر مرنے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ اگر جونی اور اس کی ماں یہ جان جاتے کہ اس کے پاس اعشاریہ چار پانچ کے دو کولٹ ریوالور اور دو ننھے ہینڈ گرینڈ ہیں تو نہ جانے دہشت سے ان کی کیا حالت ہوتی۔

وہ اگلے چند منٹ تک جونی کی ماں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ جونی کی ماں نے اسے بتایا کہ وہ اپنے بچے جونی کے ساتھ' اپنے شوہر سے ملنے جارہی ہے جو تیل کی کسی کمپنی کا ڈائریکٹر تھا' اور جس سے وہ لوگ ایک سال سے نہیں ملے تھے۔ جانسن کو اس عورت پر رشک آنے لگا۔ اسی دوران اس نے اپنی گھڑی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اسے اپنی کارروائی شروع کرنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ اس وقت طیارہ کوہ ایلپس کے اوپر پرواز کررہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' اچانک وہ غرایا اور پھر کروٹ لے کر اس نے اپنا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھایا۔

دفعتاً طیارے کے دوسرے سرے سے کسی عورت کی چیخ سنائی دی پھر دوسری عورت چیخی' اور ایئر ہوسٹس تیزی سے کیپٹن کے کیبن کی جانب لپکی۔

''کیا بات ہے؟'' جانسن نے اس سے پوچھا۔

''ہم ہائی جیک کیے جارہے ہیں۔'' وہ دہشت سے چیخی۔

یہ ناممکن ہے۔ جانسن نے تیزی سے سوچا اور اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ چیخ کر کہہ رہا ہو۔ ''ہائی جیکر میں ہوں...... میں...... صرف میں۔ میرے سوا کوئی نہیں۔''

لیکن اس نے دیکھا نشستوں کی قطار کے بیچ میں ایک قد آور شخص کھڑا ریوالور لہراتے ہوئے مسافروں کو حکم دے رہا تھا۔ اس کی مونچھیں گھنی اور سر کے بال سنہرے اور گھنگھریالے تھے۔ جانسن نے جلدی سے اپنی پشت ہائی جیکر کی جانب کرلی اور اپنی جیکٹ کی جیب میں موجود ریوالور کو محسوس کیا۔ اچانک جونی اپنا کھلونا پستول لہراتا ہوا ہائی جیکر کی جانب بھاگا اور اس کی ماں چیخ پڑی۔ یہ حرکت ہائی جیکر کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی جانسن نے تیزی سے چھلانگ لگائی اور جونی کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اسی لمحے ہائی جیکر کے ریوالور نے شعلہ اگلا اور جانسن کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں ایک جہنم کھل گیا ہو۔ وہ منہ کے بل سامنے کی جانب گرنے لگا اور گرتے گرتے لڑکھڑاتا ہوا ہائی جیکر سے جا ٹکرایا۔ ساتھ ہی اپنا ریوالور اس کے پیٹ سے لگا کر ٹرائیگر دبا دیا۔ ہائی جیکر ایک سیٹ سے جا ٹکرایا اور پھر وہ فرش پر لڑھک کر ساکت ہوگیا۔ اس کی بے جان آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں اور روشنی اس کے چہرے کو اجاگر کررہی تھی۔ جانسن کو یہ چہرہ مانوس سا لگا۔ یہ پیٹر تھا...... مقامی گروپ کا ایک رکن جس کے بارے میں کینیڈی نے کہا تھا کہ وہ گرفتار ہوگیا ہے لیکن وہ گرفتار نہیں ہوا تھا۔ جانسن جانتا تھا کہ اس نے پیٹر کو ہلاک کردیا ہے اور اب وہ خود بھی مرنے والا ہے لیکن اسے اپنی موت کا کوئی دکھ نہیں ہورہا تھا۔ برخلاف اس کے' خوشی ہورہی تھی' کیونکہ اس نے طیارے کو اس کے بے گناہ مسافروں کو اور جونی کو بچا لیا تھا جو ایک سال کے بعد اپنے باپ سے ملنے جارہا تھا۔ یہ ایک ہیرو کی موت تھی' وہ ایک ہیرو کی موت مر رہا تھا۔

☯

قسط نمبر 22

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی تحیر خیز سلسلے وار کہانی

میں ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کا مارجن رکھتے ہوئے کوٹھی سے سرجانی ٹاؤن جانے کے لیے نکلا۔ ایک تو فاصلہ زیادہ تھا دوسرے کراچی کا ٹریفک اتنا زیادہ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ یہاں رہنے والے ہر فرد کے پاس اپنی گاڑی ہے۔

ٹریفک کے شور ہنگامے سے نجات پا کر میں تقریباً پونے چار بجے سرجانی ٹاؤن نواب کے روحانی سینٹر پہنچ گیا۔ وہاں موجود گارڈ حیرت انگیز طور پر مجھے پہچان گیا اور اس نے مجھے کار سمیت اندر آنے دیا بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس روحانی سینٹر کے اندر جو شخص بھی ایک بار داخل ہوجاتا ہے اس کی تصویر سمیت تمام بایوڈیٹا یہاں کی انتظامیہ کے پاس محفوظ ہوجاتا ہے نواب نے اس گارڈ کو پہلے ہی میرے بارے میں انفارم کردیا تھا۔ اس نے میری تصویر دیکھ لی تھی۔ اس لیے مجھے فوراً پہچان لیا اور اندر آنے دیا۔

گاڑی پارک کرنے کے لیے جگہ کی راہ نمائی اندر موجود ایک اور گارڈ نے کی۔ میں گاڑی پارک کرکے اترا تو ایک دوسرا شخص مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے وہیں کھڑا مل گیا اور اپنے ساتھ لے کر عمارت کے اس دوسرے حصے کی جانب لے کر چلا جہاں پہلے میں نہیں گیا تھا بلکہ پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے یہ حصہ دیکھا تک نہیں تھا۔ میں تو صرف اس ہال میں گیا تھا جہاں نواب کی روحانی محفل ہوتی تھی یا پھر اس کے نزدیک ایک چھوٹی رہائشی عمارت بنی تھی جہاں میں نے کچھ وقت گزارہ تھا اور کھانا وغیرہ کھایا تھا۔ اس وقت میں جہاں جارہا تھا وہ یقیناً نواب کا خاص کمرا ہوگا میں خاموشی سے اس کے ہمراہ جارہا تھا۔

ہم ایک دو منزلہ بنگلے کے اندر داخل ہوگئے یہاں بھی گیٹ پر سخت سیکیورٹی کا انتظام تھا اتنی ساری سیکیورٹی دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو اپنی موت کا کس قدر خوف ہے شاید یہ نہیں جانتا کہ جب موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آئے گا تو اس کی راہ میں کوئی بھی رکاوٹ مانع نہیں ہوگی۔

مجھے اپنے ساتھ اندر لے جا کر ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ شخص چلا گیا یہ کہہ کر کہ سرکار سائیں خود بلائیں گے آپ یہاں انتظار کریں میں اس حکم کی تعمیل کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ایک نوعمر خوب صورت لڑکا میرے لیے مشروبات لے کر آیا میں بھی گلاس ہاتھ میں اٹھا کر چسکیاں لینے لگا ڈرنک پیتے ہوئے میں اس آراستہ ڈرائنگ روم کا بھی جائزہ لیتا جارہا تھا اس کمرے کی ایک ایک چیز خود منہ سے بول رہی تھی کہ وہ کتنی قیمتی اور نایاب ہے بلاشبہ دنیا کا بہترین کلکشن یہاں موجود تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد ایک دوسرا لڑکا آیا اور کہا کہ

"سرکار سائیں نے یاد فرمایا ہے۔" میں اس کے ساتھ ہی چل دیا۔ چلتے ہوئے میں اپنے دماغ کے کمپیوٹر میں یہاں کا نقشہ فیڈ کرتا جارہا تھا۔

اس کمرے سے نکل کر ہم ایک راہ داری میں آگئے یہاں لائن میں کچھ کمرے بنے ہوئے تھے اس حصے کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں حالانکہ ایسا بالکل بھی نہیں تھا میں تو آج پہلی مرتبہ اس جگہ پر آیا تھا۔ پھر خیال آیا کہ نواب کی کلفٹن والی کوٹھی میں جس جگہ نواب کا کمرہ ہے وہ بھی اسی طرح یا اسی نقشے پر بنا ہے۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ ان دونوں جگہوں کی سیکیورٹی کا کوئی بہت ہی خاص اور ایک جیسا میکنزم ہوگا ورنہ دونوں ایک جیسے بنانے کی کوئی اور وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی۔

ایک کمرہ جس کے باہر دو سیکیورٹی گارڈ اسلحہ اٹھائے کھڑے تھے وہ شخص مجھے وہاں چھوڑ کر چلا گیا تب میں نے اپنے مخصوص انداز میں کمرے کے دروازے پر دستک دی اندر سے نواب کی بھاری آواز سنائی دی۔

"آجاؤ شمروز۔" تو میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

حسب عادت میں نے اندر پہنچ کر اسے سلام کیا اور اس نے حسب عادت اسے اگنور کردیا اور بولا۔

"تمہیں زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔ دراصل میں اپنے ایک مہمان کے ساتھ کچھ ضروری گفتگو میں مصروف تھا۔ مہمان کیا یوں سمجھ لو کہ وہ میرے معتقد اور مرید ہیں میرے بیرون ملک سے آئے ہیں ان کے مسائل بھی تو سننے تھے اور پھر انہیں حل بھی کرنا تھا۔" میں نے نواب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"ارے تم کھڑے کیوں ہو بیٹھو نا۔" مجھے کھڑا دیکھ کر نواب نے جلدی سے کہا اور ایک منقش کرسی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا تو میں اس پر بیٹھ گیا تو نواب میری جانب مسکرا کر دیکھنے لگا۔ جواب میں میں بھی انکساری کے انداز میں مسکرانے لگا۔

"تمہیں پتا ہے شمروز کہ میری یہ جگہ میرے دوسرے بندوں کے علم میں نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میرے کام والے بندے کبھی اس جگہ پر نہیں آئے یا میں نے کبھی انھیں اس جگہ نہیں بلوایا تم وہ پہلے فرد ہو جسے میں نے ملنے کے لیے بلوایا ہے۔ یہاں میں اپنے بہت ہی خاص بیرون ملک سے آئے ہوئے لوگوں سے ملاقات کرتا ہوں اور ان کے مسائل سنتا ہوں۔"

"آپ کی ذرہ نوازش ہے ورنہ میں خود کو کسی بھی قابل نہیں سمجھتا۔ خود کو آپ کے قدموں کی دھول سمجھتا ہوں۔" میں نے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے جھوٹی انکساری سے کام لیا۔

"تم کیا ہو اور کس قابل ہو یہ ہم جانتے ہیں ہم نے تو پہلی ہی ملاقات میں تمہارے اندر موجود ایک نایاب ہیرے کو پہچان لیا تھا۔ پرسوں رات تم نے اپنا

کام بہت خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے ہم تم سے بہت زیادہ خوش ہیں اور اس خوشی میں تمہیں ایک بہترین بلکہ تمہاری پسند کا انعام دینا چاہتے ہیں۔" نواب نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے چونک کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی اور وہ اپنی چمک دار آنکھیں میرے اوپر گاڑے ہوئے تھا۔

میں بوکھلا کر اٹھنے لگا تو اس نے اپنے ہاتھ کا دباؤ میرے کندھے پر برقرار رکھا اور بولا۔

"بیٹھے رہو۔" تو میں بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس پسندیدہ انعام کے بارے میں بات کررہا ہے اور انعام کی بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ اور اس کی آنکھوں کی چمک مجھے بہت کچھ سمجھا رہی تھی اور وہ مسلسل میری تعریف کرکے مجھے یہ جتلانے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ میری ذات پر کتنا اعتماد کرتا ہے اور پھر جب انسان کسی دوسرے پر اعتماد اور بھروسا کرتا ہے تو وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس کے اعتماد کو توڑا جائے اور نواب سطوت جیسا زیرک اور ہوشیار اور مکار انسان تو اپنے اعتماد کو توڑنے والے شخص کو قطعی معاف نہیں کرسکتا۔

"مجھے امید ہے شمروز کہ آج جو کام میں تمہارے سپرد کروں گا اسے بھی تم مجھ سے کوئی بھی سوال کیے بغیر کہ میں یہ کام تم ہی سے کیوں کروا رہا ہوں کس کے کہنے پر کروا رہا ہوں بلا چوں و چرا انجام دو گے جس طرح تم نے پہلے کام انجام دیا ہے تم نے کوئی تجسس کوئی ہیر پھیر نہیں کی اس سے میں واقف ہوں اس لیے کہ تمہارے کام کی نگرانی کرنے والی میری بہت سی آنکھیں ہیں۔" اس نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں یہ جملہ ادا کیا اس کے لہجے میں کوئی لوچ اور نرمی نہیں تھی بلکہ خبردار کرنے والا انداز تھا مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔

"جی۔" میں بمشکل کہہ سکا۔

"ارے تم تو گھبرا رہے ہو ریلیکس رہو یار، میں تم سے ایسا کوئی بھی کام نہیں لینے والا جو تم بآسانی نہ کرسکو کام کی انجام دہی کے بعد سب کچھ بھول جاؤ گے کہ میں نے یہاں بلالیا تھا ملاقات کی تھی اور کس کام کے لیے کہا تھا مجھے امید ہے تم اپنی یادداشت سے اسے بالکل فراموش کردو گے۔" اس نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے اپنی پیشانی پر آنے والا پسینہ پونچھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ میرے نزدیک سے ہٹ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور بولا۔

"ارے لو ان باتوں میں میں تمہارے انعام کے بارے میں تو بھول گیا۔"

"کیسا انعام سر۔ میرے ذہن میں تو ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کو پانے کی میں نے خواہش ظاہر کی ہو۔" میں نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"راکھی۔" اس نے چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"راکھی۔" میں نے انتہائی اور شدید حیرت سے کہا۔ "لیکن سر اسے پانے کی تو میں نے کبھی خواہش نہیں کی۔"

"اچھا۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تو پھر تم دونوں رات کے اندھیرے چوری چھپے کیوں ملتے ہو؟"

"چوری چھپے تو نہیں ملتے البتہ کل رات وہ ضرور میرے کمرے میں آئی تھی میری خیریت پوچھنے کے

لیئے بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ میرا ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا چوٹ زیادہ نہیں تھی اس لیے میں اسپتال نہیں گیا اور سیدھا کوٹھی پر آ گیا۔ یہاں سلیمان سے میں نے ڈریسنگ کا سامان اور چند دوائیں منگوائی تھیں۔ اسے بھی معلوم ہوگیا میرے ایکسیڈنٹ کا میں دوا کھا کر سو گیا تھا اس لیے وہ رات کو دیر سے آئی تھی کہ شاید اب میں جاگ گیا ہوں اور واقعی میں جاگ رہا تھا کیونکہ ہم اس سے پہلے تنہا گلی ساتھ گئے تھے اس سے کچھ بے تکلفی ہے اور بس۔"
میں سمجھ گیا تھا کہ اسے اس مخبر گارڈ نے راکھی کی میرے کمرے میں آمد کے بارے میں بتا دیا اس لیے میں نے اس بات کو اس سے چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔ باقی باتیں میں نے جھوٹ کہی تھیں۔
"لیکن کیا رات بھر وہ تمہارے سرہانے بیٹھ کر تمہاری تیمارداری کرتی رہی تھی میں راکھی سے اچھی طرح سے واقف ہوں اس نے تمہارے نہ چاہنے کے باوجود بھی......!"
"نہیں بخدا ایسی کوئی بات نہیں تھی ہم نے صرف باتیں کی تھیں اور باتوں باتوں کے درمیان میں دوبارہ کب نیند میں چلا گیا مجھے پتا بھی نہیں چلا اور وہ کس وقت میرے روم سے گئی میں اس بات سے بھی لاعلم ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔
"مجھے یقین نہیں آتا اس بات کا، خیر تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں، ویسے بھی اب وہ میرے کسی کام کی نہیں ہے بس میری ایک عادت ہے جو چیز کبھی میرے استعمال رہی ہو میں ناکارہ ہونے پر اسے پھینک تو دیتا ہوں لیکن کسی اور کو استعمال کے لیے نہیں دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ بھلے تمہیں راکھی میں کوئی انٹرسٹ نہ ہو لیکن اس کتیا کو تم جیسے حسین جوان میں ضرور دلچسپی ہوگی۔" نواب نے آخری جملہ غراتے ہوئے لہجے میں کہا اور میں سمجھ گیا کہ اب راکھی کی خیر نہیں ہے۔ اس نے مجھے تو چھوڑ دیا ہے لیکن اسے ضرور مزا چکھائے گا اور اگر اس نے راکھی کو کوئی سزا دی تو یہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ کیونکہ مجھے اس سے بہت مفید معلومات ملتی رہتی تھیں اور آئندہ بھی امید تھی اس لیے وہ راکھی سے اس بارے میں کوئی باز پرس نہ کرلے۔ مجھے نواب کا دل راکھی کی جانب سے صاف کرنا ہوگا یہی سوچ کر میں نے کہا۔
"مجھے آپ کی بات سن کر حیرت ہو رہی ہے سر کیونکہ راکھی نے آج تک مجھ سے اس قسم کے تعلق کو جوڑنے کی کوشش نہیں کی ہم ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح ملتے ہیں اور اس نے اپنی ہر ملاقات میں مجھ سے آپ کی بے حد تعریف کی ہے وہ آپ کی اس ڈیشنگ پرسنالٹی سے بہت زیادہ متاثر ہے میرا خیال ہے آپ اس سے کوئی بھی بات نہ کریں ورنہ وہ میرے بارے میں غلط گمان کرے گی اور سوچے گی کہ میں نے آپ سے اس کی کوئی شکایت لگائی ہے۔ ہم اچھے دوست رہیں یہی ہمارے حق میں بہتر ہے کیونکہ کبھی نہ کبھی کسی مشن میں ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت تو رہتی ہے۔" میں نے نارمل لہجے میں کہا تو نواب چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا اور بولا۔
"اچھا جانے دو راکھی کے ذکر کو اب ہم اپنے اہم موضوع پر آ جاتے ہیں کیا خیال ہے؟" اس نے سر کو جھٹک کر کہا اور بولا۔
"جی سر۔" میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔
وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا پھر بولا۔ "تم سہیل ہاشمی سے تو واقف ہی ہوگے۔"
"کون سہیل ہاشمی۔" میں نے پوچھا۔
"تم سہیل ہاشمی کو نہیں جانتے۔" اس نے ناگواری سے میری جانب دیکھا پھر بولا۔ "یہ صوبائی وزیر ہے اور ایک مذہبی جماعت کا لیڈر بھی ہے۔ اب یاد آیا......!"
"اچھا اچھا وہ سہیل ہاشمی، جی ہاں نام کی حد تو میں واقف ہوں ٹی وی وغیرہ پر شکل بھی دیکھی ہوئی ہے۔" میں نے یاد آنے پر کہا۔ "کیا ان کے پاس مجھے کام کے سلسلے میں بھیج رہے ہیں۔" میں نے پوچھا۔
"ہاں۔" اس نے کہا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "بہت ہی اہم اور خاص کام سے۔"
"فرمائیے کیا کام ہے میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی توقع پر پورا اتروں۔" میں نے کہا۔
"کوشش نہیں کام کر کے ہی لوٹنا ہے اور میں ناکامی برداشت نہیں کرتا۔" اس نے ایک دم پٹری سے اتر کر سخت لہجے میں کہا۔
"جی سر۔" میں نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔
"کل رات وہ ایک جلسہ کر رہا ہے یہ کوئی سیاسی جلسہ نہیں ہے ایک مذہبی پروگرام ہے وہاں اس کی تقریر ہے یہ پروگرام ایک پارک میں ہونے والا ہے اس کے اردگرد سیکیورٹی بہت سخت ہے پولیس بھی بھاری تعداد میں موجود ہوگی۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ ایک گولی اس کے دماغ میں اس طرح اتارنی ہے کہ وہ دوسری سانس بھی نہ لے سکے اور کسی کو تمہارے بارے میں شک بھی نہ ہو۔" نواب نے اپنی برچھی نما تیز نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ کر کہا۔
"گولی مارنی ہے لیکن کیوں؟" میرے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ پھسل گیا۔ جس کا مجھے فوراً احساس ہوگیا کہ نواب کو سوالات پسند نہیں ہیں لیکن اب کیا ہوسکتا تھا میں یہ جملہ کہہ چکا تھا میرے سوال کے جواب میں نواب نے مجھے تیز نگاہوں سے گھورا۔ چند لمحے خاموشی سے مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔
"تم بھول گئے کہ میں نے شروع میں تم سے کیا کہا تھا کہ تم یہ نہیں پوچھو گے کہ کام تم سے کون اور کیوں کروا رہا ہے اور تم اس کام کو کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے اس کو بھول جاؤ گے۔ اگر تم اسی طرح میری ہدایات کو بھولتے رہے تو ہماری اور تمہاری گاڑی زیادہ عرصہ تک ساتھ نہیں چل سکے گی۔" اس نے انتہائی بے مروتی سے کہا اور آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اس کے چہرے پر خاصے برہمی کے آثار تھے۔
"س...... سوری سر...... آئی ایم رئیلی سوری، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں ایسی غلطی کرنا تو نہیں چاہ رہا تھا بس بے ساختہ یہ جملہ منہ سے پھسل گیا۔ دراصل یہ کام میری توقع کے بالکل خلاف تھا۔" میں نے پرزور طریقے سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔
"پھر تم یہ کام کر رہے ہو نا؟" اس نے کہا۔
"میں آپ کا حکم نہیں ٹال سکتا سر۔" میں نے کہا۔
"گڈ۔" اس نے حسب عادت خوش گوار لہجے میں کہا اس کا موڈ لمحہ بھر میں ہی بدل گیا۔
"آپ مجھے جگہ بتا دیجیے میرے پاس کل رات کا ٹائم ہے میں جگہ کا سروے کر لیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کس طرح ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا ہے۔" میں نے کہا تو نواب نے مجھے اس مشہور پارک کا نام بتایا اور ساتھ میں یہ بھی کہ مجھے جن چیزوں کی ضرورت ہے یعنی اسلحہ وغیرہ وہ میں کوٹھی میں جا کر راجو سے لے لوں وہ اس سلسلے میں میری بھرپور مدد کرے گا۔
اس کے فوراً بعد مجھے نواب نے وہاں سے جانے کا حکم دے دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کام ہو جانے کے بعد اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہے یہ تو ایسی خبر ہوگی جو جنگل میں آگ کی مانند فوراً سارے شہر میں پھیل جائے گی اور ہاں تمہیں کوٹھی آنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے گلشن اقبال والے فلیٹ

میں پہنچ جانا اور سوجانا تمہارے معاوضے کی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرادی جائے گی۔
میں سرجانی ٹاؤن سے سیدھا کلفٹن آ گیا میرے سر میں شدید درد ہورہا تھا میں راستے بھر یہی سوچتا ہوا آیا کہ نواب کی اس شریف آدمی سے کیا دشمنی ہے جو اسے قتل کروا رہا ہے میں اسے قطعی مارنا نہیں چاہ رہا تھا اور دل میں دعا کر رہا تھا کہ کاش ایسا کوئی معجزہ ہوجائے کہ یا تو نواب اپنا ارادہ بدل دے یا اللہ تعالیٰ اسے بچالے ایسی کون سی ترکیب ہونی چاہیے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی نواب کو مجھ سے کوئی شکایت بھی نہ ہو اور سہیل ہاشمی بھی بچ جائے کاش وہ کل جلسہ نہ کرے یا کم از کم اس جلسہ میں شرکت ہی نہ کرے لیکن اس سے کیا ہوگا۔ نواب کسی دوسرے موقع کا انتظار کرے گا لیکن اپنے ارادے سے باز نہیں آئے گا۔ اچانک ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند میرے دماغ میں آیا میں نے روڈ کے سائیڈ میں گاڑی روکی اور جیب سے موبائل فون نکال کر سرمئی کا نمبر ملایا۔
میں نے سوچا کہ میں اس بات کی خبر سرمئی کو دے دیتا ہوں ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ذرائع استعمال کرکے سہیل ہاشمی کو خبردار کردے لیکن بار بار کال کرنے کے باوجود سرمئی نے میرا فون اٹینڈ نہیں کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے اپنی سم بدل لی ہے اس لیے ان نون نمبر دیکھ کر وہ فون ریسیو نہیں کر رہی' پھر میں نے طلال انکل کو فون کیا لیکن ان کا رویہ بھی سرمئی سے مختلف نہیں تھا بار بار کال کرنے پر بھی انہوں نے فون ریسیو نہیں کیا تو میں نے مزید کوشش ترک کردی اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کرکے سیدھا کلفٹن پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں دل ہی دل میں اللہ سے دعا کررہا تھا کہ یا اللہ مولانا سہیل ہاشمی کو کوئی ایسا کام پڑ جائے کہ وہ اس جلسہ میں شرکت ہی نہ کریں۔ میں یہ گناہ کبیرہ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اور اللہ تعالیٰ ہی مجھے اس گناہ کو کرنے سے باز رکھ سکتا تھا۔
میں کوٹھی پر پہنچا تو میں نے سلمان کو فون کرکے کہا کہ وہ راجو کو میرے روم میں بھیج دے میں نے ایک بار پھر طلال انکل اور سرمئی سے فون پر رابطہ کرنا چاہا لیکن اس مرتبہ حیرت انگیز طور پر دونوں فون مجھے آف ملے ان دونوں کا ہی رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔
اگلے پانچ چھ منٹ بعد ہی میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور میرے ''یس'' کہنے پر وہ اندر آ گیا۔
''مجھے راجو کہتے ہیں سرکار سائیں کا پیغام ملا تھا کہ میں آپ کی مدد کروں جیسا بھی آپ چاہیں میں حاضر ہوں۔'' اس نے اندر آتے ہی اپنا تعارف کروایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ اسے نواب کا مسیج مل چکا ہے۔
میں نے اس شخص کا سرتاپا جائزہ لیا وہ ساڑھے چھ فٹ کا بھاری جسم کا شخص تھا۔ جس کی گھنی مونچھیں جو تلوار کی مانند اوپر کی جانب کو مڑی ہوئی تھیں۔ لمبی اور پتلی ناک' پتلے پتلے ہونٹ گھنی بھنوؤں کے نیچے چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں۔ رنگت البتہ اس کی سرخ وسپید تھی۔ اپنے حلیے سے وہ ایک کرخت اور سخت دل انسان دکھائی دے رہا تھا لیکن اس نے مجھ سے بہت نرم اور سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو کی تھی۔
''مجھے جدید ترین اسلحہ چاہیے۔'' میں نے کہا۔
''مل جائے گا جیسا بھی آپ چاہیں بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ آپ میرے ساتھ اسلحہ خانے چلیں اور اپنی پسند سے جو چاہیں منتخب کرلیں۔'' اس نے سر کو ہلکے سے خم دیتے ہوئے کہا۔
''اسلحہ خانہ یہیں اس کوٹھی میں ہے یا کہیں اور جانا ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''یہیں اسی کوٹھی میں ہے آپ کو کہیں اور جانا نہیں پڑے گا۔ میری ڈیوٹی بھی یہاں کے اسلحہ خانے پر ہے آپ ابھی چلنا چاہیں تو ابھی چلیں ورنہ جب آپ کہیں۔'' اس نے کہا۔
''میرا خیال ہے کہ ابھی رہنے دو میں کل تم سے اپنی مطلوبہ اشیاء لے لوں گا۔''
''جیسا آپ مناسب سمجھیں اب مجھے اجازت ہے۔'' اس نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو وہ مڑ کر جانے لگا۔
''سنو۔'' میں نے اسے آواز دی۔
''جی۔'' وہ رک کر مڑا۔
''ایک بات تو بتاؤ' تمہاری شکل دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے تم کوئی بہت سخت دل اور بدتمیز سے انسان ہوگے لیکن تم نے بہت سلجھے ہوئے اور شائستہ انداز میں گفتگو کی ہے آخر ایسی گفتگو کرنا تم نے کس سے سیکھا۔'' میں نے پوچھا۔
''بات یہ ہے کہ میرا سرکار سائیں نواب صاحب سے رابطہ رہتا ہے اور نواب سرکار سے بات کرنے کے لیے انسان کا لب ولہجہ اور انداز گفتگو بہت صاف ستھرا ہونا چاہیے میں گزشتہ دس سالوں سے نواب صاحب کے ساتھ ہوں شاید اس لیے میں نے بھی تہذیب سیکھ لی ہے اور ویسے بھی میں اپنے سامنے والے بندے کو دیکھ کر بات کرتا ہوں آپ تو ویسے بھی پڑھے لکھے ہیں ڈاکٹر صاحب ہیں۔'' اس نے کہا۔
''تم کو کس نے بتایا کہ میں ڈاکٹر ہوں۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''سب ہی کو معلوم ہے' لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ اور اس لائن میں۔''
''میرا خیال ہے تمہارا یہ سوال غیر ضروری ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔
''آئی ایم سوری۔'' اس نے کہا اور تیزی سے میرے روم سے نکل گیا۔
مجھے سب سے پہلے اس جگہ کا جائزہ لینا تھا جہاں وہ جلسہ ہو رہا تھا اب ایسا تو نہیں ہوسکتا تھا کہ میں

پستول اٹھا کر جلسہ میں گھس جاؤں اور قاری سہیل ہاشمی کے سامنے کھڑے ہو کر ان کے سینے میں گولیاں برسا دوں۔ نا میں انہیں مارنے کے لیے ان کی گاڑی میں بم فٹ کروا سکتا تھا۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ اپنانا تھا کہ میں اپنا کام بھی کر سکوں اور پکڑا بھی نہ جاؤں۔

میں ایک بار پھر گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا اور سیدھا اس علاقے میں جا پہنچا جس کا پتا مجھے نواب نے بتایا تھا۔

پارک میں کل ہونے والے جلسہ کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ مہمانوں کے لیے پنڈال میں کرسیاں لگائی جا رہی تھیں اور اسٹیج بنایا جا رہا تھا میں نے گھوم پھر کر چاروں جانب سے اس جگہ کا جائزہ لیا اس کے اطراف میں بلند عمارتیں تھیں۔ یہاں فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ میں یہاں سے گھوم کر دو عمارتوں کے درمیان ایک خالی گلی سے گزر کے مزید پیچھے گیا اور تب ہی میری نگاہ ایک اور عمارت پر پڑی جو زیر تعمیر تھی۔ اس کا اسٹرکچر کھڑا تھا۔ میں نے اپنی کار وہاں سے قدرے دور پارک کی اور اتر کر اس زیر تعمیر عمارت کی جانب بڑھ گیا۔

اس عمارت کے اندر جا کر میں دو چیزوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا ایک تو یہ کہ اب بھی اس عمارت میں کام ہو رہا ہے یا کام رکا ہوا ہے اگر کام ہو رہا ہوتا تو یہاں مزدور ضرور موجود ہوتے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مزدور پیشہ لوگ عارضی طور پر ان ہی عمارتوں میں اپنے رہنے کا ٹھکانہ بنا لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو تعمیراتی میٹریل موجود ہوتا ہے اس کی حفاظت کے لیے چوکیدار ضرور موجود ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ میں اس عمارت سے اس جلسہ گاہ کا اور خاص طور پر اسٹیج کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ وہاں سے اسٹیج پر موجود مہمان میرے نشانے پر ہوں گے یا نہیں۔

پولیس یا سیکیورٹی کے لوگوں کا خیال اس عمارت کی جانب یوں بھی نہیں جائے گا کیونکہ اس کے آگے فلیٹس کی عمارت بنی ہوئی تھی۔ دو بلڈنگوں کے درمیان جو پتلی سی گلی تھی صرف وہیں سے مجھے پارک دکھائی دے سکتا تھا۔

میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اس زیر تعمیر عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ اس عمارت کے باہر سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں تعمیراتی کام فی الحال بند ہو چکا ہے یہاں سناٹا پڑا تھا میں پھر بھی محتاط اور اپنے اردگرد نگاہ رکھتے ہوئے عمارت میں اندر تک گیا۔ بہت تلاش کرنے پر بھی مجھے کوئی بندہ دکھائی نہیں دیا۔ پھر میں اوپر کی منزل میں جانے کے لیے زینے کی جانب بڑھ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ پھر مزید اوپر یہ کئی منزلہ عمارت تھی۔ بالآخر چھٹی منزل پر پہنچ کر مجھے اپنا مطلوبہ ہدف صاف دکھائی دینے لگا۔ مگر میرے حساب سے جگہ تھوڑی کھلی ہوئی تھی اور یہاں پر میں کسی کو بھی دکھائی دے سکتا تھا۔ میرے سامنے بھی ایک عمارت تھی یہ جو کہ پچھلا حصہ تھا لیکن یہاں بیڈ روم کی کھڑکیاں کھلتی تھیں اور بہت ممکن تھا کہ کوئی اتفاقیہ طور پر ادھر کی کھڑکی کھول کر مجھے دیکھ لے۔

میں نے اس جگہ کو خود ہی مسترد کر دیا اچانک ہی میرے دماغ میں میڈم روزی کا خیال آ گیا اس نے مجھے بتایا تھا کہ کس طرح ایک مرتبہ اس نے نواب کو جان سے مارنے کے لیے ایسے ہی دو منزلہ مکان کا انتخاب کیا تھا اور دوربین کی مدد سے نشانہ لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک بوڑھی عورت کے بھیس میں کپڑے کے ایک تھیلے میں اپنا سامان لے کر آئی تھی۔ کیوں نہ میں بھی اس کی ترکیب آزماؤں اس بات کا خیال آتے ہی مجھے لگا کہ میں اپنا کام باآسانی مکمل کر سکتا ہوں۔

میں نے اب نچلی منزل کا رخ کیا آخری یعنی

تیسری منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی سے میں بخوبی پارک اور پارک میں بنے اسٹیج کو واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

اس کھڑکی میں صرف چوکھٹ لگی تھی باقی ساری کھڑکی اوپن تھی میں کچھ دیر تک کھڑا ادھر کا جائزہ لیتا رہا پھر مطمئن ہو کر واپس آ گیا۔

دوسرے دن میں نے ایک بار پھر راجو کو بلوایا تب راجو نے مجھے اپنا سیل نمبر دیتے ہوئے کہا کہ اب آپ کو جب بھی میری ضرورت ہو آپ مجھے کال کر سکتے ہیں۔ بار بار دوسروں کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے راجو سے کہا کہ مجھے ایک نہایت طاقتور دوربین کی ضرورت بھی ہے کیا وہ اس کا انتظام کر سکتا ہے جس پر راجو نے کہا کہ وہ بالکل اس کا انتظام کر سکتا ہے اس کے علاوہ ربر کے دستانے اور کچھ میک اپ کا سامان۔ یہ تمام چیزیں راجو نے مہیا کرنے کا وعدہ کیا میں راجو کے ساتھ اسلحہ خانے گیا اور زیر زمین اس اسلحہ خانے کو دیکھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے یہاں نہایت جدید ترین چھوٹا بڑا ہر طرح کا اسلحہ وافر مقدار میں موجود تھا۔

میں نے یہاں سے ایک لمبی نال کی جدید ساخت کی گن منتخب کی جس کی ایک ہی گولی انسان کا کام تمام کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے اس کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم بھی کیا جا سکتا تھا

میں نے کئی مرتبہ اس گن کو کھول کر جوڑا اور پوری طرح مطمئن ہو کر اسے لے لیا اس کے علاوہ سائلنسر بھی لیا جو کہ بے حد ضروری تھا۔

دوپہر تک میں اپنی پوری تیاری سے لیس تھا۔ اب بس اس عمارت کے اندر جانے کی ضرورت تھی۔ میں کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک گھنٹہ لیٹ کر پھر اپنی مہم پر چلا جاؤں گا کمرے کا دروازہ لاک کر کے میں نے ایک آخری مرتبہ پھر سرمئی اور طلال انکل کو کال ملائی لیکن وہی ہوا جیسا پہلے ہو رہا تھا دونوں میں سے کوئی بھی میری کال ریسیو نہیں کر رہا تھا پھر میں نے دونوں کو ایک جیسا ہی میسیج سینڈ کیا کہ مجھے بہت ضروری اطلاع دینی ہے پلیز ریسیو مائی کال۔ آخر میں اپنا نام بھی لکھ دیا۔ مجھے امید تھی کہ میرا میسیج دیکھ کر تو وہ لوگ ضرور میری کال ریسیو کر لیں گے۔ پھر اسی امید پر بار بار کال کرتا رہا لیکن میری کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اب تو مجھے اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ ان لوگوں کو میرے بارے میں کوئی زبردست غلط فہمی ہو گئی ہے اور یہ ساری ناراضی اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے مجھے اس وقت اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ میرے لیے اس غلط فہمی کا نتیجہ بہت ہی بھیانک نکلے گا۔

بہرحال میں نے مایوس اور ناامید ہو کر ساری کالز اور میسیج ڈیلیٹ کیے اور جانے کے لیے تیاری کرنے لگا۔

میں نے ایک نہایت مفلوک الحال بوڑھے کا گیٹ اپ کیا ایک میلا اور بوسیدہ سا لباس پہنا اپنے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر کالا رنگ کیا اور سر کے بال سفید کر لیے۔ ہاتھوں اور چہرے پر جھریاں پیدا کرنے والا لوشن ملا۔

مجھے گن اور دوربین وغیرہ رکھنے کے لیے ایک کپڑے کا میلا سا کپڑے کا تھیلا چاہیے تھا میں نے وہ بھی راجو ہی سے منگوا لیا تھا اس کپڑے کے تھیلے میں، میں نے میلی سی چادر میں اپنا سامان لپیٹ کر رکھ لیا تھا۔

میں تقریباً چار بجے ایک بوڑھے کے روپ نکلا اور اپنے ساتھ ایک بندے کو لیا کہ وہ گاڑی ڈرائیو

کرے اس علاقہ میں پہنچ کر عمارت کی پچھلی جانب جہاں گھنی جھاڑیاں تھیں میں نے گاڑی رکوالی اور اتر گیا۔ ڈرائیور نے فوراً ہی کار کی چابی میرے حوالے کردی اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس گاڑی کی نمبر پلیٹ اے ایف آر تھی۔ اگر یہ کار کسی کی نگاہ میں آ بھی جاتی تو مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس قسم کی کاریں نواب کے گیراج میں موجود تھیں۔ جو ہم اس قسم کے مشن میں استعمال کرتے تھے۔

میں اپنا تھیلا سنبھالے کھانستا ہوا آہستہ آہستہ وہاں سے چلا آج اس علاقے میں کافی رونق اور گہما گہمی تھی۔ پولیس کی موبائل بھی وہاں گشت کر رہی تھیں میرے قریب سے بھی ایک موبائل گزری اس میں بیٹھے ہوئے پولیس والوں نے مجھے دیکھا بھی لیکن بے ضرر بوڑھا سمجھ کر مجھے نظر انداز کردیا۔ اس سے مجھے خاصا اطمینان حاصل ہوا کہ میں کسی طرح بھی مشکوک دکھائی نہیں دے رہا ہوں۔

میں کمر جھکائے ایک ہاتھ جھکی ہوئی کمر پر رکھے پارک کی جانب جا رہا تھا کپڑے کا میلا سا تھیلا میرے دوسرے ہاتھ میں موجود تھا۔ میں پارک کے گیٹ پر کھڑے ہوکر اندر کا جائزہ لینے لگا۔ ایک شخص جو شاید انتظام وغیرہ دیکھ رہا تھا میرے نزدیک آیا اور بولا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بابا' رات کو آنا ابھی جلسہ شروع ہونے میں ٹائم ہے۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے ہلایا اور سر ہلاتا ہوا وہاں سے آ گیا اب میرا رخ اس عمارت کی جانب تھا جہاں سے مجھے کارروائی کرنی تھی۔

مغرب کا وقت ہو چلا تھا عمارت کے اردگرد روشنی کافی کم ہوگئی تھی کیونکہ یہاں چاروں جانب اونچی اونچی عمارتیں بنی تھیں۔

عمارت میں داخل ہونے کے بعد میں نے ایک بار پھر ساری عمارت کا گھوم پھر کر اچھی طرح سے جائزہ لیا اور پھر کسی کو بھی وہاں نہ پا کر اطمینان سے چلتا ہوا تیسری منزل پر آ گیا۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میں کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے نہ جاؤں میں نے مکمل طور پر اندھیرا ہونے کا انتظار کیا۔ پھر اتنا اندھیرا ہوا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ تب میں نے اپنے تھیلے سے سیاہ رنگ کی چادر نکالی اور گن اور دوسری اشیا واپس تھیلے میں رکھ دی میں نے وہ سیاہ چادر اچھی طرح سے اوڑھ لی تاکہ میرے سفید بال اور سفید داڑھی مونچھیں چھپ جائیں۔ میں نے صرف اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور کھلی کھڑکی کے سامنے گیا پھر میں نے سامنے موجود فلیٹ کی کھڑکیوں کا جائزہ لیا وہ تمام کھڑکیاں بند تھیں لیکن پھر بھی اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اچانک ہی کوئی کھڑکی کھل جائے اور میرا کسی سے آمنا سامنا ہوجائے فلیٹ کی کھڑکی اور اس کھڑکی جہاں میں موجود تھا زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

میں نے دوربین اپنے ہاتھوں میں سنبھالی اور آنکھوں سے لگالی جلسہ گاہ میں موجود اسٹیج بالکل میرے قریب آ گیا تھا اور اس پر چلتے پھرتے لوگوں کو میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ دیکھ کیا میں انہیں اپنے بہت قریب محسوس کر رہا تھا اور شکلوں سے پہچان رہا تھا۔

اسٹیج پر مہمانوں کے لیے کرسیاں اور میزیں لگائی جا رہی تھیں۔ کرسیوں سے ہٹ کر ڈائس بنایا گیا تھا۔ میں نے مختلف زاویوں سے ہر کرسی اور ڈائس کا جائزہ لیا ڈائس مکمل طور پر میری رینج میں نہیں آ رہا تھا البتہ اسٹیج پر موجود دو کرسیاں جو درمیان میں تھیں مکمل طور پر میری رینج میں تھیں۔ اب میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ سہیل ہاشمی ان ہی دونوں کرسیوں میں سے کسی ایک پر بیٹھے اور مجھے یہیں پر انہیں نشانہ بنانا تھا۔

اس وقت بھی جبکہ میں ایک انسانی زندگی ختم کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا دل میں مسلسل دعا کر رہا تھا کہ آج کی اس تقریب میں سہیل ہاشمی شرکت نہ کرے اسے کوئی بھی چھوٹا یا بڑا مسئلہ پیش آجائے اور وہ یہاں آنے سے معذرت کرلے لیکن کہتے ہیں نا کہ قضا کا وقت اور جگہ اللہ کے ہاں مقرر ہے سہیل ہاشمی کی بھی قضا یہاں اس کا انتظار کر رہی تھی تو وہ کیوں نہ آتا۔

بہت صبر آزما اور طویل انتظار کے بعد رات دس بجے کے قریب سہیل ہاشمی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ اسٹیج پر نمودار ہوا۔

جلسہ گاہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دوسرے مہمان اور مقرر دوسری کرسیوں پر براجمان تھے اور حسن اتفاق درمیان والی دونوں کرسیاں خالی تھیں۔ سہیل ہاشمی اسٹیج پر آیا چند لوگ اس کے ہمراہ اسٹیج پر آئے اور اسے بہت احترام کے ساتھ ایک کرسی پر بٹھا دیا اس کے ساتھ والی خالی کرسی پر ملک کا ایک مشہور نعت خواں بیٹھا تھا۔ سہیل ہاشمی کے کرسی پر بیٹھتے ہی اس کا محافظ گن مین بالکل اس کی پشت پر الرٹ کھڑا ہوگیا۔

میں نے جھٹ اپنی گن تیار کی دستانے تو میں نے آتے ہی پہن لیے تھے۔ میں نے چادر میں خود کو مکمل طور پر چھپایا ہوا تھا دوربین کو رائفل پر سیٹ کیا اور نشانہ باندھا۔ یہ دور مار گن تھی جس کی ایک ہی گولی انسانی زندگی کو ختم کرنے کے لیے کافی تھی۔

میں نے سہیل ہاشمی کی پیشانی کا نشانہ لیا لیکن وہ سر کو مسلسل دائیں بائیں گھما کر دیکھ رہا تھا۔ کبھی اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص کی جانب جھک کر اس کی کوئی بات سننے لگتا میں نے سوچا کہ اس طرح تو میں اس کی پیشانی کا نشانہ ٹھیک طور پر نہیں لے سکتا میرے پاس صرف ایک فائر کرنے کا چانس تھا دوسرے کی مجھے مہلت اس لیے نہیں ملتی کہ ایک ہی فائر سے افراتفری مچ جاتی اور بچ جانے پر سہیل ہاشمی منظر سے فوراً غائب ہوجاتا۔

اب میں نے اس کی گردن اور سینے پر دل کے مقام کا نشانہ باندھا یہ بہت مناسب تھا۔ میں نے دل میں سہیل ہاشمی کو مخاطب کر کے اس سے معافی مانگی اور کہا ''الوداع میرے بھائی' تم میرے ہاتھوں شہادت کا رتبہ پا کر جنت میں داخل ہوجاؤ' میرا اللہ مجھے معاف کرے کہ دنیا کو ایک بڑے شیطان سے نجات دلانے کے لیے مجھے تمہاری جان کی قربانی بھی دینی پڑ رہی ہے۔''

اور پھر میں نے دیکھا کہ سہیل ہاشمی اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا شاید۔۔ ڈائس کی جانب جانے والا تھا۔ میں اب لمحہ بھر بھی دیر نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے کھڑے ہوئے سہیل ہاشمی کے سینے کا نشانہ لیا اور فائر کردیا۔

بے آواز گولی سیدھی اس کے سینے میں پیوست ہوگئی اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے اور آنکھیں پوری طرح پھیل گئیں اور پھر اس کے سینے پر خون کے سرخ نشانات ظاہر ہوگئے اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

میں فوری طور پر کھڑکی سے ہٹا۔ میں نے گن کو سیاہ چادر میں لپیٹا میرے ہاتھ اور میرے دل کی دھڑکن کے ساتھ میری سانسیں بھی بہت تیز چل رہی تھیں۔

اور پھر میں اپنا تھیلا سنبھال کر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آ گیا اور تیزی

کے ساتھ دوڑتا ہوا اپنی کار تک جا پہنچا۔
میں نے فوری طور پر کار کو اسٹارٹ کیا اور اس جگہ سے دور لے آیا یہاں میں نے وہ پھٹا پرانا کرتا اتارا سفید بالوں کی وگ اور داڑھی مونچھیں اتار کر چلتی گاڑی سے جھاڑیوں میں پھینک دیں۔ اب میں اپنی اصل شکل وصورت میں تھا۔ رنگت البتہ سیاہ اور چہرہ جھریوں زدہ تھا۔ میں نہایت برق رفتاری سے کار ڈرائیو کرتا ہوا گلشن اقبال آ گیا۔ پارکنگ ایریا میں کار پارک کی اور کار میں بیٹھے بیٹھے ہی میں نے رنگ اور جھریوں کو صاف کرنے والا لوشن اپنے چہرے اور ہاتھوں پر ملا۔ ڈھیلا ڈھالا پاجامہ بھی اتار پھینکا سب سامان تھیلے میں ٹھونس لیا اور کار میں موجود دوسرے بڑے سے شاپر میں کپڑے کا تھیلا ڈال لیا۔ میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور مطمئن ہو کر کار سے اتر آیا۔
اب میرا رخ تیزی کے ساتھ اپنے فلیٹ کی جانب تھا میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کسی بھی شخص سے میرا سامنا نہ ہو۔
لیکن سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک شخص مجھے سیڑھیوں پر ٹکرا گیا۔ میں نے جھٹ اپنا چہرہ نیچے کر لیا اور اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا تب ہی اس نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔
"بھائی صاحب ذرا ایک منٹ رکیں گے۔" اور میرے تیز چلتے ہوئے قدموں کو بریک لگ گئے۔ میں نے رک کر بنا مڑے کہا۔
"جی فرمائیے۔"
"دیکھیں میں یہاں قریشی صاحب کا فلیٹ تلاش کر رہا ہوں کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ان کا فلیٹ نمبر کیا ہے؟"
"جی نہیں یہاں تو کوئی قریشی صاحب نہیں رہتے۔" میں نے اسی طرح جواب دیا۔
"اچھا تو آپ.....!"
"سوری جناب مجھے جلدی ہے دراصل مجھے واش روم جانا ہے آپ کسی اور سے پوچھ لیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اسے ہکا بکا چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔
میں نے اوپر والے زینے سے جھانک کر دیکھا وہ ابھی تک اس جگہ کھڑا تھا۔ میں فوراً فلیٹ میں داخل ہو جانا چاہتا تھا میں ایک بہت بڑا کام کر کے آیا تھا اور اللہ کا شکر تھا کہ خیریت سے یہاں تک آ گیا تھا۔ اب میں فلیٹ میں جا کر غسل کرنا چاہتا تھا تاکہ میک اپ کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے۔
میں بغیر کسی دخل اندازی کے اپنے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا اور لاک کھول کر اندر داخل ہو گیا اور جھٹ دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔
میں اندر داخل ہوا تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

☆......۞......☆
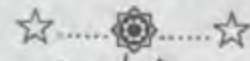
میرے سیل فون پر مسلسل شمروز بھائی کی کال آ رہی تھی لیکن اب میں کرنل مشتاق اور طلال انکل کی ہدایت پر ان کا فون ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ میں نے بڑے مان سے انہیں اپنا بھائی کہا تھا اور مانا بھی تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ ہم لوگ کس طرح ان کے ہاتھوں بے وقوف بن گئے۔ ہم نے اپنی ہر اہم میٹنگ میں انہیں اپنے ساتھ رکھا وہ تمام اہم اور خفیہ باتیں جو کرنل مشتاق اور طلال انکل اور میرے درمیان ہوئی تھیں شمروز بھائی ان ساری اہم میٹنگز میں ہمارے ساتھ تھے۔ مجھے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ ہم نے کتنی بھیانک غلطی کی تھی ان پر اعتبار کر کے مجھے آج ان سے اتنی زیادہ اور شدید ترین نفرت کا احساس ہو رہا تھا جتنا کہ شاید اپنے باپ نواب سطوت سے بھی نہیں تھا۔
نواب سطوت تو ہمارے سامنے کھلے دشمن کی طرح تھا جبکہ شمروز بھائی نے تو اپنا بن کر ہمارے ساتھ دغا کی تھی بے شک وہ امی کو نواب سے بچا کر لائے تھے مجھے ان ہی کی وجہ سے اپنی حقیقی ماں ملی تھی سب احسانات اپنی جگہ لیکن ان سب باتوں سے الگ میرے ملک کی حرمت اور عفت ہے میں کبھی بھی ایسے کسی شخص کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتی جو میرے ملک ہی کا دشمن ہو ہم نے کس طرح حشام والے سارے معاملے کو ان کے ساتھ ڈسکس کیا ہمیں کیا پتا تھا کہ ہم دشمنوں ہی کو اپنے سارے راز دے رہے ہیں۔
اب وہ ساری باتیں جو حشام کی رپورٹ کے حوالے سے ہم نے کی تھیں وہ ساری کی ساری شمروز بھائی کے علم میں تھیں اور اب وہ ساری باتیں ان کے توسط سے نواب سطوت تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔
پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ شمروز بھائی نے ہی اس ڈاکو کی تصویر کھینچ کر ہم تک پہنچائی تھی جو نواب سطوت کے پاس آیا تھا اور اس بات پر معذرت کر رہا تھا کہ وہ اپنا مطلوبہ ہدف مکمل نہ کر سکا اور اس کی گفتگو سے ہی حشام بھائی نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اس کا نشانہ حشام ہی تھا اور بعد میں جب اس شخص کی تصویر کو ویڈیو کیمرے میں موجود اس شخص کی تصویر سے ٹیلی کیا گیا جو حشام پر گولی چلا رہا تھا تو وہ دونوں شخص ایک ہی تھے اور اس شخص کی مدد سے ہی ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ حشام پر حملہ نواب سطوت کے کہنے پر کیا گیا تھا اب یہ بات تو ایک طرف رہی کہ نواب نے حشام کو کیوں اور کس کے کہنے پر مروانا چاہا۔
کبھی میرا دل یہ کہتا کہ اگر شمروز بھائی دشمن کے ایجنٹ ہوتے تو وہ اتنی اہم بات ہم تک کیوں پہنچاتے انہوں نے امی کو بھی نواب سطوت کے حوالے نہیں کیا۔
لیکن جب مشتاق انکل کی کہی ہوئی بات سامنے آتی تو دل میں پھر ان کے لیے نفرت کا شدید احساس پیدا ہوتا۔
میرا شدت کے ساتھ دل چاہ رہا تھا کہ میں شمروز بھائی سے ملوں اور ان سے ان الزامات کی وضاحت طلب کروں جو کرنل مشتاق نے ان پر لگائے ہیں لیکن میں چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتی اس لیے کہ کرنل مشتاق نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں ان سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھوں اور نہ ہی ان کا فون ریسیو کروں۔
کل رات بھی ایک ان نون نمبر سے مسلسل سیل فون پر کال آ رہی تھی جو محتاط ہونے کی وجہ سے میں نے ریسیو نہیں کی۔ ویسے بھی میں ان نون نمبر سے آنے والی کوئی بھی کال کبھی ریسیو نہیں کرتی لیکن پھر اس نمبر سے میرے پاس شمروز بھائی کا ایس ایم ایس آیا کہ انہیں مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے میں ان کی کال ریسیو کروں لیکن پھر کرنل مشتاق کی ہدایت یاد آ گئی۔ میں نے اس بات کا ذکر طلال انکل سے کیا تو انہوں نے بھی یہی بتایا کہ شمروز انہیں بھی اسی نمبر سے کال کرتا رہا ہے اور ویسا ہی ایس ایم ایس ان کے پاس بھی آیا تھا۔
میں سوچنے لگی کہ آخر ایسا کون سا کام ہو سکتا ہے میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔
اسی روز رات کو کھانے کی ٹیبل پر امی نے فکرمند لہجے میں شمروز بھائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ کتنے ہی دن ہو گئے گھر نہیں آیا ہے پتا نہیں کیا بات ہے اللہ کرے وہ خیریت سے ہو کہیں نواب کے سامنے اس کا بھانڈہ نہ پھوٹ گیا ہو امی ان سے حقیقی بیٹے کی

طرح محبت کرنے لگی تھیں۔
میں نے امی کی بات کو ٹال دیا کہ وہ کہیں مصروف ہوں گے۔ پتا نہیں یہ بات کہتے ہوئے میرے چہرے پر امی کو کیا نظر آیا کہ وہ حیرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگیں اور اس سے پہلے کہ امی مجھ سے اس کے بارے میں کچھ پوچھتیں اچانک کھانا کھاتے ہوئے بابا کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ اپنا سینہ ملنے لگے ان کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمایاں ہوئے اور سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا اور پھر وہ بے ہوش ہوگئے۔
میں نے شدید تشویش کے ساتھ فوراً ایمبولینس کو کال کیا اور بابا کو لے کر اسپتال پہنچی آصف میرے ہمراہ تھے لیکن......!
اس سے پہلے کہ ہم اسپتال پہنچتے بابا میرا ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے اچانک میرے سر سے ٹھنڈی چھاؤں والی چھت کھینچ لی۔
میرا رو رو کر برا حال ہوگیا۔ جن کی گود میں میں نے اپنا بچپن بتایا جن کے سینے پر سر رکھ کر پریوں کی کہانیاں سنتے سنتے میں سوتی تھی۔ مجھے انگلی پکڑ کر پہلی مرتبہ بابا مجھے اسکول چھوڑنے گئے۔
وہ میرے باپ سے بڑھ کر میرے لیے باپ تھے ان کی شفقت ان کی محبت ان کا پیار میرے لیے ان کی فکر ان کی تشویش میں کس کس بات کو بھلاؤں گی میں تو کچھ بھی نہیں بھلا سکتی۔ وہ میرے کچھ بھی نہیں تھے لیکن پھر بھی میرے سب کچھ تھے آج ایسا لگا جیسے میرا باپ اس دنیا سے اٹھ گیا تھا حقیقی باپ تو سب ہی اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں ان کے لیے دکھ اٹھاتے ہیں لیکن بابا میرے باپ نہ ہوتے ہوئے بھی ہزار باپوں سے زیادہ مجھ سے پیار کرتے تھے ہم دونوں کے درد مشترک تھے میں باپ کے پیار کو ترسی ہوئی تھی تو وہ اولاد کے لیے ترسے ہوئے تھے پھر ہم دونوں ہی نے ایک دوسرے کے دکھ کو سمیٹا ایک دوسرے کے درد کا درماں بنے......آہ......! آج میرے بابا ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہوگئے۔
کیسے دوں گی میں یہ روح فرسا خبر اماں اور امی کو، میں تو انہیں زندگی دلانے کے لیے گھر سے لے کر چلی تھی کیسے اس روح سے خالی بے جان جسم کو لے کر جاؤں گی۔
میرا دماغ پھٹنے لگا اور میں بے دم ہو کر آصف کی بانہوں میں جھول گئی۔ آصف نے ایمبولینس کو واپس گھر چلنے کے لیے کہا۔
مجھے نہیں معلوم کہ گھر پر کیا ہوا میں نے تو بس اماں کو دیکھ کر ایک زور کی چیخ مار کر ان کے بازوؤں میں بے ہوش ہوگئی۔
ہوش آیا تو بابا جان کے آخری سفر کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں ڈاکٹر ذیشان جو ایک بہت نامور اور بہت زیادہ مصروف ڈاکٹر تھے میرے پاس بیٹھے تھے ان ہی کی کوششوں سے میں ہوش میں آئی اپنے بابا کا آخری دیدار کیا اور سب بابا کو ان کی آخری آرام گاہ کی جانب لے کر چلے گئے تھے۔
حشام کی امی تین دن تک ہمارے گھر رہیں طلال انکل بھی آتے رہے حشام بار بار مجھے فون کرتا اور تسلیاں دیتا ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس دکھ کے موقع پر وہ اڑ کر میرے پاس آئے لیکن ابھی وہ اسپتال کے بستر ہی پر تھا ڈاکٹر نے اسے آنے کی قطعی اجازت نہیں دی تھی۔
سوئم کی فاتحہ کے بعد سب لوگ چلے گئے طلال انکل اور آنٹی میرے پاس ہی تھے تب رات میں ڈاکٹر ذیشان آگئے انہوں نے میرا چیک اپ کیا اور آہستہ سے بولے۔
”تمہیں پتا ہے تمہارا مریض تمہاری وجہ سے کتنا زیادہ ڈسٹرب ہے تم اتنی غمزدہ ہوگئیں تو وہ کیسے ٹھیک ہوگا تمہیں اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو ذرا اپنا حال تو دیکھو دو ہی دن میں تمہارا کیا حال ہوگیا ہے برسوں کی بیمار لگ رہی ہو۔“
”ڈاکٹر ذیشان میرے بابا......!“ میں اتنا کہہ کر بلک پڑی۔
”آئی نو ڈیئر سسٹر، لیکن موت دنیا کی سب سے اٹل حقیقت ہے دنیا میں آنے والے ہر فرد کو ایک نہ ایک دن یہ دنیا چھوڑ کر جانا ہے میری باری بھی آئے گی اور آپ کی بھی ان کو دنیا میں اتنا ہی وقت گزارنا تھا انہوں نے اپنا کام اپنی ذمہ داریوں کو یقیناً احسن طریقے سے پورا کیا ہوگا ان کا کام ختم ہوگیا تو اللہ نے انہیں اپنے پاس بلالیا، آپ اب بہادری کے ساتھ اس حقیقت کو تسلیم کرلیں۔ جتنی جلدی اس حقیقت کو تسلیم کرلیں گے اتنی جلدی صبر آجائے گا۔“ ڈاکٹر ذیشان مجھے بہت محبت اور دھیمے لہجے میں سمجھا رہے تھے سب ہی میرے نزدیک بیٹھے تھے تب امی نے مجھے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا اور بولیں۔
”دیکھو بیٹا یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اللہ نے انہیں تمہارے بچپن میں اپنے پاس نہیں بلایا انہوں نے تمہاری پرورش کی آج تم اس قابل ہو کہ اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہو۔“ اور پھر باری باری سب ہی نے چند جملے کہے اماں اتنے غم کی کیفیت میں بھی میرے لیے یخنی بنا کر لے آئیں اور گلوگیر لہجے میں بولیں۔
”اسے پی لو میرا بچہ، تم جانتی ہو نا تمہارے بابا تم سے کتنا پیار کرتے تھے اب تم روئیں اور بیمار ہوئیں تو ان کی روح کو تکلیف ہوگی اور پھر وہ تمہارے خواب میں بھی نہیں آئیں گے۔“
اور میں نے بچوں کی طرح بہل کر یخنی پی دوا بھی کھائی مجھے بہت زیادہ کمزوری ہو رہی تھی سب لوگوں کی بھرپور توجہ کی وجہ سے میں کافی بہتر ہوگئی تھی پورا ہفتہ میں نے گھر میں گزارا تھا حشام سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی اس لیے اس روز جب ڈاکٹر ذیشان گھر پر آئے تو میں ان کے ہمراہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہوگئی۔
میں اسپتال پہنچی تو میں نے حشام کو بڑی شدت کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ اس نے بڑے والہانہ انداز میں اپنی دونوں بانہیں وا کر کے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور میں بلا کسی شرم اور جھجک کے اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گئی۔ میری اس وقت کی کیفیت ہی دوسری تھی وہ بھی شرارتی موڈ میں نہیں تھا بلکہ اس کو میرے دکھ کا احساس تھا وہ مجھے اپنے سینے میں چھپا کر میرے دکھ کو بانٹنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک معصوم بچے کی طرح مجھے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ پیار سے کبھی میری پشت سہلاتا کبھی میرے سر پر بوسہ دیتا میں دیر تک اس کا گریبان آنسوؤں سے بھگوتی رہی پھر اس نے بڑی نرمی کے ساتھ مجھے خود سے جدا کیا اور ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاس میں پانی بھر کر میرے منہ سے لگا دیا۔
میرے دل کا درد جیسے میرے آنسوؤں کے ساتھ بہہ نکلا تھا۔ آج تقریباً دس روز کے بعد میں حشام سے ملی تھی۔ وہ کافی بہتر تھا تھوڑی دیر بابا کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اس سے اس کا حال پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
”تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا کہ میں کیسا ہوں۔“
”ہوں۔“ میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ”ماشاء اللہ تم کافی بہتر لگ رہے ہو۔“
”بہتر نہیں اب میں بالکل ٹھیک ہوں بس ایک دو

روز مزید اسپتال میں رہوں گا پھر میں گھر جاسکوں گا۔" اس نے محبت پاش نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ سب تمہاری محبت تمہاری توجہ اور تمہاری دعاؤں کی وجہ سے ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے حشام۔" میں نے اپنی نگاہوں میں زمانے بھر کی محبت سمو کر جواب دیا۔ "اور تمہاری یہ زندگی اور یہ صحت صرف میری دعاؤں کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ اس میں دوسرے لوگوں کی محنت توجہ اور دعائیں شامل ہیں خاص طور پر انکل آنٹی اور ڈاکٹر ذیشان اور خاص طور پر ہم ڈاکٹر ذیشان کے احسانات کو تو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتے۔ انہوں نے تمہارے لیے وہ سب کیا ہے جو صرف ایک ڈاکٹر نہیں کرسکتا وہ اس سے بھی بہت بڑھ کر ہے۔" میں روا روی میں بول بیٹھی اور ڈاکٹر ذیشان کے بارے میں بول دیا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"وہی جو کچھ ہوا ہے اور جو ڈاکٹر ذیشان اور مشتاق انکل نے کہا ہے مجھے سب کچھ پتا ہے لمحہ لمحہ کی خبر ہے۔" اس کا لہجہ بدستور دھیما اور گہرائی لیے ہوئے تھا۔

"کیسے؟" میں پھر احمقانہ انداز میں بول اٹھی تو وہ ہنس پڑا اور بولا۔

"اس موضوع پر پھر کبھی گفتگو کریں گے۔" پھر میرے چہرے کو اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے نرمی سے چھوا اور بولا۔

"تم نے یہ اپنا کیا حال بنالیا ہے دیکھو تو کتنی کمزور اور زرد ہو رہی ہو خود کو سنبھالو اور اپنا خیال رکھو پلیز میرے لیے......!" اس نے ملتجیانہ انداز میں میری آنکھوں میں جھانکا تو میں محض سر ہلا کر رہ گئی۔

"مجھے دیکھو میں تمہاری خاطر موت کی چوکھٹ چھو کر آ گیا۔ تمہارے ساتھ جینے کے لیے پیار کی رسمیں نبھانے کے لیے تمہارے اس ایک اظہار محبت نے مجھے زندگی کی جانب کھینچ لیا جو تم نے مجھ سے کیا تھا' میں تم سے بے پناہ کرتا ہوں سرمئی اتنی زیادہ جو لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی اور شاید تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔" وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا اور اس کے الفاظ حرارت بن کر میری رگوں میں دوڑ رہے تھے۔

"میں بھی......!" میں نے بے ساختہ کہا اور اپنے گزرتے ہوئے ہاتھ حشام کے ہاتھوں پر رکھ دیے تب ایک بار پھر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔

ہم ایک دوسرے میں جیسے پیوست ہوگئے ایک دوسرے کی دل کی دھڑکنوں کے ان نغموں کو سن رہے تھے وہ نغمے جو پیار بھرے دل ایک دوسرے کے لیے گنگناتے ہیں۔ ہمارے جسم ساکت تھے لب خاموش تھے بس دل دھڑک رہے تھے اور دلوں کی یہ دھڑکن ایک دوسرے کو پیغام دے رہی تھی کہ حشام اور سرمئی صرف ایک دوسرے کے لیے ہی تخلیق کیے گئے ہیں حشام کو اللہ نے تخلیق کیا ہزاروں میل دور بیٹھی ایک نومسلم عورت جو زندگی کے لیے جنگ لڑ رہی تھی تو سرمئی کو تخلیق کیا ایک بے بس اور بے کس ماں کی کوکھ میں اور پھر قدرت نے انہیں ایک دوسرے سے ملوا دیا مائیں دونوں کی چھن گئیں لیکن انہیں پروان چڑھایا ایسی ماؤں نے جنہیں اللہ نے تخلیق جیسی نعمت سے محروم رکھا تھا۔

اچانک ہی کمرے کا دروازہ ایک ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھلا اور ڈاکٹر ذیشان اندر آ گئے اور پھر جیسے میں اور حشام ہوش میں آ گئے ہم ایک دوسرے سے دور ہٹ گئے حشام کے لبوں پر ایک جھینپی جھینپی سی

مسکراہٹ تھی تو میری نگاہیں مارے شرم کے زمین میں گڑھی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر ذیشان کو یہ سب نہیں دیکھنا چاہیے تھا وہ کیا سوچ رہے ہوں گے میرے بارے میں' میرا شرم سے برا حال تھا۔

"ہیلو ینگ مین' ہاؤ آر یو؟" ڈاکٹر ذیشان نے اندر آتے ہی اس طرح حشام کو مخاطب کیا جیسے انہوں نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو' انہوں نے اس بات کو یکسر اگنور کردیا شاید انہوں نے میری شرم سے جھکی گردن اور نگاہیں دیکھ لی تھیں۔

"یہ تو آپ زیادہ بہتر بتاسکتے ہیں۔" حشام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ یو آر پرفیکٹ بس پرسوں ہم تمہیں ڈسچارج کررہے ہیں۔ بہت خدمتیں کروالی تم نے بس اب اپنے گھر جاؤ لیکن ہاں ابھی تمہیں ایک نرس کی ضرورت تو رہے گی اور میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اسے ساتھ لے کر جاؤ وہ تمہاری دیکھ بھال اور خدمت کرے گی۔" ڈاکٹر ذیشان نے پہلے حشام کی طرف پھر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی۔" حشام نے حیرت سے کہا۔

"کون سی نرس؟" میرے منہ سے نکلا۔

"ہوں' لگتا ہے اس نرس کا تعارف کروانا ہی پڑے گا۔ میں نے اس کے بارے میں طلال صاحب کو بھی آگاہ کردیا ہے وہ اس بات پر راضی بھی ہیں۔" ڈاکٹر ذیشان نے اپنی مسکراہٹ کو لبوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر ذیشان مجھے کسی نرس کی ضرورت نہیں ہے میں اب ٹھیک ہوں۔" حشام نے گھبرا کر کہا۔

"بالکل ٹھیک ہو لیکن نرس کا تمہارے ساتھ ہونا بہت ضروری ہے۔" ڈاکٹر ذیشان نے اٹل لہجے میں کہا۔

"لیکن ڈاکٹر۔" ابھی حشام اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ روم کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور طلال انکل اور آنٹی اندر آ گئے۔ رسمی سلام دعا کے بعد ڈاکٹر ذیشان طلال انکل سے مخاطب ہوکر بولے۔

"بھئی طلال صاحب آپ کے صاحب زادے تو نرس کو اپنے ساتھ رکھنا ہی نہیں چاہتے۔ اب آپ ہی انہیں سمجھائیں کہ وہ نرس ان کے لیے کتنی ضروری ہے۔"

"بھئی سرمئی بیٹی تم ہی حشام کو سمجھاؤ ہم جو بھی کر رہے ہیں اس کی بہتری اور صحت کے لیے کر رہے ہیں۔ طلال انکل نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔

"مم...... میں کیا کہہ سکتی ہوں انکل؟" میں منمنائی۔

"کہہ کیوں نہیں سکتیں بھئی حشام کو سمجھاؤ۔" انکل نے کہا تو میں نے حشام کی جانب دیکھا اس کے چہرے پر غصہ اور جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔

"ڈاکٹر ذیشان کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ تم کیوں انکار کر رہے ہو۔" میں نے مردہ لہجے میں کہا۔

"یار کیا مصیبت ہے میں اس اسپتال کے ماحول سے گھبرا گیا ہوں کم از کم گھر کو تو گھر رہنے دیں نرس کیا کرے گی مجھے دوائیں وغیرہ دے گی نا وہ میں خود کھالوں گا۔" اب حشام کا غصہ کسی سے پوشیدہ نہیں رہا۔

"نہیں بھئی وہ صرف دوائیں تھوڑی کھلائے گی بلکہ وہ تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں لان میں واک کروائے گی تمہیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلائے گی تم سے اچھی اچھی باتیں کر کے تمہارا دل بہلائے گی۔" ڈاکٹر ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' حشام نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''مجھے کسی نرس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے بھئی تمہاری مرضی۔'' ڈاکٹر ذیشان نے ہار ماننے والے لہجے میں کہا اور ایک گہری سانس لی۔ ''ورنہ ہم لوگوں نے تو یہ سوچا تھا کہ سرمئی نامی اس نرس کا ساتھ پا کر تمہیں اچھا لگے گا تم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تو نہ سہی۔'' انہوں نے کندھے اچکائے۔

''جی...... ای...... امی......!'' میرے اور حشام کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور ڈاکٹر ذیشان اور طلال انکل کا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا انکل طلال اور آنٹی کب کمرے میں آ گئے ہمیں پتا ہی نہ چلا۔ آنٹی بھی مسکراتے ہوئے ہماری جانب آئیں اور مجھے اور حشام کو ایک ایک ہاتھ سے تھامتے ہوئے بولیں۔

''بھئی اب بہت تنگ کرلیا آپ دونوں نے میرے بچوں کو اصل بات میں بتاتی ہوں۔ بات دراصل یہ تھی کہ ہم نے یہ پلان بنایا تھا کہ حشام جب اسپتال سے گھر آ جائے گا تو ہم تمہیں بھی اپنے ساتھ چند روز کے لیے گھر لے جائیں گے اور اس طرح تمہارا اور حشام دونوں کا دل بہل جائے گا اور اس بات کی اجازت میں روشن بہن سے پہلے ہی لے چکی ہوں۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔''

''لیکن وہاں امی اور اماں دونوں اکیلی......!'' میں نے کہا۔

''تم ان کی فکر نہ کرو۔ انہیں بھی ہم کسی نہ کسی طرح بلکہ اسی طرح برقعہ اور حجاب پہنا کر اپنے گھر لے آیا کریں گے جیسے اسپتال میں حشام سے ملوانے کے لیے لائے تھے۔'' طلال انکل نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' حشام نے چہک کر جھٹ کہا تو سب ہنس پڑے۔

اور پھر ٹھیک دو دن کے بعد ڈاکٹر ذیشان نے حشام کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا اور پھر کرنل مشتاق کے ایک خصوصی سیکیورٹی اسٹاف کے ہمراہ ہم حشام کے گھر پہنچ گئے۔

☆......۞......☆
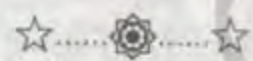
سفیان ان دنوں تقریباً فارغ ہی تھا اس مشن کو مکمل کرنے کے بعد ابھی اسے کسی اور مشن پر بھیجا نہیں گیا تھا البتہ کسی نئے مشن کے لیے تیاریاں جاری تھیں۔ میٹنگز ہوتی رہتی تھیں۔

روزانہ رات کو جب وہ بستر پر سونے کے لیے لیٹتا تو غزالہ مجسم اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ اسے کبھی غزالہ کی آنکھوں میں اپنے لیے خفگی دکھائی دیتی تو کبھی شکوہ، کبھی وہ سرتاپا انتظار بنی ہوتی۔ کبھی غزالہ کی غزالی آنکھوں میں ایک وحشت سی بھری ہوئی اور وہ اس سے کہتی۔

''کب آؤ گے سیفی، کہیں تم اتنی دیر مت کر دینا کہ جب تم یہاں آؤ تو مجھے نہ پاؤ۔''

اور غزالہ کی آنکھوں اور لہجے کی یہ وحشت اسے بھی وحشت زدہ کر دیتی وہ ہڑ بڑا کر اٹھ کے بیٹھ جاتا اور یہ اذیت ناک خیال کسی ناگ کے ڈنک کی مانند اسے چھیدتا رہتا کہ کہیں حقیقت میں ایسا نہ ہو جائے ابھی تو یہ کمٹمنٹ صرف اس کے اور غزالہ کے درمیان تھی ابھی بڑوں تک ان کے دلوں کے فیصلے نہیں پہنچے تھے۔ اب اسے رہ رہ کر پچھتاوا ہونے لگا کہ وہاں سے آتے ہوئے اسے یہ بات اشاروں اور کنایوں میں بے بے کے کانوں میں ڈال دینا چاہیے تھی تاکہ اگر ماما اور مامی اسے کسی دوسری جگہ بیاہنے کا سوچتے تو بے بے فوراً انہیں روک لیتیں۔

پھر اسے یہ سوچ کر تھوڑی تسلی ہو جاتی کہ اس کی چھوٹی بہن سفینہ تو اس کے جذبات اور احساسات

سے آگاہ ہے اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو وہ ضرور اس کا خیال رکھے گی۔

اس نے سوچا کہ وہ سفینہ سے فون پر اس بات کی ضرور تاکید کر دے گا کہ بے بے کے کان میں یہ بات ڈال دے اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کی غزالہ کو لے اڑے بے بے کو ماما جی سے اسے سفیان کے لیے مانگ لینا چاہیے۔

اس روز نجانے کیوں بار بار اس کی نیند ٹوٹ جاتی۔ نیند سے بے دار ہونے کا سبب بھی غزالہ ہی تھی۔ وہ مسلسل اس کے خواب میں آ رہی تھی اور اسے بلا رہی تھی۔ اس وقت جب وہ بے دار ہوا تب بھی وہ غزالہ کو خواب میں دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلسل رو رہی تھی اور اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک نہ دکھائی دینے والی ہستی اسے سفیان سے دور کر رہی تھی۔

وہ ہڑ بڑا کر بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ اس کا دل کہنے لگا ضرور کوئی بات ہے غزالہ کا اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرنا اور کسی کا اسے کھینچ لینا کسی بھی اچھی بات نہ ہونے کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا فجر کی اذان میں تھوڑی دیر ہی باقی تھی اس نے فوراً بستر چھوڑ دیا اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔

اذان ہوئی تو وہ کچن کے احاطے میں موجود مسجد کی جانب چل دیا۔ مسجد نمازیوں سے خالی تھی۔ جماعت ہونے میں ابھی ٹائم تھا۔ وہ ایک جانب بیٹھ کر صدق دل سے اللہ کے حضور دعا کرنے لگا کہ اللہ کرے ایسا کچھ نہ ہو جیسا وہ سوچ رہا ہے کاش یہ خواب اس کے لیے صرف ایک پریشان خیال ثابت ہوا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ گھر پر فون کرے گا اور سفینہ سے کہے گا کہ وہ آج ہی بے بے کو ماما جی کے گھر بھیج دے۔ حالاں کہ ایسا اس ہی کا کہنا تھا کہ وہ سفینہ کی شادی کے بعد ہی اپنی شادی کرے گا لیکن کیا ہوا ابھی وہ شادی تھوڑی کر رہا ہے ابھی تو وہ صرف منگنی کرے گا۔ شادی وہ سفینہ کی شادی کے بعد ہی کرے گا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی اور مطمئن ہو گیا۔

نماز فجر سے فارغ ہو کر وہ ایکسرسائز کے لیے گراؤنڈ میں آ گیا۔ دو گھنٹے کی ہارڈ ایکسرسائز کرنے کے بعد وہ اپنے روم میں آیا اور غسل کے بعد میس میں ناشتے کے لیے چلا گیا۔

ناشتے کے بعد وہ روم میں پہنچا ہی تھا کہ کرنل صاحب کی جانب سے اس کا بلاوا آ گیا۔ اس نے گھر پر فون کرنے کا خیال موخر کر دیا اور کرنل صاحب کے روم کی جانب چل دیا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ کرنل احتشام نے میٹنگ ہال میں طلب کیا ہے۔

ہال میں اس سے پہلے ہی چند دوسرے افراد موجود تھے اس کے وہاں پہنچتے ہی میٹنگ کا باقاعدہ آغاز ہوا، کرنل احتشام نے بتایا کہ ان دنوں پاکستان میں ''ہندوستان کی بدنام زمانہ تنظیم ''را'' اور اسرائیل کی تنظیم ''موساد'' کے ایجنٹ کافی سرگرم ہیں وہ مختلف ناموں حلیوں میں یہاں موجود ہیں اور پاکستان کی سلامتی کے خلاف مل کر کام کر رہی ہیں۔ کہیں جدا جدا اور کہیں مشترکہ کام کر رہی ہیں بعض ایجنٹ ایسے ہیں جو بیک وقت دونوں کے لیے کام کر رہے ہیں۔

ایسے ہی دو ایجنٹ ہماری نگاہ میں آئے ہیں آج رات ہوٹل امپیریل میں وہ دونوں ایک شادی کی تقریب میں شرکت کر رہے ہیں، تمہیں ان دونوں کو صفحہ ہستی سے مٹانا ہے لیکن اگر......'' کرنل احتشام لمحے بھر کو رکے پھر سب کے چہروں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور دوبارہ گویا ہوئے۔

"اگر تم انہیں زندہ پکڑ سکو تو یہ بہت اچھی بات ہوگی اور اگر یہ تمہارے لیے ممکن نہ ہو تو تمہیں اختیار ہے تم انہیں وہیں ٹھکانے لگا سکتے ہو۔"

پھر کرنل احتشام نے ان دونوں کے نام اور تصاویر سفیان کو دکھائیں پھر سب کو ان کی ڈیوٹیز اچھی طرح سمجھائیں اور پھر میٹنگ برخاست ہوگئی۔

سفیان کو اسی روز اپنے مشن پر روانہ ہونا تھا' مشن کیا اس کے ذمہ دیا گیا وہ سب کچھ بھول گیا۔ نہ تو غزالہ یاد رہی اور نہ ہی گھر پر فون کرنا یاد رہا۔

ہوٹل امپیریل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں فیضان اپنی پوری تیاریوں کے ساتھ موجود تھا' اسے بڑی شدت کے ساتھ یہاں ہونے والی شادی کی تقریب اور بارات کا انتظار تھا۔

اس کی اطلاع کے مطابق رات نو بجے بارات کو آنا تھا' وہ کئی مرتبہ نیچے اتر کر باراتیوں کے بیٹھنے والے ہال کا جائزہ لے کر آیا تھا لیکن ابھی تک وہاں کوئی مہمان نہیں آیا تھا۔

اس نے کھڑے ہو کر ہال کا اچھی طرح سے جائزہ لیا' ہوٹل کے ملازمین نے ہال کو تقریب کے لیے بہت سلیقے سے سجایا تھا' دولہا اور دلہن کے بیٹھنے کا اسٹیج بھی فریش پھولوں کی ڈالیوں سے سجایا تھا' سائیڈوں میں پھولوں کے بڑے بوکے رکھے تھے اور درمیان میں مخملیں صوفہ سیٹ رکھا تھا۔

یہ شادی ایک سیاسی لیڈر کی بہن کی شادی تھی۔ اس تقریب میں بہت خاص خاص لوگ ہی انوائٹ تھے' یہاں آنے والے مہمانوں کو خصوصی پاس جاری کیے گئے تھے' سفیان کے پاس بھی اس شادی کا خصوصی دعوت نامہ تھا' وہ ہوٹل کے کمرے میں ایک بزنس مین کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا تھا جو اس شادی کی تقریب میں خصوصی طور پر شرکت کے لیے دوسرے شہر سے آیا تھا اس وقت وہ کسی دوسرے شخص کے میک اپ میں تھا' نام بھی جعلی تھا اور شناختی کارڈ بھی جعلی تھا اور یہ ساری چیزیں اسے کرنل احتشام نے مہیا کی تھیں۔

ہال کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد وہ اپنے روم میں دوبارہ آ گیا' اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے میک اپ کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا۔ وہ جب اس ہوٹل میں آیا تھا تب سیکورٹی نے اس کی مکمل طور پر تلاشی لی تھی' اس کے پاس کسی بھی قسم کا کوئی اسلحہ موجود نہیں تھا۔

ابھی تھوڑی دیر قبل ہی روم کی صفائی کرنے والا عملہ اپنی ٹرالی کے ہمراہ اس کے کمرے میں آیا' انہیں بیڈ شیٹ اور واش روم کا تولیہ وغیرہ تبدیل کرنا تھا اور روم کی صفائی کرنی تھی۔

یہ عملہ جب اس کے کمرے کی صفائی کر کے چلا گیا تب اس کے بیڈ کے نیچے اس کی مطلوبہ اشیاء موجود تھیں۔ اس نے تمام ضروری سامان اپنے کوٹ کی جیبوں میں منتقل کرلیا۔

وہ ٹہلتا ہوا کھڑکی کی جانب آیا تب اس نے دولہا کی سجی سجائی کار کو دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ بارات آ گئی ہے۔

اس نے نیچے جانے سے پہلے ایک بار پھر ریوالور کو چیک کیا اس سے گولیاں نکال کر گراری کو گھما کر چیک کیا' گولیوں کو الٹا پلٹا کر ان کا جائزہ لیا اور پھر ریوالور کو لوڈ کر کے جیب میں رکھ لیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس کا رخ ہوٹل کے گیٹ کی جانب تھا جہاں سے باراتی اندر آ رہے تھے' یہاں پر دلہن والوں کی جانب سے کچھ مرد عورتیں اور لڑکیاں بارات کے استقبال کے موجود تھے۔

باراتیوں میں اسے مختلف سیاسی پارٹیوں کے

خاص خاص ورکرز اور کچھ لیڈران دکھائی دیے لیکن اسے فی الحال ان سے کوئی سروکار نہیں تھا' اس کی کوٹ کی جیب میں ہینڈ گرینڈ بھی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود تھا۔

اس کی نگاہیں بڑی بے قراری کے ساتھ اپنے شکار کو تلاش کر رہی تھیں۔ باراتی اب گاڑیوں سے اتر کر ہوٹل کے گیٹ سے اندر ہال کی جانب بڑھنا شروع ہوگئے تھے اور پھر اچانک ہی اس کی تیز عقابی نگاہوں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ایک بلیک شیشوں والی لینڈ کروزر سے اترا تھا۔

ڈرائیور اسے اتار کر گاڑی کو پارکنگ ایریا کی جانب لے جا رہا تھا اور پھر سفیان کی نگاہوں نے جلد ہی تاڑ لیا کہ چند سادہ کپڑوں میں لوگ اس کے باڈی گارڈز کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی سفیان نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی جانب دیکھا جو مہمانوں میں شامل تھے ان کی نگاہیں آپس میں چار ہوئیں اور ایک دوسرے کو ایک خاص پیغام دے گئیں۔ سب اپنی جگہ الرٹ تھے' سفیان غیر محسوس طریقے سے اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہا تھا۔

وہ سیاہ رنگ کی شیروانی میں ملبوس تھا' چہرے پر خشخشی داڑھی' آنکھوں میں کمانی دار چشمہ تھا اور ہاتھ میں بید کی اسٹک تھی۔ یہ اخوندزادہ ایاز خان تھا۔ کرنل احتشام کے مطابق یہ شخص "را" کا ایجنٹ تھا اگر یہ باآسانی ان کی گرفت میں نہ آ سکے تو اسے وہیں ختم کرنے کا حکم تھا۔

اچانک ہی ایسا کچھ ہوا کہ وہاں ایک ہلچل سی مچ گئی' سفیان کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا تب ہی ایک فائر کی آواز گونجی اور سفیان کی نگاہوں نے ایک سیاسی لیڈر کے سینے سے خون کا فوارہ ابلتے ہوئے دیکھا۔

فائر کی یہ آواز سفیان کے حواس پر بجلی بن کر گری' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اس کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی اپنے شکار کرنے کے لیے آئے ہوں گے۔

اخوندزادہ ایاز خان بھی لمحہ بھر کو حواس باختہ ہوگیا۔ جلد ہی اس کی نگاہوں نے بھی اس سیاسی لیڈر کو دیکھ لیا جو سینے پر ہاتھ رکھے تیزی کے ساتھ نیچے کی جانب جھک رہا تھا' یہ دیکھ کر اس نے ایک اطمینان بخش سانس لی۔

صرف چند لمحوں میں سارا کھیل تمام ہوگیا۔ سفیان اور اس کے ساتھیوں کی نگاہوں کا ایک بار پھر ٹکراؤ ہوا۔

سفیان کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں رینگ گیا اس کا ہاتھ دھواں پیدا کرنے والے ایک چھوٹے سے بم سے ٹکرایا۔

پھر اس کی بجلی کی سی تیز نگاہوں نے اس شخص کو بھی تاڑ لیا جو اپنی جیب میں ریوالور منتقل کر کے تیزی سے باہر کی جانب جا رہا تھا۔

سفیان نے بم نکال کر تیزی سے اچھال دیا ہر جانب دھواں پھیل گیا پھر وہ کسی چیتے کی مانند اڑتا ہوا اپنے دوسرے شکار پر جھپٹ پڑا اور اپنا ریوالور نکال کر اس کی کنپٹی پر لگاتے ہوئے غرایا۔

"ہینڈز اپ۔"

"کون ہو تم؟" دوسرے شخص نے اپنی نگاہیں تیزی سے چاروں جانب گھماتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

لیکن جواب دینے کے بجائے سفیان ایک ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کی جانب موڑ کر اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ وہ بے دردی کے ساتھ اسے گھسیٹتا ہوا باہر کی جانب جا رہا تھا تب ہی ایک سیاہ

شیشوں والی شیورلیٹ سامنے آ گئی اور سفیان اس شخص سمیت گاڑی کے اندر موجود تھا۔
وہ بُری طرح اس کی گرفت میں مچل رہا تھا' تب ہی گاڑی میں موجود دوسرے شخص کے ایک نپے تلے ہاتھ کے وار نے اسے گردن ڈالنے پر مجبور کردیا۔
ہوٹل کے اندر افراتفری مچی ہوئی تھی' چیخ و پکار تھی۔ دوسرے نہ جانے کیسے یہاں گیٹ پر ہر جانب دھواں دھواں ہی تھا۔
دھویں کے یہ بادل چھٹے تو اخوندزادہ ایاز خان وہاں موجود نہیں تھا اس کے باڈی گارڈز آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے چاروں جانب تلاش کررہے تھے اور وہ سیاسی لیڈر جس کو گولی لگی تھی دم توڑ چکا تھا۔
سفیان بہت تیزی کے ساتھ گاڑی بھگاتے ہوئے ہیڈ کوارٹر میں ان لوگوں کو لے آیا اور وہاں پہنچتے ہی کرنل احتشام کو اطلاع دی۔ کرنل احتشام یہ سن کر بے حد خوش ہوئے کہ وہ اس شخص کو زندہ پکڑ لائے ہیں' ساتھ ہی سفیان نے انہیں یہ بھی بتایا کہ ہم نے اس سیاسی لیڈر کے مبینہ قاتل کو بھی پکڑ لیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اس سے بہت سی اہم معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں کیوں کہ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اتنے اہم آدمی کا مرڈر کوئی معمولی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کام کوئی عام آدمی کرواسکتا ہے۔ اس سیاسی لیڈر کی پارٹی اس وقت حکومت میں شامل ہے' اس کے علاوہ انہیں دو دن پہلے بھی ایک صوبائی وزیر کے قتل کی اطلاع مل چکی تھی' آخر یہ کون ہے جو ان لوگوں کو قتل کروا رہا ہے۔
کرنل احتشام سفیان کی اس کارکردگی سے بھی بے حد خوش تھے انہوں نے سفیان کو فوراً واپس آنے کا حکم دیا۔ سفیان نے ان دونوں بندوں کو اپنے آدمیوں کے حوالے کیا اور اپنی پارٹی کے تمام آدمیوں کے ہمراہ واپس آ گیا۔
کرنل احتشام میٹنگ ہال میں ان کے منتظر تھے' ان کے ہمراہ میجر شبیر بھی موجود تھے۔ دونوں نے بہت خاموشی اور دلچسپی سے اس کی ساری روداد سنی' سفیان کی بات مکمل ہوئی تو کرنل احتشام نے بڑے فاخرانہ انداز میں سفیان کی جانب دیکھا پھر میجر شبیر سے مخاطب ہوئے۔
''میں نے آپ سے کہا تھا ناں میجر شبیر کہ میں نے اس بندے میں بہت سی کوالٹی دیکھی ہیں' آپ نے دیکھا میرا فیصلہ کتنا صحیح تھا۔ اس میں جوش و ولولہ تو ہے ہی اس کے علاوہ بہادری کے ساتھ ساتھ یہ عقل مند اور معاملہ فہم بھی ہے اور بروقت اپنی قوت فیصلہ سے کام لیتے ہوئے بہترین فیصلہ کرنا بھی اس کی اضافی خوبیوں میں شامل ہے۔''
''ویل ڈن مائی بوائے!'' میجر شبیر نے تحسین آمیز لہجے میں کہا اور کہتے ہوئے وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر سفیان کے نزدیک آ گئے اور سفیان کی پیٹھ تھپتھپائی۔
ان کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو سفیان بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تعظیماً اپنے سر کو ذرا سا خم دے کر جھکا دیا' پھر اس نے کہا۔
''میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''
''ضرور کہو۔'' کرنل احتشام نے کہا۔
''بات یہ ہے کہ سر کہ یہ کارنامہ اکیلا میرا نہیں ہے اس میں میرے ساتھ میری پوری ٹیم شامل تھی اور یہ سب بھی اتنے ہی ذہین اور چاک و چوبند ہیں جتنی تعریف آپ نے میری کی ہے اگر یہ لوگ بروقت میری نگاہوں کے اشارے نہ سمجھتے اور کام نہ کرتے تو ہم یوں کامیاب نہ ہوتے۔'' میری بات سن کر میجر شبیر نے دھیرے سے تالی بجا کر ایک بار پھر مجھے سراہا پھر بولے۔
''آج تم آرام کرو' کل تم ہی ان لوگوں سے پوچھ گچھ کا کام انجام دینا۔ ہم یہ بھی تو دیکھیں کہ تم کس طرح ان کے سینے سے راز اگلواؤ گے۔''
جواباً وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھک گیا اور پھر ان سے جانے کی اجازت طلب کی۔ سفیان اور اس کی ٹیم کے افراد باہر نکل آئے' اس نے فرداً فرداً ان لوگوں سے بات کی اور انہیں سراہا۔
سفیان اپنے روم میں آیا اور غسل کرکے نماز ادا کی' ساتھ ہی شکرانے کے نوافل بھی ادا کیے کہ اللہ کریم نے اس کی بھرپور مدد کی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہا لیکن ابھی ایک اور سخت مرحلہ باقی تھا ان کے سینے سے بہت سے راز اگلوانے تھے' اس کے لیے بھی اللہ سے مدد کی دعا مانگی اور لیٹ گیا' ذرا ہی دیر بعد وہ گہری اور پُرسکون نیند سو گیا۔
اگلے دن ناشتے سے فارغ ہوکر سفیان نے کرنل احتشام کو مطلع کیا اور ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ سفیان نے روم میں جاکر دونوں کو دیکھا' یہ بتادوں کہ ہم نے ان دونوں کو الگ الگ روم میں رکھا ہوا تھا۔
سفیان اخوندزادہ ایاز خان کے کمرے میں گیا تو وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورنے لگا اور بولا۔
''ہمیں کیوں یہاں اس طرح مجرموں کی طرح پکڑ کے لایا گیا ہے' آخر میرا قصور کیا ہے' میں اس ملک کا ایک باعزت شہری ہوں۔ بزنس کرتا ہوں اور میرے بہت اوپر تک تعلقات ہیں' تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ مجھے فوراً چھوڑ دو ورنہ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا نہیں کرواسکتا۔'' سفیان نے بہت اطمینان سے اس کی بات سنی اور آگے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔
تھپڑ اتنی زور کا تھا کہ ایاز خان الٹ کر پیچھے کی جانب گر پڑا۔ تھپڑ کی شدید ضرب سے اس کا رخسار اندر سے پھٹ گیا اور اس کی باچھوں سے خون بہہ نکلا۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنی باچھوں سے بہنے والا خون صاف کرتے ہوئے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا پھر ہکلاتے ہوئے بولا۔
''مم...... میرا قصور کیا ہے...... کو...... کون ہو...... تم لوگ...... اور مجھے یہاں کیوں اٹھا کر لائے ہو؟''
جواب میں سفیان نے ایک اور زناٹے دار تھپڑ اس کے دوسرے گال پر الٹے ہاتھ کا رسید کیا۔ اب تو مزید تیزی سے اس کے منہ سے خون بہنے لگا اور وہ کھا جانے والی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔
''فکر مت کرو مہاشے! تمہیں سب پتا چل جائے گا کہ تمہیں یہاں کیوں اور کس لیے لایا گیا ہے بلکہ میرا خیال ہے تمہیں یہ بات بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ تم خود اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ تم کون ہو اور ہم تمہیں کیوں یہاں لائے ہیں۔ تم نے کیا سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں' دیکھ لو ایسا بالکل بھی نہیں ہے اور تمہارے لاکھ بہروپ بدلنے کے باوجود ہم تمہیں پہچان گئے اور آج تم ہمارے پاس ہو۔''
''لیکن...... دیکھیں آپ کو یقیناً بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے' آپ کسی اور کے دھوکے میں......'' وہ منمنایا۔
''شٹ اپ!'' سفیان دہاڑا اور تیزی سے اس کے روم سے باہر نکل آیا۔
ایاز خان کے پاس سے آ کر سفیان ایک بار پھر اس فائل کا مطالعہ کرنے لگا جس میں ایاز خان کے بارے میں ساری انفارمیشن موجود تھیں۔ فائل کے مطابق ایاز خان' جس کا اصل نام راجیش پٹیل تھا۔ وہ ''را'' کا ایک بہت زیرک اور شاطر ایجنٹ تھا اور پچھلے

سات سال سے پاکستان میں اخوند زادہ ایاز خان کے نام سے ایک بزنس مین کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ ایجنسی والے اس کو کافی عرصے سے واچ کررہے تھے وہ سرخ وسپید رنگت کا اور بھاری تن و توش کا مالک تھا۔ دیکھنے میں وہ کسی قبائلی پٹھان کی مانند لگتا تھا' اس کے سائیڈ بزنس کے طور پر غیر ملکی اسلحہ کی ترسیل' منشیات کی اسمگلنگ بھی تھی۔ کل جس سیاسی لیڈر کا قتل ہوا تھا اس کے لیے بھی یہ خیال تھا کہ اس میں بھی اخوندزادہ ایاز خان ملوث ہے۔

اب جب کہ وہ ان کے ہاتھ آچکا تھا تو اس سے بہت کچھ اگلوانا تھا' یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ اس کے یہاں کن کن لوگوں سے تعلقات ہیں۔ جس طرح یہ ایک مسلمان تاجر کے بھیس میں رہ کر اپنی مذموم کارروائیاں کررہا تھا اسی طرح اس کے دوسرے ساتھی بھی یقیناً ہوں گے اس کے علاوہ ایک عورت فیروزہ نامی جوڈھکے چھپے ایک فحاشی کا اڈہ چلارہی تھی اور شوقین مزاج امیرزادوں کو لڑکیاں سپلائی کرتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی ایاز خان کے کافی قریبی مراسم تھے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایاز خان کا تعلق بھی ایک شوقین مزاج اور عیاش مرد کی حیثیت سے فیروزہ کے ساتھ ہو اور یہ بھی بہت ممکن ہے کہ وہ بھی اس کی ساتھی ہو اور پاکستان میں فروغ پانے والی دہشت گردی میں اس کا بھی اتنا ہی حصہ ہو جتنا ایاز خان کا ہے۔

اس سے پہلے بھی کئی کیسز میں یہ بات سامنے آچکی تھی کہ ''را'' کے یہ ایجنٹ حسین اور جوان لڑکیوں کو بڑے بڑے بیوروکریٹس' سیاسی لیڈرز اور کارکنان اور حکومت میں موجود اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں کے پاس تحفے کے طور پر بھیجتے ہیں اور پھر وہ ان سے بہت سی اہم معلومات حاصل کرکے ''را'' کے ان ایجنٹس کے حوالے کردیتی ہیں' ملک کی سلامتی اور اسلام دونوں کے لیے یہ فحاشی پھیلانے والی لڑکیاں خاصا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

کرنل احتشام نے اپنی میٹنگ کے دوران یہ بھی بتایا تھا کہ فیروزہ نامی اس عورت کی بھی کڑی نگرانی کی جارہی ہے اور دیکھا جارہا ہے کہ وہ لڑکیاں کہاں اور کن لوگوں کے پاس بھیج رہی ہے۔ فوری طور پر اس پر شک کیے جانے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس کی ایک لڑکی آج کل ایک فوجی کیپٹن کے ساتھ دیکھی جارہی ہے۔

ایاز خان کے مطابق یہ ساری باتیں اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد سفیان اس شخص کے کمرے میں گیا جس نے اس سیاسی لیڈر کو فائرنگ کرکے قتل کرڈالا تھا۔ اس کا پستول تو پہلے ہی ان لوگوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور اس کی گولی کی ساخت کی بھی پڑتال کرلی گئی تھی۔ اب صرف اس سیاسی لیڈر کے جسم میں موجود اس گولی کی رپورٹ آنا باقی تھی تاکہ دونوں کو میچ کیا جاسکے اور یہ بات قطعی طور پر کنفرم ہوسکے کہ اس سیاسی لیڈر جس کا نام بہروز ملک تھا' اس کا قاتل یہی شخص ہے۔

ویسے تو براہ راست ان لوگوں کا تعلق پولیس سے نہیں تھا اور نہ ہی یہ لوگ ان کے کاموں میں مداخلت کرتے تھے لیکن وہاں بھی ان کے بہت سے خاص بندے موجود تھے جو بظاہر تو محکمہ پولیس کے ملازم تھے لیکن اصل میں وہ ایجنسی کے بندے تھے۔ اس لیے بہروز ملک کی پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کرنا کچھ بھی مشکل کام نہیں تھا۔

ابھی اس شخص کی گرفتاری سب سے خفیہ اس لیے رکھی گئی تھی کہ یہ دور میڈیا کا دور ہے اور یہاں کوئی بھی بات لمحہ بھر بھی چھپی نہیں رہ سکتی اگر ایاز خان اور اس شخص کی گرفتاری کی خبر عام ہوگئی تو ''را'' والے پوری طرح الرٹ ہوکر انڈر گراؤنڈ ہوجائیں گے اور اگر ایسا ہوجاتا تو ان کے لیے مزید مشکلات پیدا ہوجاتیں۔

سفیان اس کے کمرے میں آیا تو وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اس کے دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے ہی لوہے کی ایک زنجیر سے بندھے ہوئے تھے اور زنجیر ایک لوہے کے کڑے سے منسلک تھی جو دیوار میں پیوست تھا اور اس کی دونوں ٹانگیں الگ الگ کرکے باندھی گئی تھیں وہ بھی زنجیر دیوار میں گڑھے ایک لوہے کے کڑے سے منسلک تھیں۔

سفیان جب اس کے روم میں پہنچا تو اس کے چہرے پر اپنے ملک کے اس دشمن کو دیکھ کر خود بخود سفاکی اور درندگی امڈ آئی۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ایک دوسرے میں کچھ اتنی سختی کے ساتھ بھینچی ہوئی تھیں کہ وہ اس کے چہرے سے بالکل الگ دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بید کی چھڑی تھی جس کے سرے پر لوہے کا ایک خول چڑھا ہوا تھا۔ سفیان نے اپنی شعلہ برساتی ہوئی نگاہیں اس شخص پر گاڑی ہوئی تھیں پھر اس نے آواز دے کر جنید کو بلایا۔

جنید کمرے میں آیا تو اس نے ایک ہاتھ میں کاغذ قلم اور دوسرے میں ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ تھا۔ وہ کمرے کے کونے میں رکھی کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور قریب ہی رکھی چھوٹی سی میز پر ٹیپ ریکارڈ رکھ کر اسے آن کردیا۔

''تمہارا نام؟'' سفیان نے اپنی تیز نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں پتا ہوگا۔'' اس نے بے زار کن لہجے میں جواب دیا اور لمحہ بھر کو سر اٹھا کر دوبارہ گردن جھکالی۔

''کس کے لیے کام کرتے ہو؟ میرا مطلب ہے کس کے کہنے پر تم نے مہروز ملک کا قتل کیا ہے؟'' سفیان اس کے جواب کو بڑے صبر کے ساتھ پیتے ہوئے بولا۔

''یہ بات بھی تمہیں معلوم ہوگی؟'' اس نے سفیان کی نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سابقہ لہجے میں جواب دیا۔

''چلو یہ بتادو کہ کس کے کہنے پر یہ قتل کیا ہے؟'' سفیان نے اپنا غصہ دبانے کے لیے اپنے ہونٹوں کو بھینچ کر سوال کیا۔

''اپنی مرضی سے۔'' اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا پھر تمسخرانہ انداز میں دھیرے سے ہنسا اور بولا ''میرا دل چاہ رہا تھا بس میں نے اسے ماردیا...... سالا...... الو کا پٹھا۔''

''تمہارا دل بھی بہت خوب ہے وہ بڑے عجیب عجیب سے کام کرنے کے لیے تم سے کہتا ہے اور تم کر گزرتے ہو۔'' سفیان نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

''تو تم اس طرح نہیں مانو گے میں نے تو یہ سوچا تھا کہ بہت آرام سے سیدھی طرح تم سے بات کروں گا لیکن میری یہ شرافت تمہیں راس نہیں آرہی ہے تو پھر ٹھیک ہے تم اگر ایسا چاہتے ہو تو ایسا ہی سہی حالاں کہ میں کبھی کسی پر سختی نہیں کرتا۔ بہت رحم دل واقع ہوا ہوں تم خود ہی مجھے سختی پر مجبور کررہے ہو۔'' سفیان نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا کرلو گے تم...... یہی ناں زیادہ سے زیادہ میری جان لے لو گے۔ تو لے لو میں نفرت کرتا ہوں اپنی زندگی سے۔'' اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا تو سفیان چند لمحے کھڑا اس کی شکل دیکھتا رہا پھر اس نے جنید کو اشارہ کیا کہ وہ ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آف کردے۔ جنید نے اس کے اشارے پر ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آف کردیا اور کاغذ اور قلم میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''رستم خان کو بلواؤ...... کوئیک!'' سفیان نے کہا

تو جنید تیزی سے روم سے نکل گیا۔ سفیان اس خالی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جس سے جنید ابھی اٹھ کر گیا تھا۔ اس شخص نے دوبارہ سر اٹھا کر سفیان کی جانب دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

صرف پانچ منٹ بعد ہی جنید رستم خان کے ہمراہ کمرے میں موجود تھا۔ رستم خان ایک مضبوط اور بھری جسامت کا لمبا تڑنگا شخص تھا۔ چہرے کے نقوش سے سختی چھلک رہی تھی' اس نے آتے ہی سفیان کو سلیوٹ کیا اور زوردار آواز میں بولا۔

''یس سر!''

''آؤ رستم خان! ہمارا ایک مہمان تمہاری میزبانی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ ہم تو اسے ہلکی پھلکی غذا دینا چاہتے تھے لیکن یہ بڑی بھاری دعوت اڑانا چاہتا ہے آؤ اس کی ٹھیک ٹھاک خاطر مدارت کرو۔'' سفیان یہ کہتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اس کی نگاہیں اس شخص پر گڑھی ہوئی تھیں۔ وہ پھر بولا۔

''اس کے سینے میں جو راز پوشیدہ ہیں یہ انہیں اگلنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے اس چھت پر پنکھے کی طرح الٹا لٹکا دیا جائے تاکہ اس کے سینے میں جو کچھ بھی ہے وہ اس کی ناک کے راستے باہر خود بخود نکل آئے۔'' سفیان نے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

سفیان کی زبان سے یہ حکم سنتے ہی رستم خان بڑی سرعت کے ساتھ حرکت میں آیا اور اس نے جنید کے ساتھ مل کر چھت میں لگے ایک آہنی آنکڑے کے ساتھ لٹکتی ہوئی زنجیر سے الٹا لٹکا دیا۔

الٹا لٹکتے ہی اس کے جسم کا سارا خون سر اور چہرے کی جانب سمٹ آیا' پہلی مرتبہ سفیان کو اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں لہراتی ہوئی دکھائی دیں۔

اور پھر سفیان کے ہی اشارے پر جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ بُری طرح تڑپنے لگا۔ جنید کے ہاتھ میں بجلی کا تار تھا جو وہ لمحہ بھر کو اس لوہے کی زنجیر کے ساتھ ٹچ کر دیتا جس سے بندھا وہ شخص الٹا لٹکا ہوا تھا برقی رو چند سیکنڈ میں اس کے جسم سے گزرتی اور اسے ہلا کر رکھ دیتی وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی مانند ڈکارنے لگتا۔

سفیان اطمینان سے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا اس کی اس چیخ و پکار کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

''ارے رستم خان! تم نے بکرا تو لٹکا دیا ہے اس کی کھال نہیں اتارو گے۔''

''کیوں نہیں جناب! کھال بھی اترے گی اور پائے بھی بنیں گے۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''تو پھر انتظار کس کا ہے' شروع ہو جاؤ۔'' سفیان نے کہا تو رستم خان ایک بہت لمبی اور باریک نوک والا چاقو لے کر آ گیا' اس شخص نے جب رستم خان کے ہاتھوں میں چاقو دیکھا تو چیخ اٹھا اور بولا۔

''الو کے پٹھے! میں نے بتایا تو تھا کہ میں نے کسی کے بھی کہنے پر اس کو نہیں مارا تھا' میری پرانی دشمنی تھی اس کے ساتھ۔ پرانے حساب کتاب نکلتے تھے اس کی طرف۔ میں نے موقع دیکھتے ہی اسے مار ڈالا۔''

اس کی آواز درد اور اذیت کی شدت سے پھٹی جا رہی تھی' گردن کی ساری رگیں پھول کر ابھر آئی تھیں' ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی پھٹ پڑیں گے۔

''رستم خان اپنا کام شروع کرو' ہمارے ہاں بکروں کو پہلے ذبح کیا جاتا ہے' ان کی جان جب نکل جاتی ہے تب ان کی کھال اتاری جاتی ہے لیکن ہم اس کی جان نکلنے نہیں دیں گے۔ اس کی کھال اسی طرح سے اتاریں گے' کھال اتر جائے تب اس کے دونوں پاؤں گھٹنوں سے کاٹ کر علیحدہ کر دینا۔'' سفیان نے کہا اور دوبارہ کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

رستم خان نے اس کی ننگی کمر پر چاقو کی تیز اور پتلی نوک سے ایک چرکہ لگایا تو وہ تڑپنے اور مچلنے لگا لیکن رستم خان کا ہاتھ نہیں رکا اس نے دوسرا چرکہ لگایا اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا کھال کر اتار کر ہاتھ میں لے لیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''اتنے چھوٹے چھوٹے پیس ٹھیک رہیں گے یا سالم ہی کھال اتار لوں۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے' پلیز اس کو روکو۔ میری بات کا یقین کرو' میں سچ بول رہا ہوں۔'' وہ بُری طرح تڑپنے اور مچلتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے اس کے تکے بھوننے کے لیے ایک جلتی ہوئی انگیٹھی اس کے سر کے نیچے رکھ دو اور اس کے جسم پر جہاں سے کھال اتاری ہے وہاں مسالہ لگا دو۔'' سفیان نے کہا۔

''نہیں نہیں خدا کے لیے...... مم...... میں بتاتا ہوں...... میں سب کچھ بتاتا ہوں' مجھے نیچے اتارو۔'' وہ بُری طرح رو پڑا۔

''لگتا ہے تمہاری عقل ٹھکانے پر آ گئی ہے لیکن یہ بات یاد رکھنا میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں اگر تم نے ڈنڈی مارنے کی کوشش کی تو تمہارے جسم کے تکے بھون کر تمہیں ہی کھلائیں گے اور تمہیں مرنے بھی نہیں دیں گے۔'' سفیان نے سفاک لہجے میں کہا۔

''مم...... میں...... وا...... وعدہ کرتا ہوں سچ...... بالکل سچ بولوں گا۔'' اس نے بمشکل کہا اور اس کی آواز بلند ہو گئی۔ وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔

سفیان کے اشارے پر رستم اور جنید نے اسے نیچے اتارا اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ زمین پر آ کر وہ منہ کھول کر گہری گہری سانسیں لینے لگے پھر سفیان کے اشارے پر اسے پہلے کی طرح زنجیروں سے باندھ دیا گیا اور رستم نے خون روکنے والی دوا اس کی کمر پر اس جگہ لگا دی جہاں سے اس نے کھال اتاری تھی۔

وہ اب پوری طرح بے ہوش ہو چکا تھا' رستم اپنا کام کر کے جا چکا تھا۔ جنید نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آنے لگا۔

جنید ایک بار پھر کرسی پر کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا اور سفیان اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اس کا چہرہ ہلدی کی مانند ہو رہا تھا اس کا سارا دم خم نکل چکا تھا اور وہ ایک ہارا ہوا انسان دکھائی دے رہا تھا۔

''اب ہو جائے مطلب کی بات' کیا خیال ہے؟'' سفیان نے اس کی آنکھیں کھلی دیکھیں تو کہا۔ جواب میں اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سفیان نے ایک بار پھر اس سے گزشتہ کیے گئے سوالات دہرائے جن کے اس نے شرافت کے ساتھ جوابات دیتے ہوئے بتایا۔

''میرا نام طارق ہے' میرا تعلق پنجاب سے ہے' یہیں میں پیدا ہوا' پلا بڑھا' تعلیم حاصل کی۔ میرے والدین بہت غریب لیکن شریف تھے' ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ افسوس ناک بات یہ تھی اور شاید میری بدقسمتی بھی کہ میرے والدین کی آٹھوں اولادوں میں لڑکا صرف ایک میں ہی تھا اور یہ بھی میری بدنصیبی کہ سب سے بڑا تھا۔

ابا شاید اس لالچ میں بچے پیدا کرتے گئے کہ شاید اس بار ایک اور لڑکا پیدا ہو جائے لیکن سات بیٹیاں لائن سے پیدا ہو گئیں۔ ابا خود تو ایک گارے مٹی اور اینٹوں کا بوجھ اٹھانے والے مزدور ہی تھے لیکن مجھے وہ اچھی تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا

کہ اسی منحوس غربت کے باعث میرے والدین نے مجھے تعلیم نہیں دلوائی لیکن میں اپنے بیٹے کی راہ میں اپنی اس غربت کو آڑے نہیں آنے دوں گا۔

میں اسکول جاتا رہا ابا مزدوری کرتے رہے وہ میری تعلیم کا بوجھ بھی اٹھا رہے تھے اور سات بہنوں کا بوجھ بھی ان کے سر پر تھا پھر ایک دن ابا گارے کی تگاری اٹھائے ہوئے اونچی سیڑھی سے زمین پر آن گرے اور ہاتھ پاؤں تڑوا کر بستر پر آ گئے۔

میں ان دنوں میٹرک میں تھا کیا کرتا' تعلیم چھوڑ دی اور مزدوری کرنے لگا۔ یہیں پر میری ملاقات بشیر سے ہوئی۔ وہ ٹھیکیدار کے ساتھ آیا کرتا تھا' اس نے ہی مجھے سگریٹ کی لت لگائی۔ کبھی کبھی میری مالی مدد بھی کر دیا کرتا تھا اس نے مجھ سے بڑی پکی دوستی گانٹھ لی۔

میں اس کے سامنے اپنی مالی مشکلات کا رونا بھی رویا کرتا تھا' بہنیں جوان ہو رہی تھیں۔ ان کی شادی بھی کرنی تھی۔ میری مزدوری کی رقم سے ہمارے پیٹ کی آگ بھی نہیں بجھتی تھی شادیاں کیسے ہوتیں۔ میں دن رات غم و فکر میں ڈوبا رہتا' ایک دن بشیر مجھے اپنے ساتھ دوستوں میں لے گیا اور انہوں نے مجھے چرس سے بھرا ہوا سگریٹ پلا دیا' اسے پی کر تو میں فضاؤں میں پرواز کرنے لگا ہر جانب رنگ ہی رنگ دکھائی دینے لگے۔

مجھے بہت مزا آیا' میں گھر اور گھر والوں کی جانب سے دن بدن بے پروا ہوتا چلا گیا۔ کئی کئی روز گھر نہیں جاتا' نہ ماں کو پیسے دیتا۔ ایک دن کسی نے مجھے اطلاع دی کہ تمہاری ماں مر گئی ہے' میں نشے میں ڈوبا ہوا تھا' اس کی میت کو کاندھا بھی نہ دے سکا۔ ہوش آیا تو جیسے آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ بہت سی باتیں معلوم ہوئیں' میری بہنیں بُرے دھندے میں پڑ گئی تھیں۔ کیا کرتیں جہاں مزدوری کرنے گئیں ان لوگوں نے انہیں مفت کا مال سمجھ کر ہڑپ کرنا چاہا تو انہوں نے ایک عورت کے کہنے پر اپنے دام لگا لیے ایک بہن نے خودکشی کر لی۔

میرا دل چاہا کہ خود کو گولی مار لوں یا اس بے رحم دنیا کو آگ لگا دوں۔ ایک بار پھر بشیر میرے کام آیا' وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اخوندزادہ ایاز خان کے پاس آیا۔ اس کے کہنے پر اور اس کی پشت پناہی پر میں نے بہت سے بُرے کام کیے۔ غیر قانونی دھندے کیے' وہ مجھے میرے کاموں کا بڑا بھاری معاوضہ دیا کرتا تھا۔

اس رقم سے میں نے اپنی باقی بچ جانے والی بہنوں کی شادیاں کر دیں' دو گھر سے غائب ہو گئی تھیں ایک نے خودکشی کر لی تھی۔ باقی چاروں کی میں نے شادیاں کر دیں' اب میں فارغ تھا۔ آزاد تھا اخوندزادہ ایاز خان کے ساتھ میں نے بڑی عیاشی کی زندگی گزاری ہے۔ دنیا کی ہر خوشی اور عیش مجھے نصیب ہوا' تو کیا اس کے کہنے سے میں یہ ایک چھوٹا سا کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ مہروز ملک کا کام تمام کرنا ہے میں نے کہا' "کر دیتے ہیں شادی کی اس تقریب میں وہ بھی تو آیا تھا۔" اتنا کہہ کے وہ خاموش ہو گیا۔

"ہوں تو یہ ہے تمہاری کہانی۔" سفیان نے پُرسوچ لہجے میں کہا پھر پوچھا "ایاز خان کے بارے میں تم اور کیا جانتے ہو' کچھ اس کے بارے میں بھی بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں میں اس کے بارے میں' ایاز خان ایاز خان ہے۔ خشک میوہ کا بزنس کرتا ہے اور مجھ جیسے بے سہارا اور پریشان حال نوجوانوں کے کام آتا ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا طارق مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے ایاز خان کے کہنے پر اور کون کون سے کارنامے انجام دیے ہیں۔" سفیان نے پوچھا۔

"میں نے مہروز ملک سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو ایاز خان کے کہنے پر قتل کیا ہے۔ اس کا بہت سا اسلحہ اسمگلنگ ہو کر بھارت سے یہاں آتا ہے۔ میں اس کے کئی کاموں سے غیر قانونی طریقے سے بھارت بھی جا چکا ہوں۔ اس کا منشیات کا دھندا بھی ہے لیکن ایک بات میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ایاز خان کے اوپر بھی کچھ لوگ ہیں جن کے کہنے پر وہ یہ سارے کام کرتا ہے۔" طارق نے مزید بتایا۔

"کبھی ایاز خان نے ملک میں بم بلاسٹ بھی کروائے ہیں۔" سفیان نے پوچھا۔

"ہاں کروائے ہیں' خود میں نے بھی دو جگہ بم بلاسٹ کیے ہیں۔ ایک شاپنگ مال والا ۲ مئی کا بم بلاسٹ اور دوسرا ایک مذہبی جلوس میں ہونے والا بم بلاسٹ ۱۸ ستمبر کو ہوا تھا وہ میں نے ہی کیے تھے۔" طارق نے اطمینان سے جواب دیا۔

"سنا ہے فیروزہ نامی ایک عورت کے ایاز خان سے بڑے قریبی تعلقات ہیں تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" سفیان نے اس کے نزدیک فرش پر پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ وہی حرام زادی کتیا ہے جس نے میری بہنوں کو بُرے دھندے پر لگایا تھا۔" طارق نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"پھر تم نے اس سے یا ایاز خان سے اس کی شکایت نہیں کی؟" سفیان نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کی تھی' اس کتیا کا یہ کہنا تھا کہ میری بہنیں تو گلی گلی رُل رہی تھیں اس نے انہیں عزت سے روزگار پر لگا دیا۔"

"کیا تم یہ بات جانتے ہو کہ وہ اپنے ساتھ رہنے والی لڑکیوں کو حکومتی عہدوں پر فائز بڑے آدمیوں کے پاس کیوں بھیجتی ہے۔"

"ہاں تاکہ وہ بہت سے قیمتی راز ان کے حوالے کر سکیں' شراب کا جب نشہ سر چڑھ کے بولے اور سامنے بے حجاب حسن اس کو لالچ دے تو سالا بڑے سے بڑا مرد بھی الو کا پٹھا بن جاتا ہے۔ ایک رنڈی کے ہاتھوں میں بھی کٹھ پتلی بن جاتا ہے اور پھر ہمیشہ ان تصویروں اور ویڈیوز کے ذریعے بلیک میل ہوتا رہتا ہے۔ جس میں وہ مادر پدر آزاد اس لڑکی کے ساتھ داد عیش دے رہا ہوتا ہے۔" اس نے مردوں کو ایک اور ناقابل اشاعت فحش خطاب سے نوازتے ہوئے کہا۔

"کیا تم مجھے ان چند لوگوں کے نام بتا سکتے ہو جو ان کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہے ہیں اور ہاں بلیک میلنگ کا یہ کام کون انجام دیتا ہے؟" سفیان نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

"ہاں دو چار سے تو میں بھی واقف ہوں' ایک فوجی میجر ہے نیاز سلطان نام ہے اس کا۔ اس کے علاوہ ایک فلمی اداکار ہے' دو بندے پولیس کے محکمے سے ہیں اور ان کو بلیک میل کرنے کا کام ایاز خان خود کرتا ہے۔"

"کیا ایاز خان انہیں یہ بتاتا ہے کہ وہ ایاز ہے؟"

"نہیں! وہ کوئی اور نام استعمال کرتا ہے۔"

"اچھا طارق یہ بتاؤ کہ مہروز ملک کو ایاز خان نے کیوں قتل کروایا آخر ایسی کیا بات تھی؟" سفیان نے لمحوں کی خاموشی کے بعد سوال کیا۔

"مہروز خان بھی فیروزہ بائی کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکا تھا اور پھر کسی طرح اس نے ایاز خان کو پہچان لیا۔ اس نے ایاز خان کو دھمکی دی تھی۔ اس لیے ایاز خان نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔"

"تو کیا وہ ساری تصاویر اور ویڈیو ایاز خان کے پاس محفوظ ہیں؟ اگر ہیں تو کہاں رکھی ہیں؟" سفیان نے پوچھا۔

”وہ تمام تصاویر اور ویڈیوز ایاز خان کے پاس ہی ہیں لیکن کہاں رکھی ہیں یہ میرے علم میں نہیں ہیں۔“ طارق نے جواب دیا۔

”ایاز خان نے فیروزہ بائی کو بڑی بھاری رقم دی ہوگی ان تصاویر اور ویڈیوز کے عوض۔“ سفیان نے پوچھا۔

”معاوضے کا تو مجھے معلوم نہیں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ دونوں اس کام میں پارٹنر ہیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ ایاز خان کے اور کن کن لوگوں سے قریبی تعلقات ہیں۔ اس کے دیرینہ ساتھیوں کے نام اور پتے بتاؤ۔“ سفیان نے سوال کیا تو جواب میں طارق نے چند مزید لوگوں کے نام اور پتے بتادیئے۔

”کیا کبھی فیروزہ بھی غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کر کے بھارت گئی ہے؟ یہ بات تمہارے علم میں ہے؟“ سفیان نے پوچھا۔

”اس کا مجھے علم نہیں ہے ہاں ایک اور شخص ہے وہ محکمہ پولیس میں ڈی ایس پی ہے وہ ایاز خان کا بہت گہرا دوست ہے وہ کئی مرتبہ بھارت جاچکا ہے۔“

طارق نے جب اس ڈی ایس پی کا نام بتایا تو سفیان بُری طرح چونک پڑا پھر وہ مزید کرید کرید کر اس سے اس ڈی ایس پی کے بارے میں سوالات کرتا رہا اور طارق جوابات دیتا رہا۔

”ایک آخری سوال...... امید ہے کہ تم اس کا بھی پوری سچائی کے ساتھ جواب دو گے۔“ سفیان نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم ایاز خان کی اصلیت سے واقف ہو؟“

جواب میں ٹیپ ریکارڈ کی مانند بجتا ہوا طارق بالکل خاموش ہوگیا۔ سفیان تھوڑی دیر تک تو اس کے بولنے کا منتظر رہا پھر طارق کی جانب سے کوئی جواب نہ پاتے ہوئے بولا۔

”لگتا ہے واقف ہو...... کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں۔ بولو جواب دو؟“

طارق نے سفیان کا سوال سن کر مزید سر کو جھکالیا تو سفیان نے اس کے نزدیک بیٹھ کر اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اس کا سر اونچا کر کے سخت لہجے میں پوچھا تو اس نے منہ سے جواب دینے کے بجائے صرف پلکیں جھپک جھپک کر ہاں میں اشارہ دیا تو سفیان نے ایک زور کا جھٹکا دے کر اس کے بالوں کو چھوڑ دیا اور دہاڑنے کے انداز میں بولا۔

”لعنت ہے تیرے مسلمان اور پاکستانی ہونے پر۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم اس کا ساتھ دیتے رہے۔“

”اس کی اصلیت کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا تھا اور اس وقت میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ میرے پاس کوئی چوائس نہیں تھی سوائے اس کے کہ اپنے لبوں کو سی کر ہر حکم بلا چوں و چرا مانتا جاؤں کیوں کہ میرے کیے گئے ہر جرم کا ثبوت اس ڈی ایس پی کے پاس موجود ہیں۔ میری نافرمانی کی سزا میں وہ مجھے زندہ درگور کر دیتا اور اس کے علاوہ میری چاروں شادی شدہ بہنیں اور ان کے بچے ان لوگوں کے نشانے پر ہیں۔ میں کیا کرتا میرے آگے کھائی اور پیچھے کنواں تھا۔ میری تقدیر نے مجھے ایاز خان کے در پر لا پھینکا اور میں ایک انسان سے درندہ بن گیا۔ آج آپ کے سامنے سب کچھ سچ اس لیے بھی بتا دیا ہے کہ میں خود اب اس زندگی سے عاجز آچکا ہوں میں تو خود یہ بات بھول ہی گیا ہوں کہ میں ایک مسلمان بھی ہوں اور میری ماں اور باپ شریف لوگ تھے۔ روز قیامت میرے ان گناہوں کو نہ تو اللہ معاف کرے گا اور نہ ہی میں اپنے والدین سے آنکھ ملا سکوں گا۔“ اتنا کہہ کر طارق نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔

سفیان وہاں سے فوراً چلا آیا اور جنید سے اس نے کہا کہ اس کو دوسرے سیل میں منتقل کردو اور اس کی ٹھیک طریقے سے مرہم پٹی کرو۔ کھانے کو بھی کچھ دو لیکن خیال رہے کہ ان کی زنجیریں ڈھیلی نہ ہوں۔ یہ بہت بڑا مجرم ہے اپنے ملک کا اور اس میں بسنے والے کروڑوں پاکستانیوں کا۔

☆......۞......☆

نواب سطوت کی ہدایت پر ایک بار پھر میں اپنا کام انجام دے کر اپنے گلشن اقبال والے فلیٹ پر آ گیا لیکن جیسے ہی میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

میرے فلیٹ کا سارا سامان بکھرا پڑا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سارا سامان ادھڑا ہوا پڑا تھا۔ صوفوں کے کور کٹے پھٹے ہوئے تھے بیڈ کا گدا ادھڑا ہوا تھا۔ فرش سے سارا قالین سمیٹ کر ایک جگہ رکھا ہوا تھا۔ الماری کے پٹ کھلے پڑے تھے اور ان میں موجود کپڑے اور دوسرا سامان باہر پڑا ہوا تھا۔

اور تو اور تلاشی لینے والوں نے کچن اور واش روم کو بھی نہیں چھوڑا تھا میرا دماغ بالکل بھی کام نہیں کر رہا تھا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں جو میرے پیچھے پڑ گئے ہیں اور میری غیر موجودگی میں اس بری طرح انہوں نے میرے گھر کی تلاشی لی ہے انہیں مجھ سے کس چیز کی تلاشی ہے۔

پولیس کے تو نہیں ہو سکتے یہ لوگ خواہ نواب کے حوالے سے میرے پیچھے پڑے ہوں خواہ روزی کے حوالے سے۔ دونوں ہی حوالوں سے پولیس تو خود ان کے گھر کا پانی بھرتی ہے پھر کون ہو سکتے ہیں یہ لوگ......!

میں اب رات گزاروں تو کیسے گزاروں یہاں تو لیٹنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا ہے۔ بیڈ کے گدے اور صوفے کا تو ستیاناس مار کے رکھ دیا ہے میں اس وقت نواب کی کوٹھی پر بھی نہیں جا سکتا تھا بلکہ اس وقت تو میرا یہاں سے نکلنا کسی طور بھی مناسب نہیں ہے میں کہاں لیٹوں...... میں یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون پر گولی استاد کا فون آ گیا میں نے اپنا یہ نیا نمبر اس کو ایس ایم ایس کردیا تھا۔

”کہاں غائب ہے یار تُو!“ گولی استاد نے چھوٹتے ہی سوال کر ڈالا۔

”کہیں نہیں یار! یہیں پر ہوں اپنے فلیٹ پر۔“ میں نے بے زاری سے جواب دیا۔

”کیا بات ہے تُو کچھ پریشان دکھائی دے رہا ہے یہ بتا سب خیریت ہے ناں؟“ اس نے میرے لہجے میں چھپی پریشانی کو محسوس کرلیا۔

”آں...... ہاں...... پریشان...... نہیں تو...... بس ایسے ہی۔“ میں نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

”تُو مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہا۔“ اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔

”نہیں یار! میں بھلا تجھ سے کیا چھپاؤں گا یوں ہی بس ذرا سر میں درد ہے۔“ میں نے کہا۔

”بات صرف سر درد کی نہیں ہے مجھے تیری شدید پریشانی تیرے لہجے میں چھپی صاف دکھائی دے رہی ہے اور پھر تُو نے مجھے بلایا بھی نہیں۔“ گولی استاد نے فکرمند لہجے میں کہا پھر ایک دم بولا۔

”یار وہ تیرا دلارا کہاں ہے کہیں اس نے تو کوئی گڑبڑ نہیں کردی۔“

”ہاں وہ دلارا! ہاں یار اس کا بھی مسئلہ ہے تُو آئے گا تو تجھے بتاؤں گا۔“ میں نے فی الحال جان چھڑانے کے لیے کہا۔

”ایسی بات ہے تو میں ابھی آ رہا ہوں تیرے پاس مجھے اس حرامی پر پہلے ہی شک تھا۔“ اس نے اور

بھی دو تین خطابات دلارے کو دیتے ہوئے کہا۔
"نہیں!" تیرے منہ سے تیزی سے نکلا۔ "تو ابھی مت آنا۔"
"کیوں بھئی خیریت؟ کسی کو بلا رکھا ہے کیا؟" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
"تو جانتا ہے مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، بات یہ ہے کہ میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور میں نے نیند کی گولی ابھی ابھی کھائی ہے اس وقت تو میں پر سکون ہو کر سونا چاہتا ہوں۔ ایسا کر کہ تو کل صبح گیارہ بجے تک آ جانا۔" میں نے کہا تو وہ مان گیا اور وعدہ کیا کہ وہ کل صبح گیارہ بجے تک میرے پاس آ جائے گا۔
میں نے اگلے دن گیارہ بجے تک کا ٹائم اسے اس لیے دیا تھا کہ میں گیارہ بجے سے پہلے ہی نواب کی کوٹھی پر چلا جاتا۔ ابھی میں گولی استاد سے ملنا نہیں چاہتا تھا، میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا میں اس ساری صورت حال سے بہت پریشان تھا۔ اوپر سے نواب بھی مجھ سے اپنے خطرناک کام انجام دلوا رہا تھا۔ گولی استاد سے میں اپنے غائب ہونے پر معذرت کر سکتا تھا اور یہ بہانہ بنا سکتا تھا کہ نواب نے مجھے فوری طور پر کوٹھی پر بلا لیا تھا۔ مجھے تو آج رات بھی یہاں سوتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کہ وہ جو لوگ بھی ہیں ان کا میرے اس فلیٹ میں داخل ہونا کوئی بھی مسئلہ نہیں ہے، جس طرح میری غیر موجودگی میں وہ لوگ با آسانی اس کے اندر داخل ہو گئے تو میری موجودگی میں کیوں نہیں داخل ہو سکتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میرے اس فلیٹ کی نگرانی پر کچھ لوگوں کو مقرر کر رکھا ہو پھر مجھے وہ سفید بالوں اور داڑھی والا شخص یاد آیا جو اوپر آتے ہوئے مجھ سے ٹکرایا تھا اور پھر پلک جھپکتے میں غائب بھی ہو گیا تھا، سو فیصد وہ شخص میرے فلیٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ رات کو فلیٹ میں آ کر میرا کام ہی تمام کر دیں میں نے سوچا اور پھر ایک فیصلہ کیا کہ میں آج کی یہ رات جاگ کر اس فلیٹ میں گزار دوں گا۔ میں موت سے خوف زدہ نہیں تھا لیکن اس طرح مرنا بھی نہیں چاہتا تھا بلکہ اس طرح کیا میں ابھی کسی بھی طرح مرنا نہیں چاہتا تھا، میں نے اللہ سے اپنے لیے زندگی صرف اس لیے مانگی تھی کہ مجھے دشمن انسانیت نواب سطوت کی اصلی صورت دنیا والوں کو دکھانی تھی ان احمق لوگوں کو جو اپنے رب پر بھروسہ کرنے کے بجائے اس بہروپئے پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کے در پر اپنی فریادیں لے کر آتے ہیں۔
میں نے صوفوں کے درمیان سے ٹیبل ہٹائی اور تہہ کیا ہوا قالین اٹھا کر یہاں لے آیا اور ڈرائنگ روم کے فرش پر بچھا لیا، یہاں ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ آن کر لیا اور لیٹ کر نیوز چینل لگا لیا، میں اس زاویے سے لیٹا تھا کہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے ہوتی ہوئی میری نگاہ باہر کی جانب کھلنے والے دروازے پر بھی تھی۔
اس وقت تمام نیوز چینلز پر سہیل ہاشمی کے قتل کی خبریں گردش کر رہی تھیں، میں نے ایک بار پھر اللہ سے صدق دل سے اپنے اس گناہ کبیرہ کی معافی مانگی اور سہیل ہاشمی کی مغفرت کی دعا بھی کی۔
میں سوچ رہا کہ نواب کو بھی اطمینان ہو گیا ہو گا کہ میں نے اپنا کام اس کی منشاء کی مطابق بغیر کسی کی نگاہ میں آئے انجام دیا ہے۔ اب میں کل ہی اس سے ملاقات کروں گا، آج رات تو اس نے کسی بھی قسم کے رابطے سے منع کیا تھا۔
میں ایک بات کی اور دعا کر رہا تھا کہ آج رات ان لوگوں میں سے کوئی بھی میرے فلیٹ میں نہ آئے

کیوں کہ اس وقت میرے پاس وہ گن موجود تھی، جس سے میں نے سہیل ہاشمی کو نشانہ بنایا تھا دوربین بھی تھی میں نے نقلی داڑھی اور سفید بالوں والی وگ تو وہیں جھاڑیوں میں پھینک دی تھی لیکن اس سامان کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔
وہ لوگ پتا نہیں بار بار میرے فلیٹ میں کیا چیز تلاش کرنے کے لیے آ رہے ہیں لیکن شکر اللہ کا کہ انہیں ابھی تک میرے اس فلیٹ سے کوئی بھی مشکوک چیز نہیں ملی ہوگی۔ شکر اللہ کا کہ انہیں ابھی تک میرے اس فلیٹ سے کوئی بھی مشکوک چیز نہیں ملی ہوگی۔ کیوں کہ یہاں ایسی کوئی چیز تھی ہی نہیں، پہلے پہل یہ فلیٹ میں نے روشن آراء بیگم کے رہنے کے لیے کرائے پر حاصل کیا تھا اور ان ہی کی ضرورت کا ضروری سامان یہاں رکھا تھا لیکن خوش قسمتی سے انہیں یہاں لانے کا موقع ہی نہیں ملا کیوں کہ سرمئی نے انہیں اپنی ماں کی حقیقت سے پہچان لیا تھا۔ جب یہ میرے استعمال میں تھا لیکن اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اس فلیٹ سے چھٹکارہ حاصل کر لوں تاکہ ان لوگوں سے میرا پیچھا چھوٹ جائے۔
میں ایک بار پھر ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گیا، پولیس چاروں جانب پھیل چکی تھی۔ شہر میں جگہ جگہ ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ ہر گاڑی کو تلاشی کے بعد آگے جانے دیا جا رہا تھا، مجھے پولیس کی اس احمقانہ کارروائیوں پر ہنسی آ رہی تھی کہ مجرم تو اپنا کام کر کے بخوبی طور پر تمہارے حرکت میں آنے سے پہلے ہی اپنے محفوظ مقام پر پہنچ چکا ہے اب تم لوگ صرف وقت ضائع کر رہے ہو اور شریف شہریوں کو پریشان کر رہے ہو۔
اچانک مجھے خیال آیا کہ کل میں یہ سامان اپنے ساتھ کیسے لے جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ کل جب یہاں سے کوٹھی جانے کے لیے نکلوں تو اس وقت بھی گاڑیوں کی تلاشی کا کام جاری ہو پھر میں کیا کروں۔ میری نگرانی کرنے والے لوگوں کو اس بات کا علم ہو گا کہ آج کی رات میں نے یہاں گزاری ہے، ہو سکتا ہے کہ میرے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر یہاں آئیں۔
کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میں نے بہت سوچا پھر ایک خیال آیا اور میں نے ایک ادھڑے ہوئے صوفے کے اندر گن اور دوربین چھپا کر رکھ دی کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا، کل میرا ارادہ تھا کہ نواب سے ملنے کے بعد میں گولی استاد سے ملوں گا اور اسے ساری بات بتاؤں گا اور اسی کے ساتھ اس فلیٹ میں آ کر اس بات کا جائزہ لوں گا، آیا میرے بعد ایک بار پھر یہاں کی تلاشی لی گئی ہے یا نہیں۔ گن اور دوربین میں اس کے سامنے نہیں نکال سکتا تھا، کیوں کہ سہیل ہاشمی والے معاملے کو میں اس کے علم میں لانا نہیں چاہتا تھا۔
اور پھر ٹی وی دیکھتے دیکھتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں سو گیا۔ ٹی وی البتہ چلتا رہا اور پھر صبح نو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ میں نے چونک کر اپنے اردگرد کے ماحول پر نگاہ ڈالی اور سکون کا سانس لیا کہ میں اسی جگہ پر تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات گزر گئی اور وہ لوگ یہاں نہیں آئے، میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا اور کسلمندی دور کرنے کے لیے ایک طویل انگڑائی لی اس وقت میرے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ میں نے نمبر دیکھا تو نواب کا نمبر تھا۔ میں نے جھٹ فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔
"السلام علیکم سر!" میں نے حسب عادت کہا۔
"کہاں ہو؟" اس نے بھی حسب عادت سلام کا جواب گول کرتے ہوئے سوال کیا۔

”فلیٹ پر ہوں۔“ میں نے فوری جواب دیا۔
”کوٹھی پر چلے آؤ۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دو۔
”آ رہا ہوں۔“ میں نے فون بند کرتے ہوئے اسے اسی کی شان کے مطابق گالی سے نوازتے ہوئے زیرلب کہا۔

میں نے اچھی طرح سے غسل کیا کپڑے تبدیل کیے اور ایک کپ گرم چائے بنا کر اپنے اندر انڈیلی حالاں کہ مجھے زبردست بھوک لگ رہی تھی' میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا لیکن اس وقت ناشتے کا ٹائم نہیں تھی' وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔

چلنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اس صوفے کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جہاں میں نے گن اور دوربین کو چھپایا تھا اور اسے اس کی سابقہ پوزیشن پر کرکے میں اللہ کا نام لے کر فلیٹ سے باہر نکل آیا۔

راستے میں دو جگہ پولیس والوں نے روک کر میری اور گاڑی کی تلاشی لی اور میں نے شکر ادا کیا کہ میں اس سامان کو اپنے ساتھ لے کر نہیں آیا۔ میرے پاس کوئی مشکوک چیز نہیں تھی اس لیے مجھے جانے دیا گیا۔

میں جب کوٹھی پر پہنچا تو گارڈ نے فوری طور پر مجھے نواب سے ملنے کے لیے کہا تو میں سیدھا اس کے روم کی جانب چلا گیا۔

اس مرتبہ نواب کے روم کے باہر موجود سیکورٹی گارڈز کو میرے پاس سے کچھ بھی نہیں ملا نہ میرا پستول اور نہ ہی خنجر تو وہ حیرانی سے بولا۔
”کیا بات ہے آپ کا سامان آج آپ کے ساتھ نہیں ہے؟“
”ہاں آج باہر جگہ جگہ پولیس کی ناکہ بندی ہے اور تلاشی ہو رہی ہے اس لیے میں اپنی چیزیں یہیں چھوڑ گیا تھا۔“ میں نے سادگی سے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے ہمیں آپ پر پورا اعتماد ہے اور آپ کی تلاشی کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن یہ ہماری ڈیوٹی ہے اس لیے معذرت چاہتے ہیں آپ کو تکلیف دینے کی۔“ اس نے کہا۔
”ڈونٹ وری! ڈیوٹی از ڈیوٹی! تم اچھا کرتے ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آگے بڑھ کر نواب کے روم کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔
”آ جاؤ شمروز!“ اندر سے نواب کی چہکتی ہوئی آواز آئی تو میں اندر داخل ہو گیا۔

نواب اپنے بیڈ پر نیم دراز تھا' مجھے دیکھتے ہی بے ساختہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر شدت کی سرخی صاف دکھائی دے رہی تھی اس نے پرمسرت لہجے میں آگے بڑھ کر میرے دونوں کندھوں کو تھاما اور بولا۔
”ویل ڈن شمروز! بہت خوب...... تم نے بہترین کام انجام دیا ہے' اس طرح کے کاموں کے لیے میں تمہارا انتخاب یوں ہی تو نہیں کرتا۔ مجھے تمہارے اوپر پورا اعتماد ہے اور تم ہمیشہ میرے اعتماد پر پورے اترتے ہو اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے اس شاندار کارنامے پر تمہارے بھرپور معاوضے کے علاوہ تمہیں ایک بھاری رقم انعام کے طور پر میری جانب سے بھی دی جائے گی اس کے علاوہ اور گر کچھ مانگنا ہے تو مانگو۔ ویسے ایک اور سرپرائز انعام تمہارے لیے اور بھی ہے اپنی اہمیت کا اندازہ تم اس بات سے بھی لگا لو کہ میں نے ایسا انعام آج سے پہلے کبھی کسی اور کو نہیں دیا۔“
”میرے لیے آپ کا یہی انعام سب سے بڑا ہے سر کہ آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں مجھے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔“ میں نے انکساری اور عاجزی سے اس کے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہاری یہی سعادت مندی بہت اچھی لگتی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دیا۔
”ارے ہاں شمروز! آج کی رات تم یہیں آرام کرو پھر کل صبح تم میرے ساتھ روحانی سینٹر چلنا' وہاں تمہیں کسی سے ملوانا ہے دراصل وہ میرے مرید بھی ہیں اور میرے بہت اچھے دوست بھی۔ وہ بھی تمہارے اس کارنامے سے بہت خوش ہیں اور تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہئیں۔“ نواب نے کہا تو میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور جلدی سے کہا۔
”نہیں نہیں نواب صاحب میں کسی اور کے ساتھ نہیں جاؤں گا میں صرف آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں' مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دیجیے۔“
”اچھا اچھا چلو دیکھیں گے کل کیا بات ہوتی ہے' میں تمہاری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ تم اگر ان کے ساتھ جانا نہیں چاہو گے تو میں زبردستی تمہیں نہیں بھیجوں گا۔“ نواب نے مجھے اطمینان دلایا اور پھر میں اپنے روم میں آ گیا اور آتے ہی سب سے پہلے میں بہت شاندار اور زبردست ناشتے کا آرڈر دیا کیوں کہ اب باقاعدہ میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تھے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ایک بار پھر سرمئی کا فون ٹرائی کیا لیکن اس مرتبہ بھی وہی ہوا جیسے پہلے ہو رہا تھا۔ سرمئی نے میرا فون ریسیو نہیں کیا اور دوسری بار ٹرائی کرنے پر مجھے سوئچ آف ملا۔ میں سرمئی سے ذاتی طور پر ملنا چاہتا تھا لیکن ابھی اس کا موقع نہیں تھا کیوں کہ نواب یہیں موجود تھا اور میں اس کے کاموں میں مصروف تھا کل پھر یہ مجھے اپنے روحانی سینٹر کسی سے ملوانے کے لیے لے جا رہا تھا' اس کا خیال آیا تو میرا دھیان اس انجان شخص کی جانب چلا گیا جو مجھ سے خوش تھا اور مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

ابھی مجھے اس کا خیال آیا ہی تھا کہ میرا موبائل بجنے لگا میں نے اس خوش فہمی میں کہ یقیناً یہ سرمئی کی کال ہوگی فوراً فون اٹھا کر دیکھا لیکن میری خوش فہمی فوراً ہی رفع ہو گئی اگر اسے مجھ سے بات ہی کرنی ہوتی تو وہ اپنا موبائل سوئچ آف کیوں کرتی' فون گولی استاد کا تھا میں نے فون آن کر کے کان سے لگایا تو گولی استاد کی غصے میں بھنائی ہوئی آواز سنائی دی۔
”کیا انتقال فرما گئے ہو' دروازہ کیوں نہیں کھول رہے' کب سے بیل بجا رہا ہوں۔“
”سوری یار! میں دروازہ اس لیے نہیں کھول رہا ہوں کہ میں فلیٹ میں موجود ہی نہیں ہوں۔“ میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔
”کیا مطلب؟“ وہ چیخا۔ ”کہاں ہو؟“
”یار صبح ہی صبح نواب کی کال آ گئی اور اس نے فوراً مجھے کوٹھی پہنچنے کے لیے کہا اس لیے فوراً آنا پڑا۔“
”اگر ایسی ہی بات تھی تو یار تم ایک فون تو کر سکتے تھے مجھے بتا دیتے کہ تم کوٹھی پر جا رہے ہو اور میں نہ آؤں' عجیب آدمی ہو تمہیں ذرا میرا خیال نہیں ہے تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں تمہاری جانب سے کتنا زیادہ پریشان ہوں اور اپنے کتنے ہی ضروری کام چھوڑ کر تمہارے پاس دوڑا چلا آیا ہوں اور تم مزے سے وہاں بیٹھے ہو۔“ گولی استاد کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ ایسا ہونا بھی

چاہیے تھا اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو میرا ری ایکشن بھی یہی ہوتا اس لیے اس کو مناتے ہوئے کہا۔
''میں سمجھ سکتا ہوں یار! بس نواب کا جب بھی ایمر جنسی میں بلاوے کا فون آتا ہے تو میں ٹینشن میں آجاتا ہوں اور سب کچھ میرے دماغ سے نکل جاتا ہے' ابھی ابھی میں نواب سے مل کر آیا ہوں اور تمہیں فون کرنے ہی والا تھا کہ تمہارا فون آ گیا' اچھا چلو مجھے معاف کردو۔ میری وجہ سے تمہیں بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔''
''کوئی بات نہیں۔'' میرے معذرت کرنے سے گولی استاد کا سارا غصہ صابن کے جھاگ کی مانند بیٹھ گیا اور میں نے کہا۔
''اچھا میں ذرا نواب سے فارغ ہوجاؤں تو خود تمہاری طرف آؤں گا پھر ہم تفصیل سے بیٹھ کر بات کریں گے۔'' میں نے اس کی جانب آنے کا کہہ تو دیا پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے یہ تو علم ہے ہی نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے اس لیے اس سے اس کا ایڈریس پوچھا جواب میں اس نے مجھے اپنے اپارٹمنٹ کا ایڈریس سمجھا دیا اور میں نے اس وعدے پر اس کو خدا حافظ کہا کہ فارغ ہوتے ہی میں اسے کال کروں گا اور اس سے ملوں گا۔
آج جمعہ کا دن تھا اور کل ہفتہ کو نواب جمشید لودھی نے مجھے ملاقات کا ٹائم دیا تھا اور اب نواب سطوت بھی کل مجھے اپنے ساتھ روحانی سینٹر لے جانا چاہتا ہے' میں کیا کروں۔ میں کل جمشید لودھی سے بالکل بھی نہیں مل سکتا۔ اسی لیے میں نے روزی کو فون کر کے کہا کہ وہ جمشید لودھی کو بتا دے کہ میں کل اس سے ملنے کے لیے نہیں آسکتا کیوں کہ میں نواب کے ساتھ ہوں اور اسے چھوڑ کر آنا ناممکن ہے روزی نے میرا مسئلہ سمجھ لیا اور کہا کہ کوئی بات نہیں وہ جمشید لودھی کو بتا دے گی۔
سارے ضروری فون کر کے مجھے قدرے سکون ملا' میں نے دن کے ساڑھے گیارہ بجے ناشتہ کیا تھا اسلیے اب دوپہر کے کھانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اس لیے میں آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔
ذہن میں بہت سے خیالات آرہے تھے میں سوچنے لگا کہ نواب مجھے کس سے ملوانا چاہتا ہے آخر وہ کون ہوسکتا ہے' کیا اسی شخص کے کہنے پر نواب نے سہیل ہاشمی کا مرڈر کروایا ہے اگر ایسا ہے اور وہ مجھے اپنے ساتھ بھی رکھنا چاہتا ہے تو مجھے کچھ دن اس کے ساتھ بھی گزارنے چاہئیں تاکہ اس شخص کے بارے میں بھی مجھے معلومات حاصل ہوسکیں۔
میں نے فیصلہ کیا کہ اس شخص سے ملنے کے بعد میں حتمی فیصلہ کروں گا کہ آیا مجھے اس کے ساتھ جانا ہے یا پھر نواب کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ میں یہ بھی کرسکتا ہوں کہ کچھ عرصہ کے لیے اس شخص کے ساتھ رہ کر اسے اچھی طرح جانچوں اور پھر نواب کے پاس واپس آجاؤں۔
ایسی ہی سوچوں میں گھرے ہوئے میری آنکھ لگ گئی اور پھر گہری نیند میں مجھے ایک اور انسانی وجود کا احساس ہوا جو پوری طرح مجھ پر حاوی تھا اور میری آنکھ کھل گئی......!
(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

وہ لمحہ

خلیل جبار

کسی بھی انسان کی زندگی کا رخ تبدیل کرنے کے لیے ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے وہ لمحہ جو تازیانہ بن کر روح کو جھنجوڑ دیتا ہے۔ وہ لمحہ جو پل بھر میں انسان کو ولیوں کی صف میں کھڑا کردیتا ہے۔ وہ نازک لمحہ جو کبھی ولیوں کو ان کے مقام سے گرا کر شیطان بنا دیتا ہے۔

ایک نوجوان کا احوال' حالات کے جبر نے اسے جیب کترا بنا دیا تھا

میں ایک پیشہ ور جیب تراش ہوں' میرے خاندان میں آج تک کسی نے بھی کسی کی جیب نہیں کاٹی۔ میں بھی مجبوری میں اس پیشے میں آ گیا تھا۔ میں حیدرآباد کے مشہور علاقہ ممتاز کالونی کا رہنے والا ہوں' اس علاقے میں زیادہ تر مزدور طبقہ رہتا ہے۔ اسی طبقہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نوعمر بچوں سے پہلے سگریٹ منگواتے ہیں پھر کبھی انہیں بھی بہانے سے سگریٹ پلا دیتے ہیں۔ سگریٹ کی عادت پڑ جانے پر بھری ہوئی سگریٹ' شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کا عادی بنا کر ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر انہیں یہ چیزیں پیسوں کے عوض فروخت کرتے ہیں۔ ان نوعمر لڑکوں کو اپنی خواہش کی تکمیل کی خاطر مختلف جرائم کی وارداتوں میں ملوث ہونا پڑتا ہے۔
جب کہیں جا کر ان کا نشہ پورا ہوتا ہے' مجھے اس لت میں مبتلا کرنے والا ندیم کالا تھا' ندیم کی شکل ہی بدمعاشوں جیسی تھی محلے کا ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے اپنے گھر کے چھوٹے موٹے کام کرا لیتا تھا لیکن جیسے ہی میں نوعمری کی عمر کو پہنچا اس نے تحفے کے طور پر ایک دو روپے دینے کی بجائے سگریٹ کا آدھا اور کبھی پورا پیکٹ دینا شروع کیا۔ میں علاقے کے نوجوانوں کو سگریٹ پیتا دیکھ کر دل میں سوچتا تھا کہ پتا نہیں سگریٹ میں ایسی کیا بات ہے جو لوگ سگریٹ پیتے ہیں۔ میری خواہش ندیم کالے نے سگریٹ دے کر پوری کردی' میں چھت پر چھپ کر سگریٹ پینے لگا' کچھ عرصے یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن پھر اس نے اس طرح کی سگریٹ دینا شروع کردیئے کہ جن کو پی کر مجھے نشہ طاری ہوجاتا تھا۔
گرمی کے دن تھے میں شام کے وقت بستر پر لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں' ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور نشے کی حالت میں سگریٹ پیتے مجھے نیند آ گئی۔ سگریٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ہوا سے اڑ کر چھت پر بچھے ہوئے بستروں پر جا گرا' جلتے سگریٹ کے ٹوٹے نے بستر میں چنگاری دکھائی جس کو ہوا نے شعلوں میں تبدیل کر کے تمام بستروں کو جلا ڈالا۔ چھت پر آگ دیکھ کر گھر والے گھبرا گئے اور پانی کی بالٹیاں لے کر اوپر کو دوڑے' مجھے سوتے سے جگایا' میں سوتے سے ہڑبڑا کر اٹھا اور بستروں میں لگی آگ دیکھ کر میرے بھی اوسان خطا ہوگئے میرے ہاتھ میں سگریٹ نہ پا کر میں سمجھ گیا کہ یہ آگ کیسے لگی ہے۔ گھر والے اور پڑوسی چھت پر بروقت نہ آتے تو آگ اس چارپائی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی جس پر میں سو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے آگ پر قابو پایا۔ ابا جان بھی پڑوسیوں پر گرم ہوتے ہوئے اپنی بھڑاس نکالنے

لگے۔
''اچھے پڑوسی بھی نعمت ہوتے ہیں' ایک ہمارے پڑوسی ہیں جو اپنا کوڑا کرکٹ ہماری چھتوں پر پھینک دیتے ہیں۔ آج پڑوسیوں نے ضرور سگریٹ کا جلا ہوا ٹوٹا چھت پر پھینکا ہے جس کے نتیجے میں آگ لگی ہے۔''
''یہ اچھا ہوا کہ ہماری بروقت کارروائی سے پورا گھر آگ کی لپیٹ میں آتے آتے بچ گیا۔'' امی جان نے کہا۔
''آگ ہمارے بیٹے کی چارپائی تک پہنچ کر اسے بھی نقصان پہنچا سکتی تھی لوگ پتا نہیں کیوں بے حس ہوگئے ہیں۔ دوسرے کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔''
''یہ بے حسی ہم انسانوں کے لیے نقصان کا باعث بن رہی ہے اگر ایسا نہ ہو تو کسی کو بھی نقصان نہ پہنچے۔'' امی جان نے غصے سے کہا۔
''ہاں بیگم اس کا عملی ثبوت ہر روز سڑکوں پر بھی دیکھتا ہوں' لوگ جارحانہ انداز میں موٹر سائیکلیں چلاتے ہیں جیسے وہ گاڑی سڑک پر نہیں موت کے کنویں یا سرکس میں چلا رہے ہیں۔ ان کے اس طرح گاڑی چلانے سے غریب پیدل چلنے والے ناجانے کتنے لوگ شدید زخمی' اپاہج یا موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں' انہیں کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔'' ابا جان نے کہا۔
''موٹر سائیکل والے ہی کیوں یہ کار اور رکشہ والے بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ پیدل چلنے والوں کو تنگ کرنے کو جس سڑک پر گندا پانی جمع ہو' گاڑی کی رفتار جان بوجھ کر تیز کر دیتے ہیں تاکہ پیدل چلنے والوں کے کپڑے گندے پانی کے چھینٹوں سے خراب ہو جائیں۔'' امی جان نے کہا۔

کسی کا بھی مجھ پر شک نہیں گیا کہ یہ سب میری کارستانی کا نتیجہ ہے لیکن اس واقعے سے مجھے نصیحت ہوگئی کہ آئندہ چھت پر سگریٹ نہیں پینی۔ آج قسمت اچھی تھی بچ گیا لیکن ہر بار بچ جانا مشکل ہے۔
حسب عادت ایک دن میں ندیم کالے کے پاس بجلی ہوٹل (یہ ہمارے علاقہ کا مشہور ہوٹل ہے) پر ملنے گیا۔ اس کے پاس اس وقت گلزار بھٹو بھی بیٹھا ہوا تھا' میں نے اشارے سے سگریٹ مانگی۔
''میرے پاس کوئی سگریٹ نہیں ہے۔'' اس نے بے رخی سے کہا۔
''مذاق نہ کرو' جلدی سے سگریٹ دے دو۔'' میں نے اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
''نہیں ہے سگریٹ میرے پاس اب بار بار ضد نہ کرو۔'' ندیم کالے نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔
''استاد اپنا بچہ ہے اسے ایک دو سگریٹ دے دو۔'' گلزار بھٹو نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔
''ماسٹر صاحب آپ اس کی طرف داری نہ کریں' اس نے روز کا معمول بنالیا ہے' انسان کبھی اپنی جیب سے سگریٹ لے کر پی لے ضروری ہے روز مانگ مانگ کر سگریٹ پیے۔'' ندیم کالے نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔
''استاد غصہ نہیں آرام سے بات کرو' میرے پاس سگریٹ نہیں ہے ورنہ میں اسے سگریٹ کا پورا پاکٹ دے دیتا۔'' گلزار بھٹو نے کہا۔
اچانک گلزار بھٹو کا دوست تاج محمد راہی آ گیا جس کو دیکھ کر گلزار بھٹو وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے پر اس نے رازدارانہ انداز میں مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہا۔
''بابو تمہیں کیا خبر ان دنوں مہنگائی کس قدر عروج

پر پہنچ گئی ہے' جو سگریٹ تم پینے لگے ہو وہ ایک دو روپے کی نہیں آتی' بڑی مہنگی ہوگئی ہے۔''
''میں خود اسکول پڑھتا ہوں جتنے پیسے ملتے ہیں اس کی میں بریک میں چیز کھالیتا ہوں۔''
''تم چاہو تو تمہارے پاس بہت سے پیسے آ سکتے ہیں۔''
''ایسا کون سا کام ہے جس سے بہت زیادہ پیسے آ سکتے ہیں۔''
''وہ کام میں تمہیں سکھادوں گا' شرط ہے کہ تم تیار ہو جاؤ' بہت پیسے ہیں اس کام میں۔''
''ایسا کون سا کام ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''لوگوں کی جیبیں کاٹ کر بہت پیسے کما سکتے ہو۔''
''لیکن میں یہ کام نہیں کرسکتا۔'' جیب کاٹنے کے نام پر میں گھبرا گیا۔
میرا تعلق ایک عزت دار گھرانے سے ہے میں ایسا خراب کام کس طرح سے کرسکتا تھا۔
''پھر تمہیں اسپیشل سگریٹ بھی نہیں مل سکتے' جاؤ ہوا کھاؤ۔'' ندیم کالے نے غصے میں آ کر کہا۔
میں انکار کر کے چلا آیا' مجھے ندیم کالے پر بڑا غصہ آ رہا تھا کہ اس نے سگریٹ دینے سے کیسے انکار کیا۔ گھر آ کر مجھے کسی پل بھی سکون نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ سر بھاری بھاری' جسم ٹوٹ رہا تھا' اپنی اس حالت پر میں خود حیران تھا کہ مجھے یہ کیا ہو رہا ہے۔ پنکھا بند تھا لیکن وہ مجھے جھولتا محسوس ہو رہا تھا' اس وقت مجھے احساس ہوگیا کہ ندیم کالے نے اسپیشل سگریٹ پلا پلا کر اس کا عادی کر دیا تھا' جب تک وہ سگریٹ نہ پیئوں گا دل و جسم کو سکون نصیب میسر نہیں آئے گا۔ مجبوراً مجھے ندیم کالے کے پاس جانا پڑا' وہ ابھی تک ہوٹل پر ہی بیٹھا تھا جیسے اسے یقین ہو میں ضرور واپس آؤں گا' وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔
''مجھے معلوم تھا تم ضرور واپس آؤ گے اس لیے میں یہاں سے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ہلا' تمہیں یہ کہنے کی اب بالکل ضرورت نہیں کہ میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں' تمہارا یہاں آ جانا ہی اس بات کی گواہی دے رہا ہے تم بہت سوچ سمجھ کر میرے پاس آئے ہو۔'' اس نے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میری ایک بات دھیان سے سن لو کسی کے سامنے مجھ سے سگریٹ مت مانگنا' خاص طور پر ان دونوں شخص کے سامنے۔'' اس نے دور بیٹھے گلزار بھٹو اور تاج محمد راہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''آپ کے دوست ہیں۔''
''یہ میرے دوست نہیں ہیں ان سے صرف دعا سلام ہے' ان کی دوستیاں بڑے بڑے اخباری رپورٹرز سے ہیں۔ انہیں ذرا بھی ہمارے کام کی بھنک لگ گئی تو دوسرے دن ہی اخبارات میں خبریں چھپی ہوئی ہوں گی اور مکی شاہ تھانے کی پولیس ہم کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوگی۔''
''ٹھیک ہے میں ان سے محتاط رہوں گا۔'' میں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ندیم کالے نے مجھے جیب کاٹنے کی ٹریننگ کرادی' اس ٹریننگ سے میں اس قابل ہوگیا تھا کہ لوگوں کی جیبیں کاٹ سکوں۔ میں اپنی دو انگلیوں سے لوگوں کی جیبیں کاٹنے لگا۔ شروع میں تھوڑی گھبراہٹ ہوئی لیکن پھر میں اس کام کا عادی ہوگیا بغیر کسی خوف کے لوگوں کی جیبیں کاٹ لیتا اور جس کی جیب کٹتی اسے بالکل خبر بھی نہ ہوتی تھی۔
میری عمر جیسے جیسے بڑھ رہی تھی میں جیب کاٹ کر جو کماتا تھا وہ کم کمائی لگتی تھی' میں زیادہ کمانا چاہتا تھا ان

دنوں میں چرس پینے کے ساتھ شراب پینے لگا تھا۔ جوے کا بھی شوق ہو گیا تھا' دن بھر میں جو کماتا رات میں سب ختم ہو جاتا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی ان دنوں جیب تراشی کو چھوڑ کر ڈکیتی کی وارداتیں کرنے لگے تھے اس کام میں انہوں نے شہر میں بڑی شہرت کمائی تھی۔ انہیں دیکھ کر مجھے بھی شوق ہوا کہ میں ابھی اس کام کو خیر باد کہہ کر ڈکیتی شروع کر دوں' اس کام کے لیے مجھے ایک ساتھی اور ٹی ٹی پسٹل کی ضرورت تھی اور یہ کام شروع ہو جاتا' میں نے جوا کھیلنے کی بجائے رقم جمع کر کے ٹی ٹی پسٹل خرید لیا۔ مجھے اپنی مدد کو ایک ساتھی بھی مل گیا' ہم نے پہلی واردات کرنے کو ایک کم عمر لڑکے کا انتخاب کیا جو ایک سنسان گلی سے موبائل سے کھیلتا ہوا گزر رہا تھا۔ نوعمر لڑکوں میں بڑی حد تک خود کو نمایاں کرنے کا شوق تھا اس لیے وہ پرانے اور خستہ حال گھروں میں رہتے ہیں لیکن مہنگے ترین موبائل خرید کر ان میں احساس برتری پیدا ہو جاتی ہے' جگہ جگہ اپنا موبائل نکال کر لوگوں پر رعب جمانے کی غرض سے موبائل سے کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ موبائل پر گھنٹی آئے بھی نہیں تو خود ہی گھنٹی بجاتے ہیں۔ موبائل پر گانے چلا کر دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کی پسلی سے ٹی ٹی پسٹل لگا دیا۔

''زندگی کی خیر چاہتے ہو تو موبائل فون ہمارے حوالے کر دو اور جو بھی رقم تمہاری جیب میں ہے وہ رقم ہمارے حوالے کر دو۔''

اپنی پسلیوں پر پسٹل کا زور محسوس ہونے پر وہ بے اختیار گھبرا گیا اس کی گھبراہٹ کا فائدہ اٹھا کر میں نے موبائل فون چھین لیا اور اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن سوائے دس روپے کے نوٹ کے کچھ نہیں تھا' مجھے یہ دیکھ کر غصہ آ گیا اور میں نے زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

''کم بخت موبائل مہنگا رکھتا ہے اور جیب میں کچھ رقم نہیں رکھتا۔ لگتا ہے اس موبائل میں بیلنس بھی نہیں ہو گا کیوں ہے نا؟''

''ج ج...... جی...... ابھی ابھی بیلنس ختم ہوا ہے' پورے بیس روپے کا بیلنس ڈلوایا تھا میں نے۔'' اس نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔

''اے غریبوں! تمہاری جیب میں دھیلا نہیں ہوتا لیکن انداز تمہارے امیروں جیسے ہیں۔ موبائل لے کر اتنا اترانا بہت آتا ہے' آئندہ قیمتی موبائل جیب میں نہ رکھنا اور رکھو تو پھر جیب میں رقم بھی رکھنا۔'' میں ابھی اسے بھرپور لیکچر دینا چاہتا تھا لیکن موقع کی نزاکت یہی تھی کہ اس سے پہلے کوئی اور گلی میں وارد ہو وہاں سے رفو چکر ہو جائیں۔ میں اور میرا ساتھی وہاں سے تیزی سے بھاگے اور سڑک پر نکل کر ایک رکشہ لیا اور گاڑی کھاتہ پہنچ کر دم لیا۔ رکشے والے کو پیسے ادا کر کے دوسرے رکشے میں بیٹھ کر اپنے علاقے میں پہنچ گئے۔ ہماری پہلی ہی ڈکیتی بڑی کامیاب ثابت ہوئی تھی اس موبائل کے ہمیں اچھے خاصے پیسے مل گئے تھے۔

ڈکیتی کی واردات سے ہم کو بہت فائدہ پہنچ رہا تھا ہم دونوں نے گاڑی بھی خرید لی تھی تاکہ کوئی ہم کو بھاگ کر پکڑ نہ سکے' واردات پر جانے سے پہلے گاڑی کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دیتے تاکہ ہماری بچت رہے۔

میرے پاس اب خاصی رقم جیب میں رہنے لگی تھی' استاد ندیم کالے مجھ سے ناراض رہنے لگا تھا کیونکہ میں نے اس کے دوسرے ساتھیوں کی طرح جیب تراشی کا پیشہ چھوڑ دیا تھا جس کا اسے بہت افسوس تھا۔ اس نے کئی بار مجھے دھمکی بھی دی کہ وہ مجھے پولیس کے ہاتھوں گرفتار کرا دے گا لیکن میں بھی استاد کے ساتھ رہ کر استادی سیکھ گیا تھا۔ میری پولیس والوں سے اچھی دوستی ہو گئی تھی ایسی دوستی کہ وہ مجھے گرفتار کر کے کبھی خسارے کا سودا نہیں کر سکتے تھے۔

وہ سردی کی رات تھی سڑک پر سناٹا طاری تھا' میں کسی کام سے گھر سے نکلا تھا' میں نے اپنے جسم کو سردی سے محفوظ رکھنے کو اپنے جسم پر چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ دور سے ایک بڑی خوب صورت کار کو آتا دیکھ کر میرے دل میں ایک نیا خیال آیا تھا' کار والے کو لوٹنے کا منصوبہ اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے کی غرض سے میں نے کانپنا شروع کر دیا جیسے میں بیمار ہوں قریب آنے پر میں نے کار کو رکنے کا اشارہ کیا' میرے اشارے پر کار والے نے کار روک دی۔

''م م...... میری طبیعت خراب ہو...... رہی ہے...... کیا آپ مجھے سول اسپتال تک چھوڑ دیں گے۔'' میں نے جھوٹ موٹ کا بیمار بننے کی ایکٹنگ کی۔

''بیٹھ جائیں۔'' کار والے نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

کار والے کے قیمتی لباس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اچھی اسامی ہے' چند منٹ گزرنے پر میں نے ٹی ٹی پسٹل اس کی پسلیوں میں لگا دی۔

''جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے خاموشی سے میرے حوالے کر دو ورنہ اس وقت میں گولی چلانے میں دیر نہیں کروں گا۔'' اس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''میرے پاس اس وقت یہ پانچ ہزار روپے کی رقم ہے اور ایک یہ سستا موبائل ہے اس میں سے جو تم لینا چاہو لے لو۔'' میں نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور پانچ ہزار روپے کی رقم لے لی اور موبائل کی حالت دیکھ کر واپس کر دیا۔

''جلدی سے اب کار روک دو مجھے اترنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کار میں روک دیتا ہوں لیکن میری ایک بات سنتے جاؤ۔''

''جلدی بولو لیکن زیادہ طویل بات میں نہیں سنوں گا۔'' میں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جو اس کے نصیب میں ہو' آج یہ رقم میرے پاس آئی ضرور تھی لیکن اسے تمہارے نصیب میں جانا تھا۔ اس لیے میں وسیلہ بن گیا اور رقم تمہارے پاس آ گئی' اللہ نے سب کو روزی دینے کا وعدہ کیا اب چاہے انسان رزق حلال کی نیت سے رزق کی تلاش میں نکلے یا بے ایمانی' دھوکہ دہی سے یا ڈکیتی کی نیت سے نکلے' دونوں صورتوں میں اللہ اسے دے گا لیکن سب سے افضل نیت یہی ہے کہ انسان حق حلال کی روزی کی نیت سے گھر سے نکلے اور تم نے جو آج طریقہ اپنایا ہے وہ طریقہ درست نہیں ہے اس طرح لوگ بے سہارا' بیمار و مجبور لوگوں کو اس ڈر سے لفٹ نہیں دیں گے کہ کہیں وہ ان کو لوٹ نہ لیں۔ اس طرح کسی مجبور کی مدد نہ کرنے پر انسان کی جان بھی جا سکتی ہے لیکن تم کیا جانو انسان کی زندگی کی کیا اہمیت ہوتی ہے' چند پیسوں کی خاطر انسانی جان لے لیتے ہو' یہ تم نہیں جان سکتے کہ رزق حلال میں کیا لذت ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کار روک دی۔

میں اس کی کار سے اتر ضرور گیا تھا لیکن مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی نے میرے دل پر زور سے گھونسا مار دیا ہو' کسی کو لوٹ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی لیکن اس شخص کو لوٹ کر مجھے اپنے آپ پر سخت ندامت محسوس ہو رہی تھی' میں شرمندہ شرمندہ سا گھر لوٹ آیا۔ آج

کسی کو لوٹ کر میں کتنا دکھی ہوا تھا یہ مجھ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا تھا۔ میں خود کو بھکاری سے بھی کم تر محسوس کر رہا تھا' پوری رات مجھے نیند نہ آسکی اور بار بار میرے ذہن پر کار والے کی بات ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی کتنا نڈر اور بہادر تھا' پستل کے سامنے بھی حق بات کرتے ہوئے نہیں ڈرا کہ میں اس کی بات مشتعل ہو کر اسے قتل بھی کرسکتا تھا۔ کار والے کا مسکراتا ہوا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے آگے آرہا تھا۔

میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا اس فیصلے سے میرے ذہن پر جو منوں بوجھ چھا گیا تھا' وہ ختم ہو گیا اور مجھے پرسکون نیند آ گئی۔

صبح بیدار ہونے پر میں بہت پُرسکون تھا۔ میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا دوسرے دن میں نے اپنے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے صبح فجر میں اٹھا اور میرے قدم بے اختیار مسجد کی طرف اٹھ رہے تھے۔ فجر کی نماز پڑھ کر میرا رخ منڈی کی طرف تھا۔ منڈی پہنچ کر میں نے مزدوری کی تلاش شروع کردی۔ میں صبح صبح لوگوں کو اپنا مال تانگوں اور رکشہ میں رکھوانے کی بڑی تکلیف ہوتی ہے' مزدور بڑی مشکل سے ملتے ہیں میں نے جب مزدوری کے لیے ایک صاحب سے گزارش کی اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں' تمہیں مزدوری ضرور ملے گی یہ چند سبزی کی بوریاں ہیں' اس ٹرک میں رکھ دو۔''

میں نے ہمت کر کے ایک بوری پھر دوسری بوری غرض وہاں موجود تمام سبزیوں کی بوریاں ٹرک پر رکھ دیں۔ اس کام سے فارغ ہونے پر اس شخص نے دوسرے شخص کے پاس بھیج دیا۔ اس کے پاس کئی پیٹیاں تھیں جنہیں تانگے میں رکھنا تھا۔ میں نے وہ پیٹیاں تانگے میں رکھ دیں' اس طرح شام گئے تک میں اچھی خاصی مزدوری کر چکا تھا۔ اس محنت کا مزا ہی کچھ اور تھا میرے بدن کا انگ انگ محنت مزدوری سے دُکھ رہا تھا لیکن اس کا اپنا ایک مزا تھا' اپنی محنت کی کمائی ہوئی رقم حاصل کر کے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔

میرا روز کا یہ معمول بن گیا تھا کہ میں صبح فجر کی نماز پڑھ کر منڈی چلا جاتا اور شام تک مزدوری کرتا۔ حق حلال کی روزی میں بڑی برکت ہوتی ہے کئی سال کی محنت سے میرے پاس اتنی رقم جمع ہوگئی تھی کہ اس رقم سے آڑھت کا کام کرسکوں میں نے اللہ کا نام لے کر آڑھت کا کام شروع کردیا۔ یہ کام اچھا چل نکلا اور میرا منڈی کے اچھے آڑھتیوں میں شمار ہونے لگا۔ اس دوران میری شادی ہوگئی' گھر چھوٹا ہونے پر تنگ پڑتا تھا' میں نے اپنا ذاتی گھر خرید لیا۔ اب میں اچھی زندگی بسر کر رہا ہوں' میں اپنی اس زندگی سے بہت مطمئن ہوں' میں سوچتا ہوں کہ انسان کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب وہ اپنے بارے میں سوچتا ہے اور غلط راہ سے نفرت کرتا ہے۔ یہ نفرت جتنی زیادہ ہوتی ہے انسان اس سے اتنا ہی جلدی چھٹکارا پالیتا ہے اور پھر اس کے لیے ایک شاندار مستقبل سامنے ہوتا ہے اگر میں اس برائی سے نفرت نہیں کرتا تو کبھی بھی یہ شاندار مستقبل نہیں پاسکتا۔ میرا ابھی انہیں جرائم پیشہ افراد میں شمار ہوتا جو پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑ سڑ کر زندگی گزار دیتے ہیں۔ اس پیشے سے نفرت دلانے میں اس شخص کا بڑا ہاتھ جس نے میری سوچ ہی بدل ڈالی تھی' والدین اگر اپنے بچوں پر نظر رکھیں تو ان کے بچے بھی غلط سوسائٹی کا حصہ نہ بن سکیں۔

میری سوتن

ایک ایسی نوشیزہ کی روداد' وقت نے اسے اپنی ماں کی سوتن بنا دیا تھا۔ ان لوگوں کا احوال جو دماغ سے نہیں دل سے سوچ کر فیصلے کرتے ہیں اور پھر زندگی بھر پچھتاؤں کی آگ میں سلگتے رہتے ہیں۔

زندگی کتنی اداس ہو رہی ہے' یہ دکھ' یہ جان لیوا احساس تنہائی' یہ نشتر چبھوتا ہوا درد' آہ! میرے درد کی دوا کس کے پاس ہے؟ نہیں ہے کسی کے پاس کہ یہ درد میں نے اپنے لیے خود خریدے ہیں۔ اپنی راہوں میں کانٹے میں نے خود بچھائے ہیں۔ مجھے کون سمجھائے کہ میری تباہی میں زیادہ قصور کس کا ہے۔ میں کس سے انصاف کی توقع کروں؟ کون مجھے تشفی دے گا کون میرے زخموں پر مرہم رکھے گا کہ انسان جو بوتا ہے وہی تو کاٹتا ہے۔

پیڑ بوئیں ببول کے تو آم کہاں سے کھائیں؟ اپنی بربادیوں کو تو میں نے خود ہی آواز دی ہے ورنہ اللہ کی رضا میں راضی رہتی تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتے میری قسمت کا چاند تو اسی دن گہنا گیا تھا جب میری ماں نے میرا ساتھ چھوڑا تھا وہ ماں' جو میری سوکن بھی تھی۔ آپ حیران نہ ہوں اس دنیا میں کچھ بھی عجیب اور ناممکن نہیں ہے۔ آج قارئین کی عدالت میں' میں اپنا کیس رکھتی ہوں وہی میرا فیصلہ کریں کہ میں کتنی قصوروار اور گناہ گار ہوں۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

میں نے سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر میں ہوش سنبھالا تو گھر میں نہ خوشحالی تھی نہ بدحالی' نیا نیا پاکستان بنا تھا اور ہر شخص پیر جمانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آج کل کی طرح نہ تعصب تھا نہ افراتفری اور نفسانفسی' سندھ کے لوگوں میں اخوت' محبت اور بھائی چارگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ جب بے حد انکساری اور عاجزی سے ''سائیں' ادی' ادا'' کہتے تو مجھے بہت اچھا لگتا۔ اس زمانے میں سندھ کے چھوٹے شہروں میں بے انتہا غربت تھی ہندوؤں نے انہیں ایک طرح سے غلام بنا رکھا تھا اور جب بھی وہ کسی بزرگ کے پیر یا گھٹنے چھونے لگتے تو انہیں روکنا پڑتا یہ کہہ کر کہ ''بھائی خدا کے علاوہ کسی انسان کے آگے جھکنا گناہ ہے۔'' اس میں ان کا قصور بھی نہ تھا ہندوؤں میں آج بھی احتراماً بزرگوں کے قدموں میں جھکا جاتا ہے اور تقسیم سے پہلے سندھ کے چھوٹے شہروں اور گاؤں میں ان کا کافی اثر تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے چاچا کی سائیکلوں کی دکان تھی اس زمانے میں گاڑیوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ دور دراز جانے کے لیے عموماً لوگ کرائے پر سائیکل لے لیا کرتے تھے اور زرِ ضمانت بھی نہیں رکھنا پڑتی تھی کہ آبادی کم ہونے کی وجہ سے ہر شخص ایک دوسرے کو پہچانتا تھا۔ بس اسٹاپ تک جانے کے لیے تانگے کی سواری ہوتی تھی۔ میرے ابا نے جن کو میں چاچا کہتی تھی اپنی دکان پر فوٹو گرافی کا سامان بھی رکھا ہوا تھا کالے کپڑے سے ڈھکا اسٹینڈ ہوتا تھا جس میں منہ ڈال کر وہ سامنے کھڑے بندے کی تصویر اتارتے تھے جو بلیک اینڈ وائٹ اور ذرا دھندلی ہوتی تھی لیکن اس طرح معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور پھر ہم کھانے والے

ہی کتنے تھے اماں، چاچا اور میں۔ آپ ''چاچا'' پر حیران ہو رہے ہوں گے میں نے بھی اماں سے یہی سوال پوچھا تھا تو وہ ہنس کر بولیں۔ ''تقسیم ہند سے پہلے سارے رشتہ دار مل جل کر اور نزدیک نزدیک رہتے تھے اس لیے اور بچوں کی دیکھا دیکھی تم نے بھی اپنے ابا کو چاچا کہنا شروع کردیا۔''

ہمارے زیادہ تر رشتہ دار آس پاس ہی آباد ہوگئے تھے ہم لوگ حیدر آباد سے آئے تھے اور یوسف زئی پٹھان تھے۔ سب بڑے آپس میں پشتو ہی میں بات کرتے تھے لیکن مجھے پشتو بالکل ہی نہیں آتی تھی حیدر آباد دکن میں رہنے کی وجہ سے ہمارے کھانوں میں وہاں کا کافی اثر تھا اس لیے اماں بھگارے بینگن اور مرچوں کا سالن بہت مزیدار بناتی تھیں۔

ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بہت بڑا دو منزلہ مکان تھا اس گھر میں بھی کوئی مہاجر فیملی آئی تھی جنہیں کافی سال بعد یہ گھر کلیم میں مل گیا تھا یہ خاندان تین بھائی دو بہنوں اور ماں باپ پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ بھی ذات کے یوسف زئی پٹھان تھے لیکن چونکہ ان کے نانا، دادا بہت پہلے افغانستان سے ہندوستان ہجرت کر گئے تھے اس لیے پشتو کسی کو بھی نہیں آتی تھی۔ میری اماں اور سب سے بڑی بہن سے ان سے خوب دوستی ہوگئی۔ ہمارے مقابلے میں ان کے معاشی حالات بہت بہتر تھے۔ بچے اسکول سے آنے کے گھر کے آگے کنچے، پٹھو اور پہل دوج کھیلتے میں بھی اس میں شامل ہو جاتی۔ زمانہ بہت اچھا تھا نہ ڈر، نہ خوف، نہ فحاشی، نہ بدمعاشی۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ رات کو چونکہ پیٹرومیکس اور مٹی کے تیل کی لالٹین جلتی تھی اس لیے یہ سارے کھیل دن میں ہوتے تھے۔ اکثر میری اماں میری دوست نازیہ کے گھر مکئی کی روٹی، سرسوں کا ساگ اور بھگارے بینگن بھیجا کرتی تھیں جواب میں وہاں سے قورمہ، پلاؤ اور زردہ آتا تھا جو مجھے بے حد پسند تھا۔ آس پاس رہنے والے سندھیوں کے گھر سے پلا مچھلی اور گھی میں چپڑی ہوئی لال چاولوں کی موٹی موٹی روٹیاں آتی تھیں جو ہمیں اچھی تو بہت لگتی تھیں لیکن پلا مچھلی کو کھانے میں جس مہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم میں مفقود تھی کیونکہ پلا مچھلی میں باریک باریک بہت کانٹے ہوتے ہیں۔

پتا نہیں کس طرح کھیل کھیل میں، میں ایک سندھی لڑکے کی طرف مائل ہوگئی جو ایک وڈیرے کا بیٹا تھا میں نے نازیہ کو اپنے جذبات سے آگاہ کیا تو وہ ناراض ہونے لگی۔

''دیکھو پلوشے ہماری عمر اس طرح کی باتوں کی نہیں خدا کے لیے ابھی سے اپنے بچپن کو خیر باد مت کہو ابھی تو گھر والے سب کے ساتھ کھیلنے پر کوئی روک ٹوک نہیں کرتے لیکن تم اس طرح کی حرکتیں کرکے اپنے ساتھ ہمیں بھی مروادو گی اور ہم پر باہر نکلنے کی پابندی بھی لگ جائے گی۔''

مگر جوانی دیوانی ہوتی ہے اور کم عمری کا دور۔ وہ لڑکا سیدھا سادہ اور شریف تھا لیکن میری مشکوک حرکتوں نے اسے بڑوں سے شکایت کرنے پر مجبور کردیا اور اس طرح میرے باہر نکلنے پر پابندی لگ گئی اور نازیہ نے بھی کھیلنا چھوڑ دیا۔ اس زمانے میں ٹیلی فون کی سہولت تو تھی نہیں اس لیے نازیہ تو خیر نہیں لیکن میں کبھی کبھار ان کے گھر چلی جاتی تھی کیونکہ مجھے ان کے گھر کا ماحول بہت اچھا لگتا تھا۔ بڑے بڑے نواڑ سے کسے پلنگوں پر سفید چادریں بچھی ہوتی تھیں اور ایک بڑے سے تخت پر گاؤ تکیہ کے سہارے نازیہ کی امی بیٹھ کر پان کھاتیں ان کا چاندی کا پاندان بڑا خوب صورت تھا۔ وہ کبھی کبھار گل قند ڈال کر ایک چھوٹی سی گلوری مجھے بھی دے دیتیں اور مجھے بڑا مزہ آتا۔

۞ ...... ۞ ...... ۞
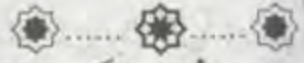
پاکستان بنے پانچ سال گزر چکے تھے۔ تب میں نے سنا نازیہ کی شادی اس کے تایا زاد سے ہو رہی ہے جو کراچی میں پڑھتا ہے فی الحال منگنی ہوگی اور شادی اس کی تعلیم مکمل کرنے پر۔ اسی دوران اس سندھی لڑکے کا رشتہ میرے لیے آ گیا میں بہت خوش تھی ایک بات بتادوں میرے چاچا بہت خوب صورت تھے اونچے لمبے سرخ سفید بڑی سی داڑھی اور سر پر پگڑی، عمر تو ان کی 55 سے اوپر ہی تھی مگر لگتے نہیں تھے جبکہ اماں کافی صحت مند اور معمولی شکل کی تھیں اور اپنے مٹاپے کی وجہ سے چاچا سے بڑی ہی لگتی تھیں۔ چاچا کی شخصیت میں ایک رعب و دبدبہ تھا۔ اس لیے میں ہمیشہ ان سے خوف زدہ رہتی تھی۔ اس دوران جو ہمارے رشتہ دار آس پاس ہی رہتے تھے ان کی آمد و رفت بڑھ گئی۔ گھنٹوں بند کمرے میں مذاکرات ہوتے اور میں خوش ہوتی کہ میرے رشتے کے سلسلے میں صلاح مشورہ ہو رہا ہے لیکن اماں کا رنگ دن بدن زرد پڑتا جارہا تھا وہ مجھے لپٹا کر بار بار رونے لگتیں اور ان کے لبوں پر ایک ہی جملہ ہوتا ''پلوشے مجھے معاف کردینا میں بے بس اور مجبور عورت ہوں۔'' اور میں اسے اپنی جدائی پر محمول کرتی۔

ایک دن اچانک اماں نے کہا کہ ''پرسوں تمہارا نکاح ہے۔'' سب سے پہلے میں نے یہ خوشی کی خبر نازیہ کو سنائی تو وہ بھی خوشی سے اچھل پڑی اور

جرمن کہاوتیں

☆ جو شخص گھر سے نہیں نکلتا وہ لوٹ کر بھی نہیں آتا۔

☆ جو شخص وعدہ نہیں کرتا اسے ایفا بھی نہیں کرنا پڑتا۔

☆ جہاں پیسہ ہوتا ہے وہاں شیطان موجود ہوتا ہے اور جہاں پیسہ نہیں ہوتا وہاں وہ دوبار موجود ہوتا ہے۔

☆ خدا کی طرف لوگ لنگڑاتے ہوئے جاتے ہیں جبکہ شیطان کی طرف دوڑتے ہوئے۔

☆ دن کی تعریف شام ہونے سے قبل نہیں کرنی چاہیے۔

☆ سچائی ایک قیمتی ہیرے کی طرح ہے اس لیے لوگ روز روز نہیں دکھاتے۔

☆ غریب اس وقت کھاتا ہے جب اسے میسر آجائے اور امیر جب اس کا جی چاہے۔

☆ جس راستے پر بے شمار لوگ چلتے ہیں اس پر گھاس نہیں اُگتی۔

☆ جو سمندر کا راستہ نہیں جانتا اسے دریا کے پانی کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔

(رملہ ایمل...... جہلم)

انمول موتی

☆ متابعت صرف اس کی کرو جس سے بڑا کوئی نہیں۔

☆ حکومت اپنے حواس پر کرو تاکہ انسانی عظمت نصیب ہو۔

☆ سست ہو کر گھر میں پڑے پڑے مرجانے سے باہر نکل کر محنت کرتے کرتے تھک کر مرجانا بہتر ہے۔

☆ وہ اعتماد جس سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹایا جاسکتا ہے۔ انسان کا اپنی ذات پر بھروسہ کرنا ہے۔

☆ بری کوشش میں کامیاب ہو جانا باعث عزت نہیں برخلاف اس کے اچھی کوشش میں شکست کھا جانا موجب عزت ہے۔

(ثوبیہ نذیر...... بھائی والا فیصل آباد)

شرماتے ہوئے بولی۔

”پرسوں میری بھی منگنی ہے افسوس کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔“

”کوئی بات نہیں میں شادی کے بعد تم سے ملنے آؤں گی۔“ میں بے تحاشہ خوش تھی لیکن اماں کے رونے سے بڑی الجھن ہونے لگی کہ کون سا مجھے دور جانا ہے۔ اس دوران چاچا سے میرا بہت کم سامنا ہوتا ایک تو مجھے شرم آتی دوسرے وہ صبح گئے رات اس وقت آتے تھے جب میں سو چکی ہوتی تھی۔

❁......❁......❁
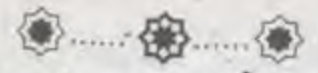
دوسرے دن صبح ہی سے رشتہ دار آنا شروع ہو گئے صرف مرد میں بڑی حیران تھی کہ رشتہ دار عورتیں کیوں نہیں آئیں؟ عصر اور مغرب کے درمیان نکاح تھا مگر بارات کا کوئی پتا نہیں تھا پھر اچانک اماں نے میرے آگے پردہ تان دیا اور سر پر چادر ڈال دی۔

”نکاح خواں اور وکیل اندر آرہے ہیں۔“ انہوں نے اطلاع دی اور میں نے حیران ہو کر سر جھکا لیا نہ چوڑی نہ مہندی نہ نئے کپڑے یہ کیسی شادی تھی؟ پھر جب میرے کانوں میں آواز پڑی تو میں نے گھبرا کر چادر اتار دی اور میرے چیخنے سے پہلے ہی اماں نے سختی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میری بچی اب کچھ بولنے کا وقت نہیں صرف ہاں کہہ دو۔“ نکاح کب ہوا، کیسے ہوا؟ میں اپنے حواسوں میں ہوتی تو مجھے پتا چلتا میں تو گونگی بہری اور اندھی ہو چکی تھی جی ہاں میرا نکاح میرے چاچا سے ہوا تھا جو میرے سگے باپ نہیں تھے پھر اماں نے روتے ہوئے بتایا کہ پارٹیشن سے کافی پہلے میں انہیں ایک میلے میں روتی ہوئی ملی تھی والدین کو بہت ڈھونڈا پھر اپنی بیٹی بنا کر مجھے گھر لے آئے کیونکہ اماں بانجھ تھیں، تقسیم ہند کے وقت میں ساتھ ہی آ گئی تھی۔ اماں اور چاچا دونوں ہی مجھے بیٹی ہی سمجھتے تھے لیکن یہ خناس آہستہ آہستہ میرے باپ جیسے شخص کے ذہن میں ان کے رشتہ داروں نے ڈالا کہ ”لے پالک سے شرعی طور پر نکاح جائز ہے۔“ شروع شروع میں تو میرے چچا جلال خان کو ایسا سوچتے ہوئے بھی شرم آئی لیکن آہستہ آہستہ ان کا ذہن بھی مائل ہو گیا۔ اماں نے بہت شور کیا، فیل مچائے چیخیں چلائیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز...... پاکستان میں ان کا کوئی رشتہ دار بھی نہ تھا، ان کو طلاق کی دھمکی دے کر چپ کرا دیا گیا۔ میں کئی دن ذہنی طور پر اس حقیقت کو قبول نہ کر سکی، جلال خان کو دیکھتے ہی میرے ہاتھ پاؤں مڑ جاتے، چیخیں نکل جاتیں اور میں بے ہوش ہو جاتی لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی لیکن وہ روحانی اور جسمانی اذیت میں بھول نہیں سکتی۔ اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہوا کہ مجھے اپنی ماں سے نفرت ہو گئی تھی۔

وہ بات جس کا کہانی میں کوئی ذکر نہ تھا۔ وہ بات ہم کو بہت ناگوار گزری ہے۔ وہ مجھے تصور وار نظر آتیں کہ اگر مجھے پہلے سے بتا دیتیں تو شاید میں کہیں بھاگ جاتی۔

❁......❁......❁
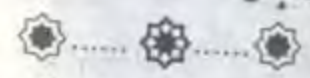
ایک سال کے اندر اندر میں ایک بیٹی کی ماں بن گئی پھر تو جیسے میں بچے پیدا کرنے کی مشین بن گئی۔ اوپر تلے پانچ بیٹے ہوئے، غرور اور تکبر نے میرا دماغ آسمان پر پہنچا دیا مزے کی بات یہ تھی کہ بچے پالنے سے لے کر گھر کا ہر کام اماں کے ذمہ تھا میں تو صرف پیدا کرنے کی روادار تھی۔ کیونکہ مجھے بیٹی سمیت کسی ایک بچے سے بھی محبت نہ تھی جبکہ اماں کی سب بچوں میں جان تھی۔ خاص طور پر بیٹی پر تو وہ جان چھڑکتی تھیں۔

جلال خان کی عمر اب ڈھلتی جا رہی تھی اور میں بھرپور جوان اکثر لوگ مجھے اپنے بچوں کی بڑی بہن اور جلال خان کی بیٹی سمجھ لیتے تھے۔ پورے گھر پر میرا راج تھا جلال خان سارا وقت میرے آگے پیچھے رہتے تھے اور اماں کو انہوں نے دودھ کی مکھی کی طرح باہر نکال دیا تھا ان کی حیثیت گھر میں گاڑی کے ایک ناکارہ پرزے کی سی تھی۔ البتہ میرے بچے اپنی بڑی ماں کے دیوانے تھے۔ مجھے تو وہ بالکل گھاس نہیں ڈالتے تھے صرف اپنی بڑی ماں کا حکم مانتے تھے جس کی وجہ سے مجھے ان سے اور بھی نفرت ہو گئی تھی میں انہیں اذیت دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ کھانا وہ پکاتی تھیں اور پیٹ بھر ان کو میری وجہ سے نصیب نہ ہوتا تھا۔ میں تو ان سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی جبکہ ان کا منہ مجھے بیٹی بیٹی کہتے سوکھتا تھا ان کے لہجے کی شیرینی اور حلاوت آج بھی مجھے تڑپاتی ہے۔ یہ میری بڑی اماں ہی تھیں۔ جنہیں تعلیم سے عشق تھا اور انہوں نے زبردستی سب بچوں کو مع بیٹی سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا تھا مگر وہ کیا پڑھتے ہیں کیا کرتے ہیں یہ کسی کو معلوم نہ تھا البتہ لڑکی پڑھنے میں بہت تیز تھی اور ہر سال اول آتی تھی۔ بچوں نے تو پڑھ کر نہیں دیا مگر بیٹی نے میٹرک بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا اور ضد کر کے ایک پرائمری اسکول میں ملازمت کر لی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب پڑھی لکھی لڑکیاں بہت کم تھیں اور میٹرک پاس کو اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھا جاتا تھا اور جب ہم نے اماں کے سمجھانے کے باوجود خاندان میں ایک ان پڑھ لڑکے سے اس کا رشتہ طے کر دیا تو اس نے بغاوت کر کے خاموشی سے اس سندھی وڈیرے سے شادی کر لی جو شادی شدہ بچوں کا باپ تھا اور بھی میں اس کی دیوانی تھی اس وڈیرے کے اثر و رسوخ کی وجہ سے جلال خان کی بھی چوں کرنے کی ہمت نہ تھی اماں کو یہاں بھی ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑی۔ جلال خان اور میں نے انہیں خوب ذلیل کیا کہ ”اور تعلیم دلاؤ لڑکی کو دیکھ لیا پڑھانے کا نتیجہ کالک مل گئی سب کے منہ پر۔“

اماں کی بھی ہمت اور صبر جواب دے گیا اور وہ بیمار پڑ گئیں کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا نازیہ کی امی انہیں دیکھنے آئیں تو ان کو برے حال میں دیکھ کر خوب باتیں مجھے سنائیں وہ بھی دو چھوٹے بچوں اور شوہر کے ساتھ رہ رہی تھیں نازیہ شادی کے بعد کراچی چلی گئی تھی اور اس سے دونوں چھوٹے بھائی بھی کراچی میں پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے حق دوستی ادا کیا اور اماں کے لیے اپنے خرچے پر ایک عورت کا انتظام کر دیا جو ان کا خیال رکھے کیونکہ فالج کے ہلکے پھلکے اثر نے بھی انہیں چلنے پھرنے اور بولنے سے معذور کر دیا تھا۔

اب مجھے صحیح معنوں میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا میں نے تو کبھی ہل کے پھلی نہ پھوڑی تھی کہ پورے گھر کی ذمہ داری سر پر آ پڑی۔ کھانا پکانا مجھے عذاب لگتا تھا اور کپڑے دھونا مصیبت اور کھانا بھی وہ جس میں بچے سو سو کیڑے نکالتے انہیں تو اماں کے ہاتھ کے پکے کھانوں کی عادت تھی جو وہ بڑی محبت سے پکاتی تھیں۔ اس لیے لذت بھی

ہوتی تھی۔ ادھر بچے سارا دن زبان درازی کے ساتھ اماں سے ہر کام میں مقابلہ بھی کرتے جس سے میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور پھر اماں کے بغیر شکوہ شکایت کیے خاموشی سے گزر گئیں۔ اماں کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ جلال خان بھی ایک دن سوتے کے سوتے رہ گئے اور مجھے سچ مچ دن میں تارے نظر آنے لگے اب پتا چلا کہ زندگی کس چیز کا نام ہے۔ آمدنی کا ذریعہ ختم ہوگیا بچوں کو آوارگی سے فرصت نہ تھی جیسے تیسے باپ کی دکان چلا رہے تھے پھر رشتہ داروں کے مشورے پر میں نے دو بڑے بیٹوں کی شادی کردی اور میں جو یہ توقع کررہی تھی کہ بہویں میری خدمت کریں گی اور تخت پر بٹھا کر کھلائیں گی تو وہ خواب ہی رہ گیا۔ میں سارا دن نوکرانی کی طرح کام میں لگی رہتی اور وہ سب عیش کرتے پھر دونوں بہویں اپنی ہی دونوں بہنوں کو دونوں دیوروں کے لیے بیاہ لائیں اور اس طرح میری حیثیت عضو معطل کی سی ہوگئی چھوٹا بیٹا پہلے ہی گھر سے بھاگ گیا تھا۔ وہ کہاں تھا کس حال میں تھا کسی کو خبر تھی نہ فکر۔ میری بیٹی کبھی کبھار ملنے آجاتی تو میری حالت دیکھ کر کڑھنے لگتی لیکن میں نے اس کے ساتھ کون سی محبت کی تھی جو وہ میرا خیال رکھتی۔ خود اس کا حال بھی اچھا نہ تھا کمانے کے باوجود اس کی حیثیت گھر میں نوکروں سے بھی بدتر تھی اور پھر میری بیٹی بھی ایک دن مردہ بچے کو جنم دے کر جان سے گزر گئی۔ اس کی طبیعت کئی دن سے خراب تھی لیکن پروا کس کو تھی بچہ پیٹ میں مر چکا تھا۔ دائیوں نے کیس اور خراب کردیا اور جسم میں زہر پھیلنے سے وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ اس دن صحیح معنوں میں مجھے پتا چلا کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی تھی میں مہینوں اس کو یاد کر کے روتی رہی۔

❀......❀......❀

میں عمر کی اب اس منزل پر ہوں جہاں پچھتاوے ناگ کی طرح ڈستے ہیں اور اپنا مکروہ چہرہ آئینے میں دیکھتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے میں نے جو اپنی ماں سے سلوک کیا تھا وہ مجھے گھنٹوں رلاتا ہے۔ میری ماں تو خود مظلوم تھی اس پر سوت بن کر میں آئی تھی میں نے بیٹی ہوتے ہوئے بھی اس کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا اور میں ہی اس سے خفا تھی جبکہ وہ آخری سانسوں تک ایک ماں کی طرح مجھے چاہتی رہی لیکن اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ میں مانتی ہوں میں نے ان کے ساتھ زیادتی کی ان کو اس جرم کی سزا دی جو انہوں نے کیا ہی نہیں تھا لیکن میں فیصلہ اپنے قارئین پر چھوڑتی ہوں وہ مجھے بتائیں میرا کیا قصور تھا، میں نے کیا گناہ کیا تھا کیا مجھ پر ظلم نہیں ہوا تھا، کیا صرف خونی رشتوں کی اہمیت ہے؟ کیا منہ بولے رشتے شرعی طور پر نہ سہی اخلاقی اور سماجی طور پر کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟ آج میں تنہائی، بے بسی اور خود احتسابی کا شکار ہوں کوئی پرسان حال نہیں۔ موت کے مہیب سائے مجھے ڈراتے ہیں تو قبر کے اندھیرے سہاتے ہیں۔ میرے نامہ اعمال میں ایسا کچھ بھی نہیں کہ میں اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا حوصلہ کرسکوں۔ بس سارا وقت اپنے رب سے نجات کے لیے دعا کرتی رہتی ہوں۔ آپ بھی دعا کریں کہ اللہ ایمان کے ساتھ میری مشکل آسان کردے، آمین۔

قسط نمبر 3

ذات قلندر

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خانہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ بھیرہ خیریت سے ہو، میں نے کار ہی کے قریب بائیک روکی اور اپنا پسٹل نکال لیا۔ میں نے کار کو غور سے دیکھا، اس میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے فوراً ہی گیٹ کھولا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر سناٹا تھا، لیکن سب کچھ معمول کے مطابق لگ رہا تھا۔ مویشی بڑے سکون سے تھے۔ تبھی بھیرہ ٹوکری میں چارہ لیے نمودار ہوا تو میری سانس میں سانس آئی۔ میں نے اشارے سے پوچھا کہ سب خیریت ہے تو اس نے سر ہلاتے ہوئے اندر کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔

"ایک بندہ تمہارا اندر بیٹھا انتظار کررہا ہے۔"

"کون ہے۔" میں نے پوچھا اور اندر کمرے کی سمت بڑھا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے کہا اور چارہ مویشیوں کے آگے پھینک دیا۔ میں اندر گیا۔ تو سادہ لباس میں بیٹھے ہوئے افضل رندھاوا کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس وقت وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ گیا۔ میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"جمال......! میں اس وقت تیرے ڈیرے پر ایک دوست کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میری بات سن لینا، پھر فیصلہ تو بہر حال تم نے ہی کرنا ہے۔"

"آپ بیٹھیں اور جی بھر کے باتیں کریں......اگر آپ دوست بن کر آئے ہیں تو مجھے بھی اپنا دوست ہی پائیں گے......" میں نے سامنے پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں وہ پہلے بیٹھا ہوا تھا اور خود دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"دیکھو، میں جو بھی ہوں لیکن آخر کار ایک سرکاری ملازم ہوں۔ میری حدود ہیں جن میں رہ کر میں اپنا کام کرتا ہوں اس کے ساتھ ساتھ میں، اپنے افسروں کے حکم کا بھی پابند ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی اور یہ زیادتی سراسر غلط فہمی کی بنیاد پر تھی۔ مجھے حکم دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ جو معلومات دی گئی تھیں اس میں تمہیں ایک ایسا جرائم پیشہ شخص بتایا گیا تھا جس کا پورا ایک گروہ ہے خیر......جو کچھ ہوا تمہارے ساتھ وہ اچھا نہیں ہوا، میں اس پر معذرت خواہ ہوں۔"

”مجھے نہیں معلوم کہ رندھاوا صاحب کہ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں' لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ آپ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد' جبکہ نوکری کرنے' افسروں کا حکم ماننے کی مجبوری کے ساتھ معذرت کرنے کیوں چلے آئے۔ آپ نے تو اپنی نوکری کی' پھر یہ شرمندگی کیوں؟“

”نہیں' مجھ سے غلطی ہوئی' مجھے بھی اپنی پیشہ ورانہ دیانت داری نبھانا چاہیے تھی' میں یہ نہیں کہتا کہ تم میری بات کا یقین کرو' میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ تم میری معذرت قبول کرو' کیونکہ تم مجھے شک کی نگاہ ہی سے دیکھو گے۔ ایسا کبھی ہوا نہیں ہے کہ کوئی میرے ڈیپارٹمنٹ کا بندہ یوں معذرت کرنے آجائے' یہاں تک کہ اسے کوئی مجبوری نہ ہو؟“

”چلیں' میں آپ پر شک نہیں کرتا' معذرت بھی مان لی' اب......؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”جمال......! تم کیا سمجھتے ہو کہ دنیا اتنی ہی سادہ ہے' جتنی تم سمجھتے ہو یا پھر جتنے تم سادہ ہو؟“

”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جو دلیر آدمی ہوتا ہے وہ ہمیشہ سچ پر کھڑا ہوتا ہے' چاہے وقتی طور پر اسے ہزیمت اٹھانا پڑے۔ اس دنیا کا اصل مسئلہ منافقت ہے' منافق' آدمی ہی ہوتا ہے' کبھی تم نے کسی جانور میں منافقت نہیں دیکھی ہوگی' منافق انسان ہوتے ہوئے بھی حیوانوں سے بدتر ہوتا ہے۔ بظاہر منافق وقتی فتح حاصل کر لیتا ہے لیکن دراصل وہ پہلے خود ہارتا ہے' پھر ساری زندگی اپنی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ کیونکہ حسد کی آگ ہی منافقت کی طرف لے کر جاتی ہے۔ خیر......! کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں کہ وہ معاشرہ پرامن ہوتا ہے جہاں منافقت نہیں ہوتی۔“ وہ گمبھیر لہجے میں کہتا چلا گیا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھا کہ آپ کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ اس دفع میں نے زچ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”وہی بتا رہا ہوں' دلیر اور سچا آدمی ہمیشہ منافقوں سے مار کھاتا ہے۔ اگرچہ منافقوں کی یہ وقتی فتح ہوتی ہے' کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں کہ اپنے اردگرد منافقوں سے بچو' کیونکہ ہمیشہ منافق ہی اعتماد حاصل کر کے اپنا وار کرتا ہے۔“ اس نے پہلے سے بھی سنجیدہ لہجے میں کہا تو میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا ہے۔ اس لیے میں نے اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے پوچھا۔

”رندھاوا صاحب' دراصل میں یہ سمجھنا چاہ رہا ہوں کہ آپ مجھ سے کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ صاف لفظوں میں کہیں' یقین رکھیں' یہ آپ کے اور میرے درمیان ہی رہے گی۔“

”تو پھر سنو......! یہ پیرزادوں کو اور شاہ فیملی کو اچانک ہی تم میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟“ اس نے میری جانب سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تو میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جانتا۔“

”مگر میں جانتا ہوں۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولا۔ ”اس پورے علاقے میں تیرے جیسا' بہادر' نڈر اور فنکار قسم کا کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے۔ دونوں خاندان بظاہر ایک دوسرے کے دشمن اور حریف دکھائی دیتے ہیں لیکن اندر سے یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ ان کی ساری پلاننگ دو باتوں پر ہوتی ہے' ایک تو یہ کہ عوام کو آپس میں لڑاتے رہیں تاکہ ان کی حکمرانی قائم رہے' دوسرا عوام میں سے اٹھنے والے تیرے جیسے بندے یا کوئی بھی طاقت ور گروہ کو وہ اپنے مقصد کے لیے استعمال

کرتے ہیں۔ نہ قابو میں آئیں تو انہیں ختم کر دیتے ہیں اور یہ سارا عمل منافقت کا ہے۔ کیا تم اور میں نہیں جانتے کہ ان کے ڈیروں پر کیسے کیسے اشتہاری پڑے ہوتے ہیں۔ انہیں کیوں رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ معاشرے کے' عوام کے اور قانون کے مجرم ہیں۔ میرے ہاتھ بندھے ہیں کہ میں ان پر ہاتھ ڈالنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا کہ سیاسی دباؤ اور گروپ بندیوں نے میرے ہاتھ باندھے ہوئے ہیں اور تم جیسے لوگ شعور نہیں رکھتے' بس لاشعوری طور پر ان کی انگلیوں پر ناچتے چلے جاتے ہیں۔“ وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں رندھاوا جی' لیکن جب قانون کچھ نہیں کر سکتا تو ہم کیا کریں' آپ لوگ کس لیے ہیں؟ ہم اگر ہتھیار اٹھاتے ہیں تو مجرم بن جاتے ہیں ایک اور اشتہاری پیدا ہو جاتا ہے۔“

”یہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں جمال کہ اس سسٹم میں سوائے اشتہاری پیدا ہونے کے کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ جہاں انہیں یہ پیدا کرتے ہیں' وہاں انہی کی حفاظت دیوار بنا کر خود کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ کیا یہ ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانتے کہ یہ کتنے بڑے جرائم پیشہ ہیں لیکن سیاسی میدان میں نورا کشتی کرتے ہیں۔ خیر......! میں تمہیں یہ بات اس لیے سمجھانے آیا ہوں کہ مجھے یہ پتا چلا ہے کہ شاہ دین مجھے اپنے پتر شاہ زیب کا باڈی گارڈ رکھنا چاہتا ہے اور پیرزادہ ایسا نہیں چاہتا' وہ تم سے لڑے گا نہیں بلکہ تم پر مزید احسان کرنے کی کوشش کرے گا لیکن خدا کے لیے تم اپنی طاقت بچا کر رکھنا۔“ اس بار اس کے لہجے میں درد تھا۔

”میں سمجھ گیا ہوں' آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے یقین دلایا تھا اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال رینگ گیا۔ میں نے شدت سے یہ خواہش کی کہ کاش رندھاوا اپنے طور پر یہ خواہش مجھ سے کہہ دے۔

”اگر تم سمجھ ہی گئے ہو تو یاد رکھو' وقت تمہارا ہوگا۔ میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو بتانا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو مجھے مایوسی ہونے لگی۔ تبھی میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی' اگر کوئی ضرورت محسوس کریں تو میں حاضر ہوں۔“

”عوام اور قانون کا ایک ساتھ ہو جائے تو جرائم ختم کیے جا سکتے ہیں' مگر ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی کالی بھیڑیں ان جرائم کو ختم نہیں' ان کی پرورش کر رہے ہیں ورنہ ان کی کمائی کیسے ہو؟ جیسے میرے ہی آفیسر نے مجھے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر لیا۔ صرف ملک سجاد کو خوش کرنے کے لیے۔ ویسے اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

”بس رندھاوا جی پیٹھ میں چھرا مت گھونپنا' باقی آپ میری مدد کریں' میں آپ کی کر دوں گا' یہ تعلق تو اعتماد پر آگے بڑھے گا نا۔“ میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس کی آنکھیں چمک گئیں۔ اس نے اپنے اندرونی جذبات کو دباتے ہوئے کہا۔

”تو پھر شروعات میں کرتا ہوں۔ ملک سجاد نے اپنے کچھ بندے یہاں بھیجے ہیں' تمہارے لیے اور جانتے ہو وہ اس وقت کہاں ہیں؟“

”کہاں ہیں؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”میرے گاؤں کے حکمران' شاہ دین کے ڈیرے پر......دونوں ایک ہی پارٹی کے ہیں' اور پہلے بھی ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں' کسی بھی دن' وہ اچانک تیرے سامنے نمودار ہوں گے اور......“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں وہ وقت آنے ہی نہیں دوں گا۔ آپ پکی نشاندہی کرو انہیں قانون کے ہاتھ میں دینا اور اس کی پیروی کرنا میرا کام ہے......“ میں نے عزم سے کہا تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”تو پھر ہو گیا طے...... میں ان کے ساتھ کیا کرتا ہوں...... یہ تم دیکھنا......“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسے تھام لیا‘ گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے مجھے پھر سے یقین دلایا اور پھر تیز تیز قدموں سے ڈیرے سے باہر چلتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی جانے کی دھیمی دھیمی آواز آئی تو میں بھیرے کے پاس جانے کے لیے بڑھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

”بھیرے......! ممکن ہے آج کے بعد میں ڈیرے پر نہ آ سکوں‘ تم کسی بندے کا بندوبست کر لینا اور خیال رکھنا...... آج میں دودھ لے کر جا رہا ہوں۔“

”جاؤ......! اور فکر نہ کرنا......“ اس نے کہا تو میں دودھ والا برتن اٹھا کر ڈیرے سے نکل گیا۔

سورج کی تیز روشنی نے پورے ماحول کو چمکا کے رکھ دیا تھا۔ سرد ہوائیں اب گرمی کا چولا بدل رہی تھیں۔ میں نے دودھ کا برتن ماں کو دیا‘ پھر ڈٹ کر ناشتہ کر چکا تو چھاکا آ گیا۔ تیکھے نقوش والے چھاکے کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ان میں کوئی بے چینی کروٹ لے رہی ہے۔ وہ خاموشی سے میرے پاس آ کر بیٹھ گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں اس قدر بے چین ہو؟“

”بس ویسے ہی یار‘ جب سے ملک سجاد کی دھمکی سنی ہے‘ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ فون پر دھمکیاں تو ہر کوئی دے لیتا ہے‘ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ سامنا کرے۔“

”اس نے اپنے بندے بھیج دیئے ہیں۔“ میں نے کہا تو اس کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔ پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

”بات تو نہ بنی نہ یار‘ کچھ بندوں کو آگے کر کے وہ......“ اس نے کہنا چاہا‘ مگر میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے رندھاوا سے ہونے والی تفصیل بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر جب میں نے کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے تو وہ بولا۔

”دیکھ لو...... بندے اگر شاہ دین کے ڈیرے پر ہیں اور ہم انہیں وہیں قابو کرتے ہیں تو معاملہ شاہ دین کی انا کا بن جائے گا۔ مطلب سیدھے سیدھے شاہ دین سے ٹکرانا ہو گا اور اگر کہیں دوسری جگہ آمنا سامنا ہوتا ہے تو پھر یہ شاہ دین بے نقاب نہیں ہو گا۔“

”تو یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ انہیں شاہ دین کے ڈیرے پر ہی......“ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تو وہ تیزی سے بولا۔

”تو اور کیا...... اس شاہ دین کو بھی تو پتہ چلے کہ ہم سوئے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن......! اس کا فیصلہ صرف تم نے کرنا ہے کہ اس سے دشمنی نبھا پاؤ گے یا نہیں۔“

”یہ تو بعد کی بات ہے چھاکے کہ ہم دشمنی نبھا پائیں گے یا نہیں‘ جب دشمنی ہو ہی گئی تو کسی ایک کو تو ختم ہونا ہے ہم یا وہ اور کبھی نہ کبھی تو یہ ہونا ہی ہے...... کیونکہ ابھی سہی۔“ میں نے کہا تو اس نے حتمی انداز میں پوچھا۔

”تو پھر دیکھتا کیا ہے‘ چل اٹھ‘ نکلتے ہیں۔ کرتے ہیں ان کا کچھ نہ کچھ۔“

”مجھے رندھاوا کی طرف سے نشاندہی کا انتظار ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”چل تو کر انتظار‘ میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا تو میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”تو جا کہاں رہا ہے......“

”میں آ کے بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر کی جانب چل دیا۔ میں چارپائی سے اٹھ ہی رہا تھا کہ ماں آ گئی۔ اس نے مجھے عجیب سی نگاہوں کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

”جمال آخر وہ دن آ ہی گیا‘ جس کا برسوں سے ہم دونوں انتظار کر رہے تھے۔“

”ہاں ماں......! ایک دن تو یہ آنا ہی تھا۔ بس تم میرے لیے دعا کرتی رہنا۔ ماں کی اور وہ بھی مظلوم ماں کی دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور میرا یقین ہے ماں جب تک تیری دعائیں میرے ساتھ ہیں‘ میرا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”بس......! اس پیدا کرنے والے کی ذات پر بھروسہ رکھنا میرے پتر۔ وہی زندگی اور موت دینے والا ہے۔ کبھی ظالم کا ساتھ مت دینا۔ میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک تجھے کامیابیاں دے۔“ یہ کہہ کر ماں نے مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگایا‘ میرا ماتھا چوما اور دھیرے سے کہا۔ ”جا......! اللہ کے حوالے۔“ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے تڑپ کر کہا۔

”ماں......! میں اپنی جان ہار سکتا ہوں‘ پر تیری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ ایسے ہی آنسو تیری آنکھوں میں تھے جب میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے دشمنوں سے بدلہ لوں گا‘ پھر اب کیوں......؟“

”نہیں پتر......! وہ آنسو بے بسی کے تھے لیکن یہ آنسو خوشی کے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ تو اب اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اس وقت ماں باپ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتے ہیں‘ جب ان کے بچے یہ کہہ دیں کہ ہم ساری ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ تو پریشان نہ ہو میرا پتر! اور میری فکر مت کرنا۔“ ماں نے مجھے پھر سے اپنے ساتھ لگا کر نرمی سے کہا‘ میں کچھ دیر ممتا کی چھاؤں میں رہا اور پھر الگ ہو کر باہر والے کمرے کی طرف چل دیا۔

میرے اندر بے چینی بڑھ گئی تھی۔ دوپہر ہونے کو آ گئی تھی لیکن رندھاوا کا کوئی بندہ میرے پاس نہیں پہنچا تھا۔ جب بندے کی بے چینی عروج پر پہنچ جائے تو خیالات میں وسوسے بھی اگنے لگتے ہیں۔ ایک وسوسہ یہ تھا کہ کہیں رندھاوا میرے ساتھ کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہا۔ میں نے اپنے طور پر ایک وقت متعین کیا اور گھر سے باہر نکلنے کی ٹھان لی۔ میں نے اپنا پسٹل دیکھا‘ اضافی میگزین اپنی جیب میں ڈالے اور باہر والا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا‘ ایسے میں چھاکے نے اپنی بائیک روکی اور سیدھا میری طرف بڑھا۔ مجھے تنہا پا کر بولا۔

”رندھاوا ٹھیک کہتا ہے جمالے‘ بندے شاہ دین کے ڈیرے پر موجود ہیں۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا۔“ میں نے خود پر بمشکل قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”اپنا چاچا بیرو ہے نا جو شاہ دین کے ڈیرے پر خدمت گار ہے۔ اس نے ساری تفصیل بتا دی ہے۔“

”وہ تیرے کیسے قابو آ گیا اور کیا......“

”میں نے اس کی بیٹی کی نہ صرف شادی کروائی ہے بلکہ سارا خرچہ بھی کیا تھا‘ تب سے وہ...... خیر......! اس نے بتایا ہے کہ کچھ آدمی ہیں اور سارے ہی اشتہاری ہیں۔ رات کے پچھلے پہر پہنچے ہیں اور جس طرح ہم ان کے بارے میں پوچھ رہے ہیں وہ بھی تیرے بارے میں اتنے ہی متجسس ہیں۔ وہ وہیں کے خدمت گاروں سے پوچھ رہے تھے۔ وہ آج باہر نکل چکے ہیں۔ کہیں بھی ہمیں پکڑنے کی کوشش کریں گے۔“ چھاکے نے

پوری تفصیل بتائی تو میں نے کہا۔

"مگر ہم تو انہیں ڈیرے پر پکڑنا چاہتے ہیں۔"

"میں چاچے بیرو سے کہہ آیا ہوں' وہ جب بھی واپس ڈیرے پر آئیں تو وہ ہمیں بتادے اور ہماری خوش قسمتی یہ ہے جمالے...... ان کے سوا کوئی اور نہیں ہے وہاں پر......" اس نے بتایا۔

"یہ ممکن نہیں ہے...... چھاکے...... ایک دم سارے وہاں سے ہٹادیئے جائیں۔ بات دماغ کو نہیں لگتی۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"میری تو یہی اطلاع ہے' چاچے بیرو کے علاوہ دو خدمت گار ہیں وہاں پر' میں نے ایک بندہ بھیجا ہے' وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے گا تو تسلی ہوجائے گی۔"

"تو ٹھیک ہے پھر انتظار کر......" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا تو وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچنے لگے کہ کیا کرنا ہوگا۔ میرے دماغ میں صورت حال واضح نہیں ہورہی تھی۔ اس لیے میں مطمئن نہیں تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ رندھاوا کا ایک بندہ آگیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا اور مجھے پہچان کر بولا۔

"رندھاوا صاحب نے بھیجا ہے۔ اس وقت وہ لوگ نزدیکی قصبے میں گئے ہوئے ہیں۔ نور نگر میں نہیں ہیں' واپس کب آتے ہیں اس بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔" یہ کہہ کر اس نے بندوں کی تعداد اور ان کے حلیے اور تھوڑی بہت معلومات دیں' جب وہ کہہ چکا تو آخر میں بولا۔ "رندھاوا صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ زندہ یا مردہ جس حالت میں بھی ہوں...... تھانے میں...... اطلاع ہی کردیں بس...... یا۔ پھر...... میں آپ کے ساتھ...... اگر آپ مجھ پر اعتماد کریں تو......؟" یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔

"تم جاؤ' باقی میں سب دیکھ لوں گا۔" میں نے آہستگی سے کہا تو وہ تھوڑی دیر مزید بیٹھ کر چلا گیا۔ اس نے جو معلومات بھی دی تھیں بالکل ٹھیک دی تھیں' اب رندھاوا کیا چاہتا تھا؟ واقعتاً میری مدد یا پھر اپنی خفت کا بدلہ' میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ آنے والا وقت ہی فیصلہ کرنے والا تھا۔

❀......□......□......❀
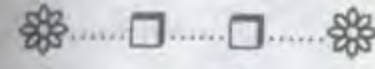
جسپال اور ہرپریت دونوں ہی رات دیر تک جاگتے رہے تھے۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی کہ کالج لائف سے لے کر اب تک اس نے اپنی تنظیم کے لیے کیا کچھ کیا ہے' لیکن جسپال نے فقط اتنا بتایا کہ وہ مختلف شوٹنگ کلب کا ممبر رہا ہے۔ مختلف ہتھیار چلانے اور تھوڑی بہت فائٹ کی تربیت لی ہے۔ وہ بہت کچھ چھپا گیا تھا۔ وہ ہرپریت کے ذہن میں کوئی ایسا تاثر نہیں بنانا چاہتا تھا جس سے وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہوجائے اور ایسا ویسا تاثر قائم کرلے جس سے بعد میں اسے پریشانی لاحق ہوجائے۔ وہ ابھی کسی پر بھی نہیں کھلنا چاہتا تھا۔ راز وہی ہوتا ہے جو خود تک محدود رہے۔ جو خود ہی راز نہ رکھ سکا تو وہ راز پرایا ہوگیا۔ اس لیے وہ دوپہر کے بعد جاکر کہیں بیدار ہوا۔ پھر وہ سکون سے تیار ہوکر نیچے ڈرائنگ روم میں آیا تو ہرپریت صوفے پر آلتی پالتی مارے اس دن کا اخبار پڑھ رہی تھی جو گورمکھی میں تھا۔ جسپال سنگھ کو وہ زبان پڑھنی نہیں آتی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا تو ہرپریت نے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور اٹھنے لگی۔

"کدھر جارہی ہو؟"

"جوتی کو ناشتے کا کہہ آؤں۔ وہ کچن میں مصروف ہوگی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سلیپر پہنے اور اندر کی جانب بڑھ گئی جبکہ وہ سیل فون پر انوجیت کے نمبر ملانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی کال مل گئی۔

"کدھر ہو یار؟"

"میں یہاں مہتاپور میں ہوں۔ تھوڑا کام تھا یہاں۔" انوجیت نے ایک نزدیکی جگہ کے بارے میں بتایا۔

"چلو ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور فون بند کرنے لگا تو وہ بولا۔

"اچھا' تم گھر پر ہی رہنا۔ وہ ایڈووکیٹ گل آج آئیں گے' تب تک میں بھی آجاؤں گا۔"

"اوکے......! میں گھر پر ہی ہوں۔" اس نے کہا تو انوجیت نے فون بند کردیا۔ تبھی فطری طور پر اس کا ذہن اس بوڑھے ایڈووکیٹ کی طرف چلا گیا جو اوپر سے بہت جذباتی لگتا تھا لیکن حقیقت میں وہ بہت ٹھنڈا انسان تھا۔ ہرپریت سے باتیں کرنے کے بعد اسے لگا تھا کہ وہ تنظیم کا کوئی اہم بندہ ہی ہوسکتا ہے۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہرپریت واپس آگئی۔ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔

"ناشتے سے پہلے نیوز سنو گے یا بعد میں......"

"یہ تو تم ایسے پوچھ رہی ہو جیسے تم مجھے کوئی میڈیسن دے رہی ہو۔" جسپال نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ کھل کر ہنس دی۔ بلاشبہ اسے ہرپریت کی ہنسی جلترنگ ایسی ہی لگی تھی۔ کھنکتی ہوئی۔ کانوں میں رس گھول دینے والی ہنسی۔ پھر اخبار کا اندرونی صفحہ اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

"یہ دیکھو...... اس پولیس آفیسر کے بارے میں تفتیش کے لیے خفیہ والے متحرک ہوگئے ہیں۔"

"پہلی تو یہ بات ہے مجھے یہ گورمکھی پڑھنی نہیں آتی اور دوسری بات اس خبر سے تم لوگوں کو الرٹ ہونا چاہیے مجھے تو نہیں۔"

"ہاں...... دیکھتے ہیں' ان کی تفتیش کس رخ پر جاتی ہے۔" وہ بے خیالی کے سے انداز میں بولی پھر اس نے خبر کا متن پڑھ کر سنادیا' کسی رپورٹر نے باوثوق ذرائع سے وہ خبر دی تھی۔ وہ ناشتہ آجانے پر اس خبر کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ وہ ناشتہ کرنے لگا تو ہرپریت اندر چلی گئی۔

اس وقت وہ دونوں کاریڈور میں آکر بیٹھ چکے تھے۔ ہرپریت نے نیلی جین کے ساتھ ہاف سلیوتی شرٹ پہن لی تھی۔ اپنے کھلے ہوئے بال پونی میں باندھ لیے تھے۔ اس کا میک اپ سے بے نیاز چہرہ تروتازہ لگ رہا تھا۔ جسپال کے اندر بڑے خوشگوار جذبے اسے مسحور کررہے تھے۔ اگرچہ اس نے ہرپریت کے بارے میں سوچا نہیں تھا لیکن اس کا ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے ہونے سے ماحول بھرا بھرا سا لگتا تھا۔ جیسے ہر منظر میں رنگ گہرے ہوگئے ہوں۔ اس نے بھرپور نگاہوں سے ہرپریت کو دیکھا' شاید پنجاب کے ماحول کی کشش تھی یا پھر آب وہوا کا اثر' کچھ تھا کہ اس کا دل اتھل پتھل ہونے لگا تھا۔ بات یہ نہیں کہ اس نے وینکور میں حسن نہیں دیکھا تھا' وہاں بھی پنجابی لوگوں کی بھرمار تھی اور ایک سے ایک بڑھ کر حسین تھیں۔ لیکن جو کچھ وہ ہرپریت میں دیکھ رہا تھا وہ کچھ انوکھی تھی' ایک الگ سی' جس کی اسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اسے یوں گہری نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاکر وہ آہستگی سے بولی۔

"جسی جی...... کہاں ہو؟"

"یہیں ہوں' تمہارے پاس۔" اس نے اچانک چونکتے ہوئے کہا پھر ہلکے سے مسکرا کر کوئی ایسی بات کرنا چاہتا تھا کہ اس کے جذبات کی ترجمانی ہوسکے' انہی لمحات میں گیٹ وا ہوا اور ایک نیلے رنگ کی کار اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ بلاشبہ بنتا سنگھ کو معلوم ہوگا کہ وہ کون شخص ہے' اس لیے کار اندر آنے دی' تبھی ہرپریت نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"ایڈووکیٹ گل...... آگئے۔"

کار پورچ میں روک کر وہ اترا اور پھر انہی کی جانب

بڑھا آیا' واہ گورو کہتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے کو وش کیا اور انہی کے پاس بیٹھ گیا۔

''انکل...... اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' ہرپریت نے کہا تو وہ بولا۔

''او نہیں پتر...... ادھر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر اندر کی جانب چلی گئی۔ ایڈووکیٹ گل نے ایک نگاہ جسپال پر ڈالی اور پوچھا۔

''جسپال......! تجھے میرے آنے کے بارے میں انوجیت نے بتا دیا ہوگا۔''

''ہاں جی' اس سے میری بات ہوئی ہے' بتایا تھا اس نے۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''وہ اچانک ہی تم سے ملنے کے لیے آنا پڑا' میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم یہاں سے کہیں ادھر ادھر جاؤ' وہ اصل میں کچھ باتیں کرنا تھی تیرے ساتھ۔''

''جی بولیں' میں سن رہا ہوں۔'' اس نے کہا تو وہ کہنے لگا۔

''وہ جس پولیس آفیسر کا قتل ہوا ہے نا' اس کے لیے حکومت نے ایک تفتیشی ٹیم بنا دی ہے' جو اس کے قتل کی وجہ اور محرکات کی چھان بین کرے گی۔ تمہارا اس قتل سے کوئی لینا دینا نہیں ہے لیکن پتہ نہیں مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ تجھے بھی اس قتل کی تفتیش میں ذہنی اذیت دینے کی کوشش کی جائے گی۔''

''وہ کیوں انکل......!'' اس نے آہستگی سے پوچھا۔

''اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ پہلے وہ بنیادی وجہ سن لو' جس کے بارے میں تجھے معلوم ہے کہ نہیں' خیر...... انگریز نے جہاں جہاں اور جس قوم سے بھی خوف محسوس کیا' اسے کسی نہ کسی طرح متحد نہیں رہنے دیا۔ جیسے مسلمانوں میں مرزائی پیدا کر کے ایک خاص قسم کا فتنہ پیدا کر دیا' اسی طرح سکھوں میں بھی نرنکاری بنا کر نہ صرف دھرم کے طور پر ان کو نقصان پہنچایا بلکہ سکھوں کو سکھوں کے ساتھ لڑانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ آج جس طرح مرزائی بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے خلاف یہودیوں والا کام کر رہے ہیں' اسی طرح نرنکاری بھی ہندوؤں والا کام کر رہے ہیں۔ انگریز جو کام مرزائیوں اور نرنکاریوں سے لے رہے تھے' آج وہی کام مرزائیوں سے انگریز اور نرنکاریوں سے ہندو لے رہے ہیں۔ اب تک خالصتان بن چکا ہوتا اور سانحہ 1984 پیش ہی نہ آیا ہوتا' اگر یہ نرنکاری نہ ہوتے۔ سکھوں نے جب بھی متحد ہونے کی کوشش کی ہے' انہی نرنکاریوں کو استعمال کیا گیا' یہی امرت دھاری سکھوں کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔ وہ پولیس آفیسر بھی نرنکاری تھا۔ جس کی تفتیشی ٹیم میں پانچ لوگوں کو شامل کیا گیا ہے۔ جن میں تین نرنکاری پولیس آفیسر ہیں۔ ایک ہندو' اور ایک اکالی دل کا لیڈر رویند سنگھ ہے۔ وہی رویند سنگھ جو تیرے خاندان کی تباہی کا باعث بنا تھا۔''

''گل صاحب! آپ کی ساری بات ٹھیک ہے' سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مجھے کیوں ذہنی اذیت دیں گے' یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟'' جسپال نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا تو ایڈووکیٹ گل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں......! میں اس سوال کا جواب دینے اور اس کے تناظر میں پیش بندی کے طور پر بات کرنے یہاں آیا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم یہ مت خیال کرو کہ انہیں تمہاری یہاں آمد کے بارے میں علم نہیں' جیسے ہی تم نے یہاں قدم رکھا تھا' انہیں معلوم ہو گیا تھا' اتنے عرصے بعد تمہاری آمد کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ تمہارا جاتے ہی اپنی حویلی دیکھنا ایک بہت بڑا اشارا تھا' ہی دوسرا تم نے اگلے ہی دن درخواست گزار دی۔ جس کے ردعمل میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ وہ بظاہر دکھائی نہیں دے رہی لیکن یہاں کے گاؤں کے پنچ' سرپنچ' تحصیل دار کے آفس اور ان کے متعلقہ لوگوں کو پوری طرح الرٹ کر دیا گیا کہ جسپال سنگھ کے اگلے قدم کے بارے میں پوری جانکاری رکھی جائے۔ وہ تمہارے راستے میں رکاوٹوں پر رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ پولیس آفیسر کے بارے میں تم سے پوچھ گچھ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آخری بار تم ہی اس سے ملے تھے اور تمہاری اس سے تلخ کلامی ہوئی تھی اور بس......''

''میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مگر ایڈووکیٹ صاحب......! یہ تو بہت اچھی خبر ہے کہ انہیں یعنی میرے دشمنوں کو میرے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ اب مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔'' جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بات سے میں خوش ہوا' لیکن اس کے ساتھ تمہارا زیادہ محتاط ہو جانا بھی ضروری ہے۔'' ایڈووکیٹ گل نے کہا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو ان میں ایک طرح سے چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ تبھی ہرپریت خود ہی ٹرے میں لسی کے گلاس رکھے نمودار ہوئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور وہیں جا بیٹھی جہاں سے اٹھ کر گئی تھی۔ ایڈووکیٹ گل نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جسپال......! تمہارا اعتماد بڑا اچھا ہے۔ لیکن تم یہاں کی پولیس اور ان تفتیشی اداروں کے بارے میں نہیں جانتے۔ یہاں پر انگریز کا وہی کالا قانون چل رہا ہے۔ جسے وہ اپنی مرضی سے استعمال کیا کرتا تھا اور ان غلاموں پر اپنی حکومت بنائے ہوئے تھا۔ اس لیے احتیاط میرے پتر! بڑی احتیاط۔''

''جی' آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' جسپال نے سوچتے ہوئے کہا اور خاموش ہو گیا۔ ایک دم سے اس کے ذہن میں بہت سارے سوال جنم لینے لگے تھے۔ اسے اندازہ تو تھا کہ اوگی پنڈ میں آمد کے بارے میں اس کے دشمن جان جائیں گے لیکن اتنی جلدی؟ اس کی امید نہیں تھی۔ وہ ابھی کسی نئی بات کا سرا تلاش کر رہا تھا کہ گیٹ پر کال بیل ہوئی۔ انہوں نے فطری طور پر ادھر دیکھا تو بنتا سنگھ باہر جا چکا تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ باہر سے اندر کی طرف آیا اور سیدھا ان کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ انہیں تجسس ہو گیا کہ باہر کون آیا ہوگا' بنتا سنگھ کو ان کے پاس آتے ہوئے چند منٹ لگے اور آتے ہی ہرپریت کور کی طرف دیکھ کر بولا۔

''باہر ایک جیپ میں دو بندے ہیں' کہہ رہے ہیں کہ وہ انوجیت یا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''نام نہیں بتایا انہوں نے؟'' ہرپریت نے پوچھا۔

''ایک نے اپنا نام بتایا ہے۔ من راج سنگھ' کہہ رہا ہے کہ اس کا تعلق پولیس سے ہے۔''

''اوہ......! اس تفتیشی ٹیم سے......'' ایڈووکیٹ گل نے بے ساختہ کہا تو ہرپریت نے کہا۔

''اچھا بلاؤ۔ لیکن ان کی جیپ باہر رہے۔''

بنتا سنگھ چلا گیا تو تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' جس پر جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گل صاحب...... آپ بالکل پریشان نہ ہوں میں دیکھتا ہوں......''

یہ کہہ کر اس نے گیٹ کی طرف دیکھا' کچھ ہی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا' جس نے مہرون رنگ کی پگڑی اور گرے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا' داڑھی اس نے سنواری ہوئی تھی۔ جو زیادہ تر سفید ہو چکی تھی۔ وہ نپے تلے قدم رکھتا ہوا ان کے پاس آ گیا' اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''ست سری اکال۔''

انہوں نے جواب دیا اور ہرپریت نے اسے

بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا تو ہر پریت بولی۔
''جی فرمائیں......! انوجیت تو اس وقت گھر پر نہیں ہے۔''
''آپ تو ہیں ہر پریت کور جی......'' یہ کہہ کر اس نے دونوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''میرے خیال میں آپ ہی جسپال سنگھ ہیں جو ابھی وینکور سے آئے ہیں اور ایڈووکیٹ گل صاحب آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ آپ کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔''
''میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔'' گل نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''دراصل میں جس سلسلے میں یہاں آیا ہوں وہ ایک پولیس آفیسر کے قتل کے بارے میں تفتیش ہے اور بہت ساری وجوہات قتل کے محرکات اور اندازے ہیں جن میں مضبوط ترین وجہ سکھ تنظیم بھی ہے جو وقتاً فوقتاً اس پولیس آفیسر کو قتل کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ آپ کا بھی اس تنظیم سے تعلق ہے۔ انوجیت اور یہ ہر پریت بھی اس سے تعلق رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے تنظیم کے لوگ ایک جگہ ہوں تو حیرت کی کیا بات ہے؟''
''آپ کا تعارف......'' جسپال سنگھ نے سرد سے لہجے میں پوچھا تو من راج سنگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔
''من راج سنگھ سی بی آئی سے...... آپ شاید مجھے نہ جانتے ہوں لیکن سکھ تنظیم کے لوگ مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔''
''آپ کے آنے کا مقصد؟'' جسپال نے پوچھا تو من راج سنگھ نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔
''آپ اس پولیس آفیسر سے آخری بار ملے تھے اور آپ کی تلخ کلامی بھی ہوئی تھی آپ اس واقعے کو دہرا سکتے ہیں مطلب آپ کی تلخ کلامی کیا ہوئی تھی؟''
''پہلی اور آخری بار...... اس کا بات کرنے کا انداز بہت گھٹیا قسم کا تھا۔ جس کا بہرحال میں عادی نہیں تھا۔ اس لیے مجھے غصہ آ گیا۔'' جسپال سنگھ نے یوں کہا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔
''پھر بھی...... کوئی بات......؟'' اس نے کریدنے کی کوشش کی۔
''چونکہ میرے لیے اتنا اہم نہیں تھا وہ شخص اس لیے میں نے ذہن میں نہیں رکھا کیونکہ ہمیں تھانے میں ایک دوسرے بندے نے کہا تھا کہ وہ پولیس آفیسر فطری طور پر ایسا ہی ہے۔'' اس نے پھر بے پروائی کے سے انداز میں کہا۔
''جسپال......! آپ خود کو زیر تفتیش سمجھیے گا۔'' من راج نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''وجہ......؟'' وہ بولا۔
''اس گیٹ کے پار میرا خیال کچھ اور تھا لیکن یہاں آ کر جو میں نے سمجھا وہ کہہ دیا۔ اب اپنے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا......'' من راج نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو ایڈووکیٹ گل نے بھی سخت لہجے میں کہا۔
''کانگریس حکومت اور خصوصاً سکھوں کے بارے میں ان کی پالیسی میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ پچیس سال ہو گئے اس چوراسی کا انصاف نہیں ملا اور نہ ہی کسی کو اس کا ذمے دار ٹھہرا کر مسئلہ حل کیا گیا ہے اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مسئلے...... آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں اور ہم بھی سمجھتے ہیں کہ آپ نے ایسا کیوں کہا؟''
''اگر آپ سمجھ گئے ہیں تو پھر مزید سمجھ جائیں زیادہ سمجھانا نہ پڑے چلتا ہوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''آفیسر......'' جسپال نے سرد سے لہجے میں کہا۔
''میں نہیں جانتا آپ ایسا کیوں کہہ کر جا رہے ہیں

لیکن میں خود چاہوں گا کہ آپ اپنے یہ لفظ یاد رکھیں کسی جگہ آپ کو یہ لفظ دہرانے بھی پڑ سکتے ہیں۔"

"میں انتظار کروں گا.....“ من راج نے اس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر تیزی سے واپس مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گیٹ پار کر کے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تبھی ہرپریت بولی۔

"من راج‘ یہ لدھیانے کا رہنے والا ہے نا.....؟"

"ہاں‘ وہی ہے.....“ گل نے کہا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ یہ اتنی جلدی یہاں پہنچ جائیں گے‘ خیر دیکھتے ہیں‘ اب میں چلتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے گل صاحب.....! لیکن یہ یاد رکھیں‘ میرے معاملے میں جتنی مرضی یہ دشمن رکاوٹ کھڑی کریں‘ کام جاری رہنا چاہیے۔ آپ اپنا اکاؤنٹ اور بینک کے بارے میں معلومات مجھے دے دیں۔ رقم کی کمی نہیں ہوگی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

"انوجیت کے پاس ساری معلومات ہیں‘ لیکن تم مت گھبراؤ۔ میں اسے دیکھتا رہوں گا۔ یہ الجھن تو اب رہے گی۔“ ایڈووکیٹ گل نے تشویش سے کہا تو جسپال خاموش رہا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا پھر تیزی سے پورچ تک گیا‘ اپنی گاڑی لی اور گیٹ پار کر گیا۔

"یہ پولیس آفیسر ہمارے لیے پھندا بنانے کی کوشش کرے گا۔“ ہرپریت نے متردد لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں‘ تم پریشان نہ ہو۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”آؤ..... میرے کمرے تک چلیں۔ جوتی سے کہو‘ ہم کھانا باہر ہی کھائیں گے اور ممکن ہے‘ گھر ذرا لیٹ آئیں۔"

"خیریت۔“ ہرپریت بولی۔

"بتاتا ہوں نا..... آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تو ہرپریت بھی اس کے ساتھ چل دی۔

جس وقت ہرپریت اس کے کمرے میں گئی‘ وہ اپنا لیپ ٹاپ لیے بیڈ پر بیٹھا تھا اور بڑی گہری نگاہوں سے اسکرین پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ ہرپریت اس کے ساتھ ہی جا کر بیٹھ گئی اور اسکرین پر دیکھنے لگی۔ وہاں کوئی آن لائن تھا اور وہ اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ہرپریت جب اسکے پاس بیٹھ گئی تو جسپال نے پوچھا۔

"وہ کون سا اخبار تھا‘ جس کی خبر تم نے مجھے صبح دکھائی تھی۔ وہ اخبار آن لائن ہے؟"

"ہاں ہے.....“ اس نے جواب دیا پھر مزید قریب ہو کر اس کے ساتھ لگ گئی‘ اس کے بدن سے اٹھنے والی مسحور کن مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی‘ اس نے سرچ میں اخبار کا نام ڈالا اور پھر وہ اخبار لے آئی‘ جلد ہی اس کا وہ صفحہ کھول لیا‘ جس پر خبر تھی۔ جسپال نے اس صفحے کا..... اسے بھیج دیا جس سے بات کر رہا تھا۔ پھر کچھ دیر انتظار کا کہہ کر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ ہرپریت اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔

"یہ سب کیا تھا جسپال؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

"یہیں پنجاب میں کچھ لوگ ایسے ہیں‘ جنہیں میں نہیں جانتا‘ لیکن وہ میرے ہر طرح سے کام آتے ہیں۔ انہیں میں نے ایک ٹاسک دیا ہے‘ کچھ دیر بعد وہ اس کا جواب دیں گے۔“ جسپال نے جواب دیا۔

"اس لیے تم میری تنظیم کے ساتھ.....“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہاں..... میں ان سے بچنا چاہ رہا ہوں‘ ابھی تم نے نہیں دیکھا‘ ایڈووکیٹ گل کی وجہ سے‘ وہ میری طرف سے اپنا خیال بدل جانے کی بات کر گیا ہے۔"

"ہوں.....“ ہرپریت نے ہنکارا بھرا۔ تب جسپال نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا اور بولا۔

"ہرپریت..... کیا تم میرا ساتھ دوگی۔"

"ساتھ کیا..... میں تو دل بھی دے چکی ہوں۔ جان ہے وہ بھی جب چاہے لے سکتے ہو۔“ اس نے اپنی نگاہوں میں سارے جہان کا پیار سمیٹتے ہوئے کہا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر پیار کی مہر اس کے ہونٹوں پر ثبت کر دی تو وہ شدت جذبات سے بولا۔

"ٹھیک ہے ہرپریت..... میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن آخری سانس بھی تیری امانت ہوگی۔"

اس نے کہا تو ہرپریت اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی۔ جسپال کو یوں لگا جیسے اس کی تلاش یہاں آ کر ختم ہو گئی ہے۔ اب تک وہ یونہی بھٹکتا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اس سے الگ ہو گئی اور اس کے چہرے کو دیکھتی رہی‘ پھر شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔ جسپال ہنس دیا۔ اچانک وہ اٹھی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ وہ کتنی دیر تک ان لذت آفریں خیالوں میں کھویا رہا۔ ان لمحات میں اسے یوں لگ رہا تھا کہ ساری دنیا خاموش ہو گئی ہے اور وہ فقط ایک گمنام جزیرے پر خاموشیوں میں ڈوب گیا ہے جہاں سے نکلنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا‘ اچانک اس کے سیل فون پر بجتی ٹون نے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اس نے جلدی سے لیپ ٹاپ کھولا اور اسکرین پر نگاہیں جما دیں۔

❀.....□.....□.....❀

مغربی افق پر ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی پھیل گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرا ہو جانے والا تھا۔ دوپہر سے لے کر شام ہو جانے تک مجھے چند جگہوں سے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ کچھ مشکوک بندے میرے بارے میں پوچھتے پھر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ میرے گھر کا بھی ایک چکر لگا چکے تھے۔ میں دوپہر کے وقت ہی اپنے گھر سے نکل کر چھاکے کے پاس آ گیا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے گھر سے ضروری سامان لیا اور دلبر کے کنویں پر چلے گئے۔ وہاں پر تاش جاری تھی۔ میرے سارے دوست وہیں جمع تھے۔ مجھے دیکھتے ہی دلبر نے کہا تھا۔

"لے بھئی جمالے..... بیٹھ میرے سامنے اور لگا شرط بکرے بکرے کی‘ یہیں پکائیں گے‘ یہیں کھائیں گے۔"

"پر تیرا یار جمالا کسی اور کام سے آیا ہے۔“ چھاکے نے چارپائی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا تو ایک دم سے سب نے تاش روک دی۔ اس کے لہجے میں ہی کچھ ایسی بات تھی۔

"بول جمالے..... بات کیا ہے؟"

"کچھ مشکوک بندے آئے ہیں علاقے میں مجھے مارنے کے لیے۔“ میں نے کہا تو وہ چونک گیا اور پوچھا۔

"کون ہیں اور کدھر ہیں؟"

"میں نہیں جانتا‘ انہی کا تو پتہ کرنا ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تو ادھر بیٹھ‘ میں ساری خبر لے کر آتا ہوں۔ چلو اوئے سب نکلو اور شام سے پہلے ان کا پتہ لے کر آؤ۔“ وہ بھی تاش چھوڑ کر اٹھ گئے تھے۔ پھر شام ہوتے ہوتے وہ واپس آنے لگے۔ دلبر نے جب ساری معلومات جمع کر لی تو کہا۔ ”بڑی حیرت کی بات ہے یار‘ سردار شاہ دین کے ڈیرے پر وہ بندے ہیں‘ اور تجھے مارنے کے لیے آئے ہیں۔ جمالے.....! یہ پھڈا لمبا ہو جائے گا۔"

"تو ڈر گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

"اونہیں‘ میں نہیں ڈرا‘ بلکہ سمجھا رہا ہوں کہ....."

"چل ٹھیک ہے پھر‘ جاتے ہیں سردار کے پاس‘ اس کی منت ترلا کرتے ہیں‘ اس کے پیر پڑیں گے‘ مان گیا تو ٹھیک ورنہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیں گے۔“ چھاکے نے جل کر کہا تو دلبر بولا۔

"اوئے جان تو ایک بار جانی ہے‘ سردار سے ٹکر

لینے کا مطلب ہے پھر ہم سکون سے نہیں بیٹھ سکیں گے۔ یا وہ ختم ہوگا یا ہم...... باقی تو جو کہے گا میں وہی کروں گا......" اس نے چھاکے کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"چل ٹھیک ہے تو کر سکون میں چلتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ غصے سے بولا۔

"یار تو کوئی اور چکر کیوں نہیں چلاتا ہم بھی سامنے نہ آئیں اور وہ بندے بھی نہ رہیں؟"

"تو پھر سن...... پیرزادے کے جن بندوں سے تیری دشمنی چل رہی ہے ان کا کوئی ایک بندہ تیرے ہتھے چڑھ سکتا ہے۔" میں نے کہا تو وہ چونکتے ہوئے بولا۔

"میں سمجھ گیا۔ چل اٹھ نکلیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھ کر کنویں کے پاس بنے کچے کمروں میں سے ایک کمرے میں گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ میرے چھاکے اور دلبر کے علاوہ تین بندے اور تھے۔ انہوں نے بھی ہتھیار سنبھالے اور ہم ایک جیپ اور تین بائیک پر نکل پڑے ہمارا رخ پیرزادے کے علاقے کی طرف تھا۔

ہمیں اپنا شکار تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ہمیں معلوم تھا کہ پیرزادہ کے علاقے میں شراب نکالنے والی بھٹی کہاں چل رہی ہے۔ وہ راستہ اگرچہ تھوڑا سا مشکل تھا لیکن ہمارے لیے وہاں جانا انتہائی آسان تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایسے میں ان کے پاس کئی لوگ آتے جاتے تھے۔ ہم نے دو بائیک کی ہیڈ لائٹ بجھادی جبکہ ایک کی روشن رکھی۔ ہم بھٹی کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ مجھ سے زیادہ دلبر تیزی دکھا رہا تھا۔ اسے بڑے عرصے بعد موقع ملا تھا کہ ان سے اپنا انتقام لے سکے۔ میں نے تیز نگاہوں سے وہاں پر موجود لوگوں کا جائزہ لیا۔ وہاں پر تین بندے تھے۔ ایک بھٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا دوسرا کچے کمرے کے باہر زمین پر بیٹھا ہوا لالٹین کی روشنی میں کچھ کر رہا تھا۔ جبکہ تیسرا چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔

"کیا خیال ہے ذرا انتظار کرلیں؟" میں نے دلبر سے پوچھا۔

"نہیں...... انہوں نے ہمیں آتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا اگر یہاں رک گئے تو وہ چوکنے ہوجائیں گے۔" دلبر نے میری بات نہ مانی۔

"چلو پھر......!" میں نے باقی سب کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور دلبر کے ساتھ ان کے پاس چلے گئے۔ جیسے ہی ان کی نگاہ دلبر پر پڑی چارپائی پر بیٹھا ہوا بندہ تیزی سے اٹھا اور لاشعوری طور پر اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کمرے کے باہر بیٹھا بندہ بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"رک جاؤ......!" میں نے اونچی آواز میں کہا تو وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ میں آگے بڑھا تو وہ بولا۔

"جمالے یہ تو دلبر کو ساتھ لے کر کیوں آ گیا ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔" میں نے پوچھا۔

"دشمن کا دوست دشمن ہی ہوتا ہے۔ اسے لے کر چلا جا یہاں سے ورنہ......!" اس چارپائی والے بندے نے انتہائی غصے میں کہا۔

"ورنہ کیا کرے گا......؟" میں نے پوچھا تو اس نے انتہائی غلیظ گالی دیتے ہوئے کہا۔

"ماردوں گا...... تجھے بھی اور اسے بھی...... چل نکل یہاں سے......" یہ کہتے ہوئے اس نے گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"مگر...... میں تجھے لینے کے لیے آیا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے چشم زدن میں اپنا ریوالور نکالا اور اس کے ہاتھ پر فائر کردیا۔ وہ ڈکارتے ہوئے پیچھے کی طرف لپکا۔ میں نے جان بوجھ کر اس کا نشانہ نہیں باندھا تھا۔ فائر کی آواز سنتے ہی چھاکے سمیت چاروں تیزی سے آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی تینوں کو پکڑ لیا۔ چند منٹ مارا ماری چلتی رہی۔ انہوں نے تھوڑی بہت مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے۔ کچھ ہی دیر بعد ان تینوں کو باندھ لیا گیا۔

"انہیں جیپ میں پھینکو اور خیال رکھو ان کے منہ بند رہیں۔" میں نے کہا اور بائیک پر جا بیٹھا۔ میرے ساتھ ہی دلبر نکلا اور ہمارے ساتھ باقی بھی نکل پڑے۔ اب ہمارے پاس وقت بہت تھوڑا تھا۔

سردار شاہ دین کے ڈیرے سے کچھ دور ہم سب رک گئے۔ میں نے راستے میں دلبر کو سمجھا دیا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ وہیں رک گیا۔ جبکہ میں اور چھاکا وہاں سے پیدل آگے بڑھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ڈیرے کی روشنیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ سردار شاہ دین کا ڈیرہ بھی کسی حویلی سے کم نہیں تھا۔ گیٹ پار کرتے ہی بڑا سارا صحن دکھائی دیتا تھا۔ ان کے اطراف میں تین طرف کمرے بنے ہوئے تھے اور ایک جانب سردار شاہ دین کے مہمانوں کے لیے ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے علاوہ دوسرے متعلقہ کمرے تھے۔ کمروں کے آگے دالان تھا۔ جن کے اوپر "یو" کی شکل میں چھت تھی۔

ہم ڈیرے کے پچھواڑے کی طرف سے آگے بڑھے تھے۔ چاچے بیرو نے اگر درست معلومات دی تھیں تو ان لوگوں کو چھت پر ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ ان کے بستر وہیں پر لگائے گئے تھے۔ اب وہاں پر کیا صورت حال تھی اس کا مجھے پکا یقین نہیں تھا۔ وہاں کچھ دوسری صورت حال کا بھی سامنا ہوسکتا تھا۔ تاہم اس وقت ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ ڈیرے کی چھت تک پہنچنا تھا۔ گھپ اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں بہت عرصہ پہلے ڈیرے پر آیا تھا۔ پھر گاہے بگاہے ادھر سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ ڈیرے کے پچھواڑے کی مشرقی سمت میں اینٹوں کی دراڑیں چھوڑی ہوئی تھیں میں نے وہیں سے اوپر چڑھنے کا سوچا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اندازے کے مطابق اس طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں اک اور بھی خطرہ تھا۔ ڈیرے میں جب سارے لوگ اپنی اپنی جگہ ٹک جاتے تھے تو باہر کی طرف کتے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ جو باہر کی طرف سے نہ صرف وقت سے پہلے انہیں الرٹ کردیتے تھے بلکہ چوکیدار کے لیے بہت حد تک معاون بھی ہوتے تھے۔ کتوں کے کھلنے سے پہلے پہلے میں اپنا کام مکمل کرلینا چاہتا تھا۔ میں جیسے ہی مشرقی کونے تک پہنچا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ دراڑیں ویسی ہی تھیں۔ میں نے سرگوشی میں چھاکے کو بتایا پھر اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے ان دراڑوں کے ذریعے چڑھنے لگا۔ اس وقت اوپر چڑھتے ہوئے مجھے اپنے وزن کا احساس ہوا۔ میں نے ہمت کی اور آہستہ آہستہ اوپر تک پہنچ گیا۔

میں نے محتاط انداز میں چھت پر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اپنے وزن کے باعث ان دراڑوں پر زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے صرف ایک اندازہ تھا کہ ذرا فاصلے پر ایک قطار میں چارپائیوں پر بستر لگے ہوئے تھے اور ان پر کوئی نہیں تھا۔ میں نے گہری نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور چاردیواری پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ ہلکی سی دھپ کی آواز آئی۔ میں سکون سے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر نیچے چھاکے کو ٹارچ کے جلانے اور بجھانے سے اشارہ

دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اوپر آ گیا۔ پھر دونوں طرف دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

''لگتا ہے یہاں کوئی نہیں ہے؟''

''ہیں نہیں تو آ جائیں گے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر صحن میں جھانکا' وہ چھ کے چھ صحن میں بیٹھے ہوئے تھے اور وحشیانہ انداز میں کھانے پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کبھی کھانا دیکھا ہی نہیں ہے۔ ان کے قریب ہی چاچا بیرو کسی خادم کی مانند کھڑا تھا۔ میں چاہتا تو یہیں کھڑے کھڑے ان کا نشانہ لے کر انہی چارپائیوں پر انہیں ختم کر دیتا۔ مگر میں کچھ اور چاہتا تھا۔ مجھے اس وقت تک صبر کرنا تھا' جب تک وہ اوپر نہیں آ جاتے۔ میرے ذہن کے گوشے میں یہ خطرہ بہرحال موجود تھا کہ ممکن ہے ان کے علاوہ کوئی دوسرے بھی یہاں ہوں۔ یہاں سے انہیں ختم کرنے میں سارا معاملہ ہی گڑبڑ ہو جانے والا تھا۔ مجھے اب صرف ان کا انتظار ہی کرنا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے جاں گسل انتظار کے بعد ان کا رخ سیڑھیوں کی طرف ہوا۔ وہ سب آگے پیچھے چھت کی جانب بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ بلاشبہ وہ غافل ہو کر سونا نہیں چاہ رہے تھے۔ ممکن ہے ان میں کچھ چوکیداری بھی کرتے' لیکن میں انہیں اتنا موقع دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہ پوری طرح اندازہ تھا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر کہاں آئیں گے۔ اس لیے میں ان کی مخالف سمت میں بالکل سامنے کی طرف اوٹ میں چھپ گیا۔ چھا کا سمجھ گیا تھا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان فقط چند لمحوں کی دوری تھی' پھر جو کچھ کرنا تھا وہ انتہائی تیزی سے کرنا تھا۔ تبھی چھت پر ہلچل ہوئی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اپنے بستروں پر آ ئے۔ ہم دم سادھے انہیں دیکھتے رہے پھر جیسے ہی وہ چارپائیوں پر بیٹھنے لگے میں نے ایک کا نشانہ لے کر گولی چلا دی' جس وقت تک وہ کچھ سمجھتے دوسرے کے منہ سے چیخ بلند ہوئی پھر تیسری' چوتھی...... میں نے میگزین خالی کر دیا۔ یہی حال چھاکے کا تھا۔ انہیں ہتھیار رکھ کر اٹھانے کی مہلت ہی نہیں ملی' شاید ان کے گمان میں یہی تھا کہ اس حویلی نما ڈیرے پر کون آ کر ان پر وار کر سکتا ہے' جنہیں سارا دن باہر کسی نے نہیں پوچھا۔ فوراً ہی ان کی طرف لپکنا رسک تھا لیکن وہاں بیٹھے رہنا اس سے بھی زیادہ رسک تھا۔ میں نے کوئی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی کے ساتھ دوسرا میگزین لگایا اور ان کی طرف بڑھا۔ کوئی تڑپ رہا تھا اور کوئی موت کی آغوش میں جا رہا تھا۔ میں نے ایک نگاہ ان پر ڈالی تو مجھے خود جھرجھری آ گئی۔ یہ میری پہلی درندگی تھی۔

جب کوئی کسی پر ظلم کر رہا ہو' تب اتنا جوش نہیں ہوتا' جتنا بدلہ لیتے وقت جوش ہوتا ہے۔ مظلوم جب انتقام لینے پر اتر آئے تو پھر اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ بدلے کی آگ انسان کے اندر قوت بھر دیتی ہے اور یہ قوت اندھی ہوتی ہے۔ اس میں کون کس قدر جل جاتا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا۔ میں اور چھاکے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' پھر اپنے سامنے تڑپتے ہوئے ان لوگوں کو جنہیں اگر میں ختم نہ کرتا تو وہ مجھے ختم کر دیتے۔ ہم نے چشم زدن میں فیصلہ کر لیا کہ کیا کرنا ہے' چھا کا پاؤں کی طرف سے اور میں نے بازوؤں کی طرف سے ایک کو پکڑا اور ڈیرے کے پچھواڑے پھینک دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس کے کچھ بچے کھچے سانس بھی ہوں گے' وہ اتنی اونچائی سے گر کر ختم ہو گئے ہوں گے' یکے بعد دیگرے باقی پانچوں کو بھی ایسے ہی جھلا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں

نے ان کے ہتھیار اکٹھے کیے اور وہ بھی ایک ایک کر کے نیچے پھینک دیئے۔ میں نے چھاکے کو اشارہ کیا کہ وہ ٹارچ سے دلبر کو کام مکمل ہو جانے کی اطلاع دے دے اور خود چھت کے کنارے جا کر نیچے صحن میں دیکھا۔ فائرنگ کی آواز سے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ نیچے ہلچل نہ مچی ہو۔ مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سوائے چاچے بیرو کے' کوئی بھی صحن میں نہیں تھا۔ وہ حیران و پریشان اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مزید وقت ضائع نہیں کیا اور دراڑوں کے ذریعے نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ چھا کا مجھ سے پہلے ہی نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ پھر دھپ کی آواز کے ساتھ پتے چرچرائے تو میں سمجھ گیا چھا کا نیچے اتر گیا ہے۔ میں نے بھی اس کے قریب چھلانگ لگا دی۔

''یار! ڈیرے میں چاچے بیرو کے علاوہ کوئی بندہ ہی نہیں ہے' وہ اکیلا......'' میں نے سرگوشی میں تیز کہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''سارے ملازمین ہیں' مگر وہ نشے میں دھت ہوں گے' انہیں ساتھ میں بہت کچھ ملا کر دیا ہے' تو ان کی فکر مت کر' یہاں سے نکل۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اس جانب دیکھا جدھر سے جیپ آ نا تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بند تھی اور اس کی گھر گھر سے اندازہ ہو گیا' جیپ رکتے ہی دلبر کے ساتھ اس کے دو ساتھی تیزی سے اتر کر آ ئے۔

''وہ تیسرا کہاں ہے؟'' چھاکے نے پوچھا تو دلبر نے سرگوشی میں ٹارچ کی محدود روشنی میں دیکھا اور بولا۔

''ان تینوں کے پاس جو بندھے ہوئے پڑے ہیں' چل اٹھا کر انہیں جیپ میں ڈال۔''

ہم نے تیزی سے انہیں جیپ میں ڈالا' ہتھیار اٹھا کر ان کے قریب رکھے اور واپسی کے لیے چل پڑے۔ ہم جیپ میں ٹھنسے ہوئے تھے لیکن ہمیں وہاں سے تھوڑا فاصلہ ہی طے کرنا تھا' جلد ہی ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں پر وہ تینوں بندھے ہوئے تھے۔ میں نے دلبر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''لے بھئی دلبر...... تو اپنا بدلہ لے لے۔''

شاید وہ اس لمحے کا منتظر تھا' اس نے اپنا ریوالور نکالا اور بہت قریب سے اپنے سامنے بندھے ہوئے تینوں بندوں پر خالی کر دیا۔ ہم سب ان کے تڑپنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ ناسور تھے جو ظالم کے ہاتھوں کو مزید مضبوط کرنے کا باعث بنتے تھے جو اپنے جیسے لوگوں پر زیادہ ظلم کرتے۔ پھر جیسے ہی دلبر تیز تیز سانسیں لیتا ہوا پیچھے ہٹا' میں نے اپنی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر حیرت سے کہا۔

''یہ کیا......؟''

''رکھ لو......! اور یہ ذہن میں رکھ لو' نہ تم نے کچھ دیکھا ہے اور نہ کیا ہے' تم جاؤ اپنے کنویں پر اور جا کر بکرا ذبح کرو' میں آ تا ہوں۔''

اس نے بڑے سکون سے وہ گڈی پکڑی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان لاشوں کو اتار کر نیچے پھینکا۔ پھر ہماری بائیک چھوڑ کر وہ چلے گئے۔ تبھی میں نے چھاکے سے کہا۔

''یہی وقت سب سے خطرناک ہے' رندھاوا یہیں کہیں پاس ہے اپنی نفری لے کر...... کہیں ان کے ساتھ ہم بھی...... سمجھ گئے نا......''

''تم فکر نہ کرو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور پھر جیسے ہی میں بیٹھا' اس نے ایک طرف کا رخ متعین کرتے ہوئے بائیک ہوا کر دی۔

ہمارے کپڑے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ ہم اس حالت میں گاؤں نہیں جا سکتے تھے۔ ہمیں ان

کپڑوں سے جان چھڑانا تھی۔ میرے ذہن میں یہ پہلو اچھی طرح موجود تھا کہ ہمارے ہاں جہاں سراغ لگانے والے کھوجی ہوتے ہیں، وہاں کھوج لگانے کا کام کتوں سے بھی لیا جاتا تھا۔ میں اس کھوج کو رستے ہی میں ختم کر دینا چاہتا تھا کہ اگر کوئی کوشش بھی کرے تو مجھ تک نہ پہنچ پائے۔ حالانکہ میں خود انہیں یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ یہ سب میں نے ہی کیا ہے۔ اب جبکہ آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہی ہو چکا تھا تو کیوں نہ میں اسے چوہے بلی کا کھیل بنا دوں۔ میں نے بھیرے کو ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر انتظار کرنے کے لیے کہا ہوا تھا۔ سو میں نے چھاکے کو کہہ دیا کہ وہ ادھر جائے، جلد ہی ہم نہر کنارے جا پہنچے۔ ذرا فاصلے پر ایک برجی کے پاس بھیرہ بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ وہ وہاں یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے پانی لگانے کے لیے وقت کے انتظار میں ہو۔ اس کے پاس ایک لاٹھی، لالٹین اور کسی تھی۔ میں اس کے قریب جا کر رک گیا۔ پھر بغیر کچھ کہے اپنے کپڑے اتار کر ایک طرف پھینک دیئے اور نہر میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے خود کو مل کر صاف کیا، جب یہ یقین ہو گیا کہ میرے کسی جگہ خون نہیں لگا تو باہر آ گیا۔ بھیرہ میرے کپڑے لیے کھڑا تھا۔ میں نے اپنے کپڑے پہنے تو چھاکا بھی نہا کر نکل آیا۔ وہ بھی کپڑے پہن چکا تو بھیرے نے جلدی سے بائیک کو پانی مارا، چھاکے نے لالٹین کا تیل ان کپڑوں پر ڈالا اور انہیں جلا دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ جل کر خاک ہو گئے جسے نہر میں بہا دیا گیا۔

"بھیرے...... چل تو اب واپس ڈیرے پر جا......"

میں نے اتنا کہا اور جواب سنے بنا آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ اب گاؤں کی طرف تھا اور میں نے گھوم کر جانا تھا۔ راستے میں شہر کو جانے والی پکی سڑک آتا تھی، پھر سردار شاہ دین کی حویلی اور گاؤں کا کنارا، مجھے امید تھی کہ جب تک میں نے وہاں پہنچنا تھا، حویلی میں ہلچل ہو چکی ہو گی یا پھر صبح ہی پتہ چلنا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ ہو جانا تھا۔

میں اور چھاکا ایک ہی بائیک پر تھے۔ حویلی کے سامنے پہنچ کر میں نے رفتار جان بوجھ کر آہستہ کر لی۔ مجھے لگا کہ وہاں پر کوئی ہلچل نہیں ہے، ماحول بالکل پرسکون ہے۔ میں نے رکنا مناسب نہیں سمجھا اور آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ گاؤں کی گلیوں میں بھی وہی سنسان پن تھا جو معمول کے مطابق ہوتا ہے۔ میں نے بائیک اپنی گلی کی جانب موڑ لی۔

ماں جیسے میرے انتظار میں ہی تھی۔ جب تک میں نے صحن میں بائیک کھڑی کی، اس وقت تک چھاکا، باہر والے کمرے میں ہتھیار رکھ آیا۔ ماں کچن میں چلی گئی اور میں اندر کمرے میں جا کر سکون سے لیٹ گیا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو گیا ہو گا، رندھاوا نے کیا کیا، دلبر واپس کنویں پر پہنچا تھا یا نہیں اور خاص طور پر سردار شاہ دین کو ڈیرے پر ہونے والے واقعہ کی اطلاع ملی یا نہیں۔ ان سب سوالوں کے جواب میرے پاس نہیں تھے۔ ویسے بھی شام سے مسلسل بھاگ رہا تھا۔ جس کے باعث تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے دماغ سے سب کچھ نکالا اور صبح نور کے تڑکے کا انتظار کرنے لگا۔

❀......□......□......❀

جس وقت جسپال نے جالندھر شہر کے ماڈل ٹاؤن والے پل سے نیچے جیپ اتاری تو ہرپریت نے دائیں جانب مڑنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں غور سے راستہ دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں سر شام ہی جالندھر پہنچ چکے تھے اور اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ ارد گرد کی روشنیوں سے راستہ روشن تھا۔ جسپال نے نیلی جین اور بلیک ٹی شرٹ کے ساتھ جوگر پہنے ہوئے تھے اور

سر پر سیاہ رنگ کی پگڑی تھی۔ جبکہ ہرپریت نے وہی دوپہر والا لباس زیب تن کیا ہوا تھا، اس نے اپنے گیسو سنوار کر باندھ لیے تھے۔ بس تبدیلی یہی تھی کہ اس کے پاؤں میں بھی گہرے رنگ کے جوگر تھے۔ اس سڑک پر تھوڑا سا چلنے کے بعد دائیں ہاتھ پر گردوارہ تھا، جسے دیکھتے ہی جسپال نے کہا۔

"اب ہمیں اس ڈائریکشن میں آگے جانا ہے، کیا تم ٹھیک طرح سے وہاں تک پہنچ جاؤ گی؟"

"تم فکر نہ کرو جسی جی، میں نے اس شہر میں پڑھا ہے اور میرا کالج اس علاقے میں تھا، یہاں تک فقط دس منٹ کے فاصلے پر وہ جگہ ہے جہاں ہمیں جانا ہو گا، بس پارک سے اگلی والی دائیں گلی میں مڑ جانا۔" ہرپریت نے عام سے لہجے میں کہا تو وہ مطمئن ہو کر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ ہرپریت اسے دائیں بائیں مڑنے کا کہتی رہی اور وہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بولی۔ "جسی......! وہ دیکھو......! وہ سامنے گھر ہے، اب تم دیکھ لو اپنے حساب سے کہ پارکنگ کہاں کرنی ہے؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تبھی ایک کار اسے کراس کرتے ہوئے آگے جا کر بائیں طرف کا اشارہ دے کر آہستہ ہو گئی۔ وہ بھی آہستہ ہو گیا۔ آگے والی کار رک گئی تو جسپال نے بھی جیپ روک دی اور انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ ہرپریت نے جس عمارت کی نشاندہی کی تھی، وہ اس سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھے۔ کار سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان برآمد ہوا۔ اس نے بلیک ڈریس پتلون کے ساتھ سفید چیک دار شرٹ پہن رکھی تھی۔

وہ بڑے اعتماد سے جیپ کی ڈرائیونگ سائیڈ کی طرف آیا، تب تک جسپال نے شیشہ اتار لیا۔

"جوگی ہوں جسپال جی۔"

"اوہ...... تم ہو......" اس نے جواب دیا اور پھر ہاتھ ملایا۔

"یہاں صرف دو لوگ ہیں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ ان میں من راج ہے کہ نہیں، باقی سیکیورٹی کے نام پر صرف دو بندے ہیں انہیں قابو میں کرنا کچھ اتنا مشکل نہیں ہو گا۔" جوگی نام کے اس نوجوان نے آہستگی سے عام سے انداز میں کہا۔

"اور کتنے لوگ ہیں؟" جسپال نے پوچھا۔

"ممکن ہے دو چار ملازم ہوں...... مزید...... میں نے شام ہی کے وقت جائزہ لے لیا تھا۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"ٹھیک ہے ڈن......" جسپال نے کہا۔

"ڈن...... پلان میں نے آپ کو بتا دیا تھا۔" اس نے کہا اور پلٹ گیا۔ جسپال نے وہیں گاڑی کو موڑا اور پھر سڑک کی سائیڈ پر لگا دیا۔ پھر اپنا پسٹل نکال کر دیکھا، میگزین رکھے تو ہرپریت نے بھی ڈیش بورڈ سے پسٹل نکال لیا، تبھی جسپال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دروازہ کھلا چھوڑ کے نیچے اتر آؤ۔"

"جسپال......!" ہرپریت نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا جس میں جذبات کھنک رہے تھے۔ "پتہ نہیں ہم زندگی کے ساتھ لوٹ بھی سکیں گے یا نہیں سو......" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ اس نے ہرپریت کو نہ صرف گلے لگا لیا، بلکہ اس کے ہونٹوں پر پیار کی مہر بھی ثبت کر دی۔ یہ سب چند لمحوں میں ہوا۔ کیونکہ سامنے کی تیز روشنی میں وہ نہا گئے تھے۔ کسی گاڑی نے ان کے قریب سے ٹرن لیا تھا۔ وہ ایک دم ہنس دیئے اور پھر جیپ سے نیچے اتر آئے۔ انہوں نے دیکھا، جوگی کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی دھیرے دھیرے جا رہا تھا۔ وہ بھی یوں چل پڑے جیسے باہر واک پر نکلے ہوں۔ وہ دونوں نوجوان اس عمارت کے گیٹ

تک پہنچ چکے تھے۔ جس وقت یہ گیٹ کے سامنے پہنچے ایک سیکیورٹی گارڈ سے جوگی اندر من راج کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"صاحب تو اس وقت سو گئے ہیں' آپ کو اس وقت کیا کام پڑ گیا۔"

"کوئی ضروری کام ہے تو اس وقت آئے ہیں۔ تم انہیں اطلاع دو۔"

"آپ انہیں فون کرلیں گے صاحب اور میری بات کروادیں پھر میں......" لفظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ کہ جوگی نے اسے اندر کی جانب دھکا دیا۔ سیکیورٹی گارڈ کو شاید امید نہیں تھی کہ کوئی یوں انہیں دھکیل دے گا۔ اس لیے وہ لڑکھڑا گیا۔ اس سے پہلے وہ سنبھلتا اور اپنی گن سیدھی کرتا' اس کے ساتھ والے نوجوان نے اس کا گلا دبایا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پسٹل اس کے سر پر دے مارا۔ وہ دونوں وہیں سیکیورٹی گارڈ کو ہٹا رہے تھے جبکہ جسپال اندر داخل ہوگیا۔ پورچ چند قدم پر تھا' وہ دونوں تیزی سے اندر چلے گئے۔ توقع کے مطابق دروازہ لاک تھا۔ جسپال نے جیب سے ایک تار نکالی اور لاک سے قسمت آزمائی کرنے لگا۔ جبکہ ہرپریت نے وہاں کی روشنیاں بجھادیں۔ اب وہ اندھیرے میں تھے۔ لاک کھلنے میں چند منٹ لگے تھے۔ سامنے راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔ دائیں بائیں کمروں میں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ جسپال نے رک کر کسی آواز کو سننے کی کوشش کی۔ تبھی انہیں ہلکی ہلکی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی بہت دور سے بات کررہا ہو' آواز تو آرہی تھی لیکن لفظوں کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اچانک ہرپریت نے اوپر کی جانب اشارہ کیا۔ جسپال نے سر ہلایا اور آگے چل پڑا۔

ڈرائنگ روم میں سے سیڑھیاں اوپر کی طرف جارہی تھیں۔ وہ دونوں آگے پیچھے محتاط انداز میں اوپر چڑھتے چلے گئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ متوقع آواز سننے کے لیے ساکت ہوگئے۔ مگر وہاں بالکل خاموشی تھی۔ جسپال نے اپنے اعصاب کو مضبوط کیا اور خود پر چھاجانے والی جھنجلاہٹ کو دور بھگادیا۔ وہ سانس روکے کسی آہٹ کا منتظر تھا' تبھی ایک کمرے سے قہقہہ لگنے کی آواز سنائی دی۔ مردانہ قہقہے کے ساتھ نسوانی قہقہہ بھی شامل تھا۔ ہرپریت اور جسپال نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اس دروازے تک جاپہنچے۔ جسپال نے کی ہول سے اندر جھانک کر دیکھا' پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔

"بے غیرت......" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ پھر اس نے دروازے کو چیک کیا وہ لاک نہیں تھا' اور نہ ہی اندر سے بند تھا۔ جسپال نے سانس روکا' پھر طویل سانس لی اور ایک دم سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

من راج فقط ایک جانگیے میں بیڈ پر پڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک لڑکی برہنہ حالت میں موجود تھی۔ اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو حواس باختہ ہوا پھر زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"مجھے نہیں لگتا تھا کہ تم اتنی جلدی کھل کر میرے سامنے آجاؤ گے۔ خیر...... اب آہی گئے ہو تو سکون سے خود کو میرے حوالے کردو......"

"دوسرا کہاں ہے......؟" جسپال نے سرد لہجے میں کہا۔ اس نے من راج کی بات بالکل نظر انداز کردی تھی۔ تبھی من راج نے اس کے پیچھے دیکھا اور بولا۔

"تمہارے پیچھے!"

"یہ حربہ بہت پرانا ہوچکا ہے من راج...... مجھے تو تم کسی خفیہ کے نہیں' کرائے کے ٹٹو لگتے ہو۔ کھڑے ہوجاؤ۔" جسپال سنگھ نے کہا تو وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔

لاشعوری طور پر اس نے چپل پہننے کی کوشش کی' تو اس اثنا میں اس کا ہاتھ تکیے کے نیچے سرک گیا۔ جسپال اس کے لیے پوری طرح تیار تھا' ایک لمحے سے بھی کم وقت میں وہ اس کے سر پر جا پہنچا اور اپنی کہنی اس کی گردن کی پشت پر ماری' وہ ڈکارتا ہوا زمین پر جاگرا۔ تبھی اس لڑکی نے جسپال کو پیچھے سے پکڑنے کی کوشش کی' تب تک ہرپریت کمرے میں آچکی تھی اور اس نے گھما کر لات اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ اوخ کی آواز نکالتی ہوئی بیڈ پر گری اور پھر بیڈ سے نیچے جاگری۔ اس دوران جسپال نے زمین پر اوندھے منہ گرے من راج کی پیٹھ پر لات ماری پھر اس کی پشت پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے گردن دبادی۔ من راج مچھلی کی مانند تڑپنے لگا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے یہاں تک کہ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ دوسری طرف لڑکی اپنا پیٹ دبائے زمین پر پڑی تھی۔

"اسے جلدی سے باندھو۔" جسپال نے ہرپریت سے کہا تو وہ اس کے قریب پڑے ہوئے اس کے کپڑوں سے لڑکی کو باندھ دیا۔ من راج ساکت پڑا ہوا تھا۔ اس پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"یہ......"

"ختم ہوگیا۔ اب اس لڑکی سے پوچھو دوسرا کہاں ہے؟"

"سنا تم نے۔" یہ کہتے ہوئے ہرپریت نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"اس سے کیا پوچھتے ہو' میں بتاتا ہوں۔" دروازے کی جانب سے آواز آئی تو دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ ایک سکھ ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا اور صحت مند تھا۔ "یہ من راج بھی نہ...... لڑکی دیکھتے ہی پاگل ہوجاتا ہے۔ میں نے کہا تھا اس سے کہ تمہاری یہی کمزوری تجھے لے ڈوبے گی' وہی ہوا...... غفلت کا فائدہ اٹھایا تم لوگوں نے...... پڑی رہنے دو اس لڑکی کو وہیں پر۔ دونوں اپنے اپنے ہتھیار پھینک کر وہیں زمین پر لیٹ جاؤ۔"

"میں ایسا نہیں کروں گا...... تم گولی چلاؤ......" جسپال نے سرد لہجے میں کہا تو ایک لمحے کے لیے سکھ نوواردکے چہرے پر مسکراہٹ آگئی پھر وہ بولا۔

"میں دلیر لوگوں کی قدر کرتا ہوں' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں دلیر دشمن کو بھی چھوڑ دوں۔"

"ہونہہ دلیر......!" ہرپریت نے طنزیہ انداز میں کہا تو سکھ نووارد نے اس کی طرف دیکھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس سے جسپال نے فائدہ اٹھایا' اس نے جھکائی دی' اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا وہ چشم زدن میں یوں پھسلتا ہوا اس کے قریب گیا کہ اپنی لات گھما کر اس کے گھٹنے پر دے ماری۔ وہ لڑکھڑایا اور آگے کی طرف گرا۔ ہرپریت ہوا میں اچھلتی ہوئی اس پر آپڑی۔ لمحوں میں دونوں نے اس کی درگت بنادی۔

"زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔" ہرپریت نے جسپال کو احساس دلایا جو سکھ نووارد کی دھلائی میں مگن تھا۔ تبھی وہ اس پر چڑھ بیٹھا' پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے سر کو زور سے جھٹکا دیا تو نیچے پڑا وہ شخص ایک لمحے کے لیے تڑپا اور پھر ساکت ہوگیا۔ جسپال نے اٹھ کر اس برہنہ لڑکی کو دیکھا جو اوندھے منہ پڑی دہشت سے کانپ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا' تبھی وہ گھگھیائے ہوئے بولی۔

"مجھے کچھ نہ کہنا...... میں ان کی ساتھی نہیں ہوں' میں تو......"

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے اور جسپال نے اس کی گردن اپنے پنجوں میں دبوچ لی۔ پھر اس وقت چھوڑا جب وہ دنیا چھوڑ گئی۔

"نکلو......!" جسپال نے اٹھتے ہوئے کہا اور وہاں سے یوں نکلے جیسے وہ لوگ دوبارہ زندہ ہو کر ان پر حملہ

آ ور ہو جائیں گے۔

دونوں پورچ میں آ کر رک گئے۔ انہوں نے بڑے دھیان سے باہر کا جائزہ لیا۔ شاید جوگی اور اس کا ساتھی ان کے انتظار میں تھے۔ دونوں ہی سائیڈ روم سے باہر آ گئے اور پھر باہر نکلتے چلے گئے۔ جسپال کے لیے راستہ صاف تھا۔ وہ تیزی سے نکلا اور گیٹ تک پہنچا۔ باہر پرسکون ماحول تھا۔ جوگی ان سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی اپنی گاڑی کے پاس تھا۔ جسپال اس کے قریب گیا تو وہ بولا۔

''دو چوکیدار تھے...... بے ہوش ہیں۔ انہیں آپ کی آمد کی خبر نہیں ہوئی۔''

''او کے......! اب باقیوں کا پتہ کرو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جین کی جیب میں ہاتھ ڈالا پھر ہاتھ باہر نکالا تو اس میں سونے کا ایک بسکٹ تھا۔ ''یہ رکھو' ضرورت ہوتی ہے۔''

جوگی نے وہ پکڑا اور کار میں بیٹھ گیا۔ ہرپریت اپنی جیپ میں جا کر بیٹھ چکی تھی۔ اس لیے جیسے ہی جسپال بیٹھا' اس نے جیپ بڑھا دی۔ ان کا رخ اب اوگی گاؤں کی طرف تھا۔

جالندھر سے نکلنے تک وہ دونوں خاموش تھے۔ پھر جیسے ہی وہ رسول پور کلاں کے قریب سے گزر رہے تھے تب ہرپریت نے جیپ کے اندر کی خاموشی کو توڑا۔

''کافی اچھے فائٹر لگتے ہو۔''

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو یا اپنی رائے دے رہی ہو۔'' جسپال نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے' اپنی رائے دے رہی ہوں۔''

''بہت شکریہ۔'' وہ اختصار سے بولا تو اس نے کہا۔

''میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''تم...... بہت خوب صورت ہو' تمہارے حسن میں......'' اس نے لہجے کو رومانوی بناتے ہوئے کہا۔

''نائیں جسی جی...... میرے حسن کے بارے میں نہیں' میری فائٹ کے بارے میں......'' وہ ٹوکتے ہوئے بولی۔

''او...... ٹھیک ہے' لیکن ایک بات ہے' جب انسان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہو تو صورت حال مختلف ہوتی ہے' پھر نہ فائٹ دیکھی جاتی ہے' اور نہ فائٹر...... بس پھر مدمقابل کو ختم کرنے کا سوچا جاتا ہے۔'' جسپال نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''یہ میرا دل رکھنے کو کہہ رہے ہو نا' کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میں اچھی فائٹر نہیں ہوں' مجھے سیکھنے کا اتنا زیادہ موقع نہیں ملا۔''

''یہ ٹھیک کہا تم نے...... دراصل اسٹریٹ فائٹر' پروفیشنل فائٹر اور سیکورٹی فائٹر میں جتنا فرق ہے اتنا ایک مجرم اپنی الگ ذہنیت سے لڑتا ہے۔ اس کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔'' جسپال نے سنجیدگی سے کہا تو اس نے چند لمحے سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا تم مجھے سکھاؤ گے...... میں......''

''نہیں......! میں تجھے نہیں سکھاؤں گا۔''

''کیوں......!'' وہ حیرت' دکھ اور استعجاب سے بولی تو جسپال نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ ایسے ملائی جیسے بدن والی لڑکی لڑتے ہوئے اچھی نہیں لگتی۔ اسے تو بس ملائمت سے چھونے کو دل چاہتا ہے' تیرے اتنے خوب صورت چہرے پر اگر ایک خراش بھی آ گئی تو سمجھو حسن گھٹ گیا اور میں تجھے اتنی ہی خوب صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''بالکل......! اگر وہ چڑیل تیرے سر پر کچھ مار دیتی اور وہ دونوں تمہیں......'' اس نے چڑ کر کہنا چاہا تو جسپال ہنس دیا۔ مگر وہ خاموش نہیں ہوئی۔ ''تم ہنس رہے ہو' تم یہ شاعری کر کے بات کو گول مت کرو' بلکہ سیدھے کہہ دو کہ تم مجھے اس لائق ہی نہیں سمجھتے' کاش میں نے یونیورسٹی کے دنوں میں پوری توجہ سے سیکھ لیا ہوتا۔''

اس نے کہا تو جسپال سنگھ نے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔

''کوئی لڑکی اتنی جلدی سے میرے دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکی' جتنی جلدی تم نے بنائی ہے' میرے دل کی سب سے بڑی خوشی یہ ہوگی کہ تم میرے ہر وقت قریب رہو۔''

''میں کون سا دور رہنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور پھر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ وہ اندر سے پگھلنے لگ گئی تھی۔ جسے جسپال نے پوری طرح محسوس کر لیا تو بولا۔

''ہرپریت......! فائٹر یونہی نہیں بن جاتا' اس کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے' میں تجھے بہت کچھ سکھا دوں گا' لیکن تم ہر حالت میں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو......''

''میں تمہاری ہوں جسی......!'' اس نے کہا تو ایسے لمحات میں چلتی ہوئی جیپ اچانک لڑکھڑا گئی جس پر فوراً ہی ہرپریت نے قابو پا لیا اور بریک لگا دیئے۔ تبھی وہ دونوں ہنس دیئے۔

''لاؤ...... گاڑی میں چلاتا ہوں۔'' جسپال نے کہا تو ہرپریت اتر کر دوسری طرف سے سوار ہو گئی۔ جسپال نے جیپ آگے بڑھائی تو ہرپریت نے اس کے کاندھے پر اپنا سر رکھ لیا۔ وہ سہانے سپنوں میں کھو جانا چاہتی تھی۔ لیکن تلخ حقیقت اس کے خوابوں کو زہر آلود کیے ہوئے تھی۔

انہی لمحات میں اس نے جسپال کا ہر طرح کے حالات میں ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

❀......□......□......❀

صبح کی سحر انگیزی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ مشرق سے طلوع آفتاب کے آثار واضح ہونے کو تھے۔ جب میں اپنی بائیک نکال کر گھر سے نکلا' میں اپنے معمول کے مطابق ڈیرے کی طرف نکل پڑا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہیں پر جا کر سو جاؤں کیونکہ رات بھر مجھے اور چھاکے کو نیند نہیں آئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک ہم چھت پر جا کر باتیں کرتے رہے تھے پھر میں وہیں چارپائی گھسیٹ کر لیٹ گیا جبکہ وہ باہر والے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں نے جا کر اسے دیکھا تھا' وہ وہاں نہیں تھا۔ میرے چھت پر سے نیچے اترنے سے پہلے ہی وہ چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے من میں تجسس تھا کہ جو کچھ بھی ہم نے رات کیا اس کا ردعمل کیا ہوا؟ سردار شاہ دین کے ڈیرے پر نہ صرف فائرنگ ہوئی تھی' بلکہ وہاں سے بندے اغوا کر لیے گئے تھے' جن کی لاشیں دور ویرانے میں پائی گئی تھیں۔ اصل سوال یہ تھا کہ کیا سردار شاہ دین انہیں کسی بھی صورت میں قبول کرتا ہے؟ یا پھر انجان بن جاتا ہے؟ وہ ملک سجاد کو کیا جواب دے گا؟ ملک سجاد کا ردعمل کیا ہوگا۔ وہ انتقام لینے کے لیے مزید طاقت استعمال کرے گا یا پھر خوف زدہ ہو کر خاموش ہو جائے گا؟ پیرزادہ کے بندے مارے گئے تھے۔ اس کا ردعمل کیا تھا؟ اور رندھاوا اس نے سارے کھیل کا کیا کیا تھا' جس کی بساط میں نے بچھا دی تھی۔ کیا دلبر اور ساتھی وہیں کنویں پر ہوں گے یا پھر کہیں ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے؟ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دلبر کے کنویں کی طرف سے ہو کر جاؤں مگر اس میں کافی حد تک رسک تھا۔ یا میرے معمول کے خلاف تھا' میں کم از

کم اپنی طرف سے کوئی شک چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں غلطاں گھر سے نکل کر چوک میں پہنچا تو کافی سارے لوگ جمع تھے۔ میں نے بھی ان کے قریب جا کر بائیک روک دی اور اونچی آواز میں پوچھا۔

''اوئے سب خیر تو ہے نا' یہ تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟''

''اوئے جمالے......! تجھے نہیں پتہ۔ یہاں تو پورے علاقے میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔'' ایک جوشیلے نوجوان نے تیزی سے کہا تو میں نے اپنے اندر کا تجسس دباتے ہوئے بے پروائی سے پوچھا۔

''کیا زلزلہ آ گیا تھا رات......؟''

''اوئے' تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے' ادھر نو بندے ایک ہی رات میں قتل ہو گئے ہیں۔'' اس نے دیدے پھیلا کر یوں کہا جیسے مجھے ڈرا دینے کو ہو۔

''نو بندے......؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔ ''اتنے بندے کس نے مار دیئے......؟''

''یہ نہیں پتہ چلا۔ ان سب کی لاشیں تھانے میں ہیں۔ رات پولیس بھی ادھر پہنچ گئی تھی۔'' ایک دوسرے بندے نے مجھے معلومات دیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے' پر اتنی جلدی پولیس وہاں کیسے پہنچ گئی' اور وہ بندے کون تھے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے بتایا۔

''تین بندے تو پیرزادے کے تھے' اس کے گاؤں کی ساتھ والی بستی میراں شاہ میں رہتے تھے۔ باقی چھ کا پتہ نہیں چلا' وہ کوئی باہر کے تھے۔ سنا ہے وہ سارا دن اس علاقے میں پھرتے رہے ہیں۔''

''تھانے سے کچھ پتہ چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی' وہاں سے کوئی آئے گا تو معلوم ہوگا۔'' اس نے جواب میں کہا تو میں نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''لو بھئی' ہم تو اپنا کام کریں' پتہ چل ہی جائے گا۔''

میں انہیں وہیں باتیں کرتا چھوڑ کر ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ میں جیسے ہی ڈیرے والی کچی سڑک پر مڑا مجھے ڈیرے کے باہر کھڑی شاہ زیب کی سفید کار دکھائی دی۔ اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ سردار شاہ دین کو پتہ چل گیا ہے۔ میرے لیے یہ لمحات کسی امتحان سے کم نہیں تھے۔ میں اگر یہیں سے واپس مڑتا ہوں تو جو تھوڑا بہت شک تھا' وہ یقین میں بدل جاتا اور آگے جاتا ہوں تو پتہ نہیں میرے لیے وہاں کون استقبال کرنے کے لیے کھڑا ہوگا۔ اس قدر بے یقینی حالات میں شاہ زیب اکیلا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور پھر کسی بھی خطرے کی پروا کرتے ہوئے بائیک نہ روکی' بلکہ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بائیک اس کار کے برابر جا روکی۔

میں ہاتھ میں دودھ کا برتن لیے گیٹ کے اندر گیا تو شاہ زیب برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کافی حد تک حیرت سے پوچھا۔

''شاہ زیب تم' اس وقت؟''

''تھانے جانا ہے' چلو گے میرے ساتھ۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں' ضرور چلوں گا تم کوئی بندہ میرے گھر بھیج دیتے' میں تھوڑا تیار ہو جاتا' ایسی حالت میں......'' میں نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''یہ نہیں پوچھو گے کہ کیوں جانا ہے؟'' اس نے آہستگی سے پوچھا۔

''تھانے کوئی بندہ خیریت سے نہیں جاتا اور ایسے بے وقت...... پھر میں راستے میں سن کر آیا ہوں کہ

نو بندے قتل ہو گئے ہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''ہاں' اس سلسلے میں جانا ہے' چلو گے۔'' اس نے پوچھا۔

''کہہ تو رہا ہوں' چلو۔'' میں نے جواباً تیزی سے کہا۔

''آؤ پھر میری گاڑی میں چلتے ہیں۔'' اس نے یوں کہا جیسے میرا ردعمل دیکھنا چاہ رہا ہو۔

''چل۔'' میں نے اس سے پہلے قدم بڑھا دیئے۔ گیٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے بھیرے کو دودھ گھر پہنچا دینے کا کہا اور اس سے پہلے گیٹ سے باہر تھا۔ ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ ہی کار میں بیٹھے اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم تھانے کی جانب چل دیئے۔

میرے ذہن میں فقط ایک ہی بات گونج رہی تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ سردار شاہ دین کو اس کارروائی کے بارے میں مجھ پر شک نہ ہو۔ اسے پورا یقین ہوگا' شاید وہ کسی عملی کارروائی سے پہلے اعصاب کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اپنے یقین کو پختہ کر رہا تھا یا پھر مجھے کہیں لے جا کر' تشدد کر کے' یہ سب اگلوانے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ اب جو کچھ بھی تھا' میں ایک قدم بھی پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ عملی طور پر میں نے سرداروں سے ٹکر لے لی تھی۔ گویا خود کو آگ میں جھونک دیا تھا۔ اب جو ہوگا' وہ دیکھا جائے گا۔ میں کسی بھی غیر متوقع صورت حال کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔ میں اعصاب مضبوط کیے اس کے ساتھ والی پسنجر سیٹ پر بیٹھا رہا۔ شاہ زیب نے کوئی بات نہیں کی۔ بلکہ انتہائی سنجیدگی سے ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔ جب اس نے کوئی بات نہیں کی تو مجھے بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم گاؤں کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور قصبے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں مجھے انتہائی درجے کا محتاط ہونا تھا۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔

مگر......! کچھ نہ ہوا۔ تھانے کا گیٹ آ گیا اور وہ اپنی کار سمیت اندر چلا گیا۔ افضل رندھاوا اپنے کمرے میں تھا۔ ہم کار سے نکل کر اس جانب بڑھ گئے۔ اس کے کمرے میں جب ہم داخل ہوئے تو ایک نگاہ ہم پر ڈال کر وہ کاغذات میں الجھ گیا۔ ہم چند لمحے کھڑے رہے تو شاہ زیب نے کہا۔

''بہت مصروف ہو رندھاوا صاحب۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں' یار بہت۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ کاغذوں میں الجھ گیا۔ شاہ زیب نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا' اور طنزیہ انداز میں کہا۔

''تجھے کس نے کہا ہے کہ میرے آفس میں' کرسی پر بغیر اجازت کے بیٹھ جاؤ۔''

''یہ میرے ساتھ آیا ہے اور میں نے اسے کہا ہے۔'' شاہ زیب نے تیز انداز میں کہا تو وہ بولا۔

''یہ آپ کے ساتھ نہ آیا ہوتا تو میں اسے ابھی اس کمرے سے دھکے دے کر نکال دیتا۔ اس کی اتنی حیثیت ہے کہ یہ میرے سامنے بیٹھ سکے۔''

''لیکن اتنی ہمت ہے انسپکٹر کہ میں نے تمہاری ''پھمری'' گھما دی تھی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا تو شاہ زیب نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''او چھوڑو یار۔ میں کس مقصد کے لیے آیا ہوں اور تم لوگ کیا بات لے کر بیٹھ گئے ہو۔''

''آپ بولو' کیا بات ہے؟'' رندھاوا نے غصے میں کہا تو اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''لاشیں کہاں ہیں؟''

''شہر بھجوا دی ہیں پوسٹ مارٹم کے لیے...... ان میں سے دو کی شناخت ابھی نہیں ہو سکی۔'' اس نے عام

سے لہجے میں کہا۔ پھر چند لمحے رک کر اس نے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔ "باقی آپ بتائیں گے شناخت کرلیں گے انہیں؟"

"جب باقی شناخت کرلیے گئے ہیں تو ان دو کی شناخت کا کیا مسئلہ ہے؟" شاہ زیب نے کہا۔

"اس لیے کہ وہ آپ کے ڈیرے پر تھے۔ وہیں فائرنگ ہوئی ہے مگر لاشیں ڈیرے سے دور ویرانے میں ملی ہیں۔ ان میں سے تین بستی میراں شاہ کے تھے مقامی یہ سب کیا ہے سردار جی۔" آخری لفظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں طنز اتر آیا تھا۔ تبھی شاہ زیب نے اس سے زیادہ طنز اور غصے میں کہا۔

"یہی تو معمہ ہے جسے حل کرنا ہے اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ آپ کو کس نے ان کے متعلق بتایا' آپ کب پہنچے؟ اور کسی سے پوچھ تاچھ کیے بغیر وہاں سے لاشیں بھی اٹھا کرلے آئے......؟"

"ہاں......! یہ سوال تو بنتا ہے لیکن آپ ایسا کریں' چائے پئیں' میں نے پیرزادہ وقاص کو بلوایا ہے' وہ یا ان کا کوئی بندہ یہاں پر آجائے تو بات کرتے ہیں۔ میں فی الحال کاغذ مکمل کرلوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھر سے کاغذوں میں الجھ گیا۔ بلاشبہ وہ ڈرامہ کررہا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے کسی بندے کو چائے کا نہیں کہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیں نظر انداز کررہا ہے۔ شاہ زیب پیچ و تاب کھاتا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پیرزادہ وقاص کی سیاہ جیپ وہاں آرکی۔ وہ اس میں سے نکلا اور سیدھا رندھاوا کے دفتر میں آگیا۔ اس نے ہمیں دیکھا' ہم سب سے مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا تو رندھاوا نے کاغذات ایک طرف کیے اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

"پیرزادہ صاحب! آپ کے تین ملازم قتل ہوگئے۔ میں نے اس سلسلے میں آپ کو بلایا ہے۔"

"ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ ہم اپنی فریاد لے کر تھانے میں نہیں آئے' بلکہ لاشیں اٹھالینے کے بعد ہمیں تھانے میں بلا کر پوچھ رہے ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں' یہ اتنی تیز رفتاری کیوں؟" پیرزادہ وقاص نے کافی حد تک طنزیہ اور غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"ابھی آپ کے آنے سے پہلے شاہ زیب نے بھی ایسا ہی سوال کیا ہے۔ تو آپ دونوں غور سے سن لیں۔ مجھے کل شام اوپر سے احکامات ملے تھے کہ علاقے میں کچھ مشکوک لوگ ہیں' انہیں پکڑ لیں' میرے مخبر بھی اطلاع دے چکے تھے۔ شام ہونے سے پہلے ہی بھاری نفری یہاں بھجوادی گئی۔ غور کریں' میری بات پر' میں نے نہیں منگوائی' بلکہ بھیج دی گئی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کی رسائی کہاں تک ہے کہ میری اس بات کی تصدیق آپ کرسکتے ہیں۔ میں مجبور تھا اور میں نے انہیں پکڑنا ہی تھا' لیکن......" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو شاہ زیب بولا۔

"لیکن کیا؟"

"میں جس وقت انہیں پکڑنے کے لیے ڈیرے کے قریب پہنچا تو وہاں سے کچھ دور فائرنگ ہوئی' میں نے وہ اپنے لیے الجھاوا ہی سمجھا اور ڈیرے پر گیا۔ وہاں آپ کے ملازمین نے بتایا کہ چھت پر فائرنگ ہوئی ہے۔ میں خود چھت پر گیا' وہاں آثار تو ملے مگر بندے نہیں تھے۔ میں نے فوراً علاقہ چھان لینے کا حکم دیا۔ اور یہ ساری لاشیں ایک جگہ سے مل گئیں۔"

"لیکن......" شاہ زیب نے کہنا چاہا مگر رندھاوا نے سختی سے کہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں شاہ زیب! سیدھی سی بات ہے' یہ دونوں گروپ آپس میں لڑ کر مرے ہیں یا پھر انہیں کوئی تیسری پارٹی مار گئی ہے۔ یہ تو خیر' تفتیش سے معلوم ہوجائے گا' آپ لوگوں کو میں نے اس لیے

بلایا ہے کہ جو حقیقت ہے وہ مجھے بتادیں' یا پھر صلاح مشورہ کر کے کوئی فیصلہ مجھے دے دیں' نہیں تو......"

"نہیں تو کیا کریں گے آپ......؟" پیرزادے نے پرسکون انداز میں کہا۔

"میں کوئی دشمن دنیا تو نہیں ہوں' پیرزادہ صاحب' میں نے جو کچھ دیکھا ہے' وہی لکھ دیا ہے' ان کاغذات پر فائلوں کا پیٹ بھرلیا ہے میں نے' دو چار گھنٹے بعد میں نے یہ رپورٹ ڈی ایس پی صاحب کو دے دینی ہے' پھر وہ جانیں اور آپ......" وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ چکا تو پیرزادہ بولا۔

"میری طرف سے ابھی یہ طے کرلیں کہ آپ جو رپورٹ دیں گے وہ بالکل سچ پر مبنی ہونی چاہیے۔ باقی جو تفتیش ہونی ہے' اس کی نگرانی میں کرلوں گا۔ اب مجھے یہ پتہ نہ چلے کہ آپ نے ڈنڈی ماری ہے' اور ان مشکوک بندوں کا یہ ذکر ہی نہ کرو کہ وہ کس کے مہمان تھے۔"

"وقاص......تم غلط سمجھ رہے ہو' سچ وہ نہیں جو تم دیکھ رہے ہو۔" شاہ زیب تیزی سے بولا۔

"نہیں شاہ زیب' نہیں' ایسے نہ کہو' میرے تین ملازم قتل ہوئے ہیں' انہیں چھوڑو' تم لوگوں کے ڈیرے پر اشتہاری پہلے بھی آتے جاتے ہیں' لیکن یہ کون تھے اور علاقے میں کیوں دندناتے پھر رہے تھے۔ مجھے اس سوال کا جواب دو۔"

"یہ بھی انہی اشتہاریوں کی طرح یہاں چند دن رہنے آئے تھے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"تو پھر انہیں بے لگام ہونے کی اجازت کس نے دی؟" پیرزادہ نے پوچھا تو شاہ زیب خاموش رہا۔ پھر تیزی سے بولا۔ "ہم بھی ڈیرے دار ہیں' اور یہ ساری باتیں سمجھتے ہیں۔"

"میں کہہ رہا ہوں نا کہ ہم بات کرتے ہیں' میں تجھے سمجھادوں گا......" اس نے کہنا چاہا لیکن پیرزادہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"بس......! مجھے میرے سوال کا جواب دو یا پھر ان بندوں کے قتل کا حساب دینے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو' مجھے اپنا حساب لینا آتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ تبھی رندھاوا نے اس سے پوچھا۔

"تو پھر کیا کہتے ہیں؟"

"وہی جو میں نے کہا' ہم لوگ زبان رکھتے ہیں اور اپنی زبان کا پاس بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم مردوں والی زبان دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے شاہ زیب کی طرف دیکھا بھی نہیں اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا تو وہاں پر خاموشی چھا گئی۔

"یہ اچھا نہیں ہوا۔" شاہ زیب نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو سوچا تھا کہ آپ دونوں کو بلا کر' کوئی مشورہ کر کے ہی رپورٹ فائنل کروں گا' مگر لگتا ہے' پیرزادہ صاحب کے دماغ میں کچھ اور ہی چل رہا ہے۔"

"جمال' تم کیا کہتے ہو؟" اچانک شاہ زیب نے مجھ سے پوچھا۔

"اس سے کیا پوچھتے ہو آپ' جس بندے کو اپنی خبر نہیں' اگر آپ کا ہاتھ اس پر نہ ہوتا تو اب تک یہ نجانے کس جیل میں پڑا سڑ رہا ہوتا۔" رندھاوا نے انتہائی نفرت سے کہا۔

"رندھاوا صاحب' خیال کریں کہ یہ میرے ساتھ آیا ہے۔" شاہ زیب نے غصے میں کہا۔

"یہی تو کررہا ہوں' ورنہ اب تک اس کے چھتر مار کر تھانے سے بھگا نہ دیا ہوتا۔" اس کا لہجہ ہنوز غصیلا تھا۔ اس وقت تک پیرزادہ اپنی جیپ سمیت وہاں سے چلا گیا تھا۔ تبھی شاہ زیب اٹھا اور بغیر ہاتھ ملائے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے بھی وہاں رکنا مناسب نہیں

سمجھا' میری اور رندھاوا کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے چار ہوئیں تو اس نے خفیف سا اشارہ کیا۔ میں جسے فوراً تو نہ سمجھ سکا لیکن اس پر غور کرنے لگا۔

ہم دونوں کار کے قریب آ گئے تھے۔ شاہ زیب کے چہرے پر انتہائی درجے کی سنجیدگی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا' پھر فوراً ہی لپک کر اندر چلا گیا۔ اس بار وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اندر نہیں گیا تھا۔ وہ نجانے کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لمحے مجھے رندھاوا کے خفیف اشارے کی سمجھ آ گئی۔ میں ٹہلتا ہوا تھانے سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ تبھی میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مجھ سے کچھ فاصلے پر چہرے پر کپڑا لیے چھاکا بائیک پر کھڑا تھا۔ میرا دل اچانک ہی خوشی سے بھر گیا۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا' اور وہیں ٹہلنے لگا' تبھی اندر سے شاہ زیب کی کار نکلی اور میرے قریب روک دی۔ تب میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

''مجھے ذرا یہاں تھوڑا کام ہے' میں وہ کر کے آتا ہوں' تم جاؤ۔''

''ایسا کام اچانک کیا پڑ گیا؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کئی دنوں سے سوچ رہا تھا' مجھے کسی بندے سے ملنا ہے' تم جاؤ' میں آ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا رخ اس طرف کر لیا جدھر چھاکا میری پشت پر تھا۔ شاہ زیب چلا گیا تو میں کچھ دیر مزید وہیں رکا رہا۔ پھر چھاکے کی طرف چل پڑا۔ وہ بائیک اسٹارٹ کر کے میرے پاس آیا۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا تو اس نے بائیک بھگا دی۔ میں ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار ہونے والا تھا۔ یہی اشارہ مجھے رندھاوا نے دیا تھا۔ مجھے میرے سوالوں کا جواب مل گیا تھا' اب میں نے صورت حال کے مطابق اپنا آئندہ لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔

❁……□……□……❁
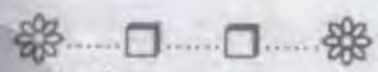
جسپال اپنے کمرے میں تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا' جہاں ہری بھری فصلیں دور تک پھیلی ہوئی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ بظاہر وہ اس مناظر میں کھویا ہوا تھا لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ وہ مسلسل من راج اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں سوچتا چلا جا رہا تھا۔ بلاشبہ ان میں کھلبلی مچ چکی ہو گی۔ اپنے تئیں انہوں نے کوئی سراغ تو نہیں چھوڑا تھا لیکن جلد یا بدیر وہ اس تک پہنچ ضرور جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ رویندر سنگھ یا اس کی اولاد کو اس کی اوگی پنڈ میں آمد کے بارے میں پتہ نہ چلا ہو' یقین اس وقت ہو جانا تھا جب وہ اس تک پہنچ کر اپنا آپ ظاہر کر دیتے۔ جسپال یہی چاہ رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح خود اس کی جانب بڑھیں لیکن اتنی جلدی کوئی موقع ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ اس نے اپنے طور پر تو سوچا ہوا تھا کہ کیا کرنا ہے اور وہ ایسا ہی کرتا اگر یہ پولیس آفیسر والا معاملہ درمیان میں نہ آ جاتا۔ ان چند دنوں میں تو یہاں کے ماحول ہی سے مانوس نہیں ہو پایا تھا۔ اب معاملہ یہ نہیں رہا تھا کہ وہ ان کی طرف سے ''کس'' ''کچھ'' ہونے کا انتظار کرتا' بلکہ خود آگے بڑھنا تھا۔ اس نے شہد کے چھتے میں ہاتھ تو ڈال دیا تھا۔ اب سکون کی امید رکھنا بے کار تھا اور ماحول سے مانوس ہونے کا بہانہ فضول تھا۔ سوچ کی رو جیسے ہی اس طرف گئی' اس کے من سے بڑی خوش کن سی آواز ابھری۔

''کیا واقعی تم اس ماحول سے مانوس نہیں ہوئے؟''

''یہ کیا سوال ہے؟'' اس نے سوچا۔

''یہ حقیقت ہے جسپال سنگھ جسی جی' اگر مانوس نہ ہوتے تو ہرپریت کے سحر انگیز حسن سے یوں مات نہ کھا جاتے' وہ محض حسن کا مجسمہ نہیں' ایک خوب صورت آفت بھی ہے' گزری رات نے ذرا سی جھلک دیکھ لی تھی۔ اب کیا خیال ہے؟''

''ہاں……! وہ پرت در پرت کھلتی چلی جائے گی اور مجھے حیران کر دے گی۔''

یہ سوچتے ہی وہ ان لمحات میں کھو کر لذت محسوس کرنے لگا جب جوش و غصے میں بھری ہرپریت اس کے ساتھ لگی دشمنوں سے نبرد آزما تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ تبھی اسے یوں لگا جیسے ہرپریت نے اس کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کر دی ہوں۔ جسپال نے انہیں بڑی نرمی سے تھام لیا تو اچانک اس پر عیاں ہوا کہ وہ کھلی آنکھوں سے کوئی خواب نہیں دیکھ رہا' بلکہ حقیقت میں وہ اس کے اس قدر قریب ہے' اس کی زلفوں کا سایہ اس پر تھا اور وہ بڑی نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

''جسی جی……! کیا سوچ کر مسکرا رہے ہو؟''

''تمہیں سوچ کر……'' اس نے بڑے خلوص سے کہا۔ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

''میری اتنی کہاں حیثیت کہ مجھے سوچتے ہوئے تم ساری دنیا سے غافل ہو جاؤ' یہاں تک کہ کسی کے کمرے میں آ جانے کا بھی پتہ نہ چلے۔''

''سچی' تجھے سوچ رہا تھا' جس طرح تو نے رات اس لڑکی کو مارا اور پھر……''

''بس……بس…… میں سمجھ رہی تھی کہ تم کوئی رومانٹک خیال سوچ رہے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی اور پھر پوچھا۔ ''پھر کیا سوچا' مجھے فائٹ سکھانے کا۔''

''دیکھو…… بے بے سے اجازت لے کر دے تو…… تمہاری کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تو پھر ان سے مار کون کھائے گا۔'' جسپال نے مزاح میں کہا' تب وہ اسے دیکھتی رہی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''چلو آؤ…… ابھی اجازت لے کر دیتی ہوں' پھر اس کے بعد ہی کھانا کھائیں گے۔ چلو' انوجیت بھی گھر پر ہے۔''

جسپال نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ دونوں ماں بیٹا ڈائننگ ٹیبل پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''ست سری اکال بے بے جی۔'' جسپال نے کہا اور میز کے قریب کرسی پر انوجیت کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''ست سری اکال پتر! واگورو تم پر فضل کرے…… چل پتر پرشاد چکھ لے……'' بے بے نے ممتا بھرے لہجے میں کہا اور اپنے سامنے نیپکن درست کرنے لگی۔ کھانے کے دوران جسپال نے انوجیت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یار……! تم تو اتنے بزی ہو گئے ہو' شکل ہی نہیں دکھاتے۔''

''معاملات ہی کچھ ایسے ہیں' کھانے کے بعد تفصیل سے بتاؤں گا۔'' اس نے گہرے انداز میں کہا اور خاموش ہو گیا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے تو ہرپریت نے بے بے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بے بے جی' آپ جسی کو اجازت دیں کہ یہ مجھے فائٹ سکھائے' میں نے صبح بتایا تھا نا۔''

''تو جان اور تیرے کام' اگر جسی پتر سمجھتا ہے کہ تجھے یہ سیکھنا چاہیے تو ٹھیک ہے' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''ویسے بے بے جی' میں یہی سمجھتا تھا کہ ہرپریت کو اچھا کھانا بنانا آنا چاہیے۔ گھرداری سیکھنی چاہیے لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اپنی حفاظت کے لیے اسے یہ بھی سیکھ ہی لینا چاہیے۔'' جسپال نے کہا تو انوجیت بولا۔

''جسپال……! ابھی تمہیں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں لیکن جس طرح دن گزرتے جائیں گے' اس طرح تم یہ جان جاؤ گے کہ ہم ہی نہیں پوری سکھ قوم حالتِ جنگ میں ہے اور یہ جنگ ہم پر مسلط

کردی گئی ہے۔ ہر امرت دھاری سنگھ قربان ہونے کے لیے ہے۔"

"مجھے احساس ہے انوجیت۔" جسپال نے کہا اور پھر سے کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا پھر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے کھانا ختم کیا اور اٹھ کر باہر لان کی طرف چل دیئے۔ بے بے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ دونوں لان میں آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دھوپ تیز تھی مگر اچھی لگ رہی تھی۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر انوجیت ہی نے کہا۔

"مجھے ہرپریت نے نہیں بتایا، لیکن تمہاری رات کی کارروائی کے بارے میں مجھے معلوم ہوگیا ہے کہیں یہ سب کچھ تم نے جلدی میں تو نہیں کردیا؟"

"نہیں انوجیت۔ جلدی میں نہیں، ٹھیک وقت پر کیا ہے۔ میں نے انہیں صرف یہ احساس دلانا ہے کہ میں یہاں پر اکیلا نہیں ہوں، ان پر خوف طاری کرنا تھا۔ یہ اس صورت میں ہے، جب انہیں یقین ہوجائے کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔"

"تمہارا نیٹ ورک ہے یہاں پر......" اس نے پوچھا۔

"نہیں، میرا نہیں، کسی اور کا ہے......" جسپال نے اختصار سے کہا۔

"پرائے بازوؤں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اپنے بازو......" انوجیت نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"میں جانتا ہوں، کتے کو جب تک روٹی ڈالتے رہو وہ وفادار رہتا ہے اور جب روٹی نہ بھی ڈالو تب بھی وہ وفادار رہتا ہے، یہ جانور کی خصلت ہے، لیکن انسان اس وقت بدتر ہوجاتا ہے جب وہ روٹی بھی کھاتا رہے اور ڈس لے...... سانپ کی یہ خصلت ہے کہ وہ دودھ پلانے والے کو بھی ڈس لیتا ہے۔ یہ نیٹ ورک کوئی دھرم یا کسی مذہب کا نہیں ہے، یہ جرائم پیشہ لوگوں کا ایک سنڈیکیٹ ہے۔ عالمی سطح پر۔"

"اور تم کہیں اس کا حصہ تو نہیں ہو؟" انوجیت نے سرسراتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

"حصہ تو نہیں لیکن اس کے بہت قریب ہوں۔ میری وجہ سے انہوں نے بہت فائدہ حاصل کیا ہے۔ بظاہر ان کی پہلی ترجیح دولت ہے، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ صرف دولت ہی کے لیے ایسا سب کچھ کررہے ہیں۔ ان کی ترجیحات کچھ اور ہیں جنہیں میں بھی اب تک نہیں سمجھ پایا ہوں۔"

"منشیات......" وہ دھیرے سے بولا۔

"نہیں، میں نے اب تک کسی بندے کو نہیں دیکھا کہ وہ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہو یا پھر خود ایسی چیزوں کا عادی ہو۔ میرا اپنا ایک اندازہ ہے کہ وہ صرف طاقت چاہتے ہیں۔ کیوں، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" جسپال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو انوجیت چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

"اس پولیس آفیسر کو ہماری سکھ تنظیم نے ختم کیا ہے۔ جن لڑکوں نے اسے قتل کیا ہے، وہ اب بھی اسی علاقے میں موجود ہیں۔ قتل کا کوئی سراغ ان کے پاس نہیں ہے، سوائے ایک دو نمبروں کے، جس پر اس پولیس آفیسر کو دھمکیاں دی گئی تھیں۔ اس بارے میں وہ لوگ کنفرم نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ نمبر کسی کے ذاتی نہیں، پبلک فون بوتھ سے ہیں۔ جو جالندھر میں ہے۔ خیر......! یہ کنفرم بات ہے کہ وہ ان قاتلوں تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ چاہیں جو مرضی کرلیں۔ وہ بے سہارا لوگ نہیں ہیں، انہیں پورا تحفظ ہے۔ اب یہ جو کمیشن بنا ہے، اس نے کسی کے بھی گلے میں پھندا ڈال دینا ہے۔ رویندر سنگھ نے یہ پھندا تمہارے گلے میں ڈالنا چاہا۔ اسی لیے من راج سنگھ کو ادھر بھیجا پھر جو انہوں نے چاہا، وہی ہوگیا۔"

"مطلب...... وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"میرے خیال میں...... انہوں نے تم پر نگاہ بھی رکھی ہوگی اور تم ہرپریت کے ساتھ......"

"انوجیت مجھے لگتا ہے، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تم ایسے کرو، دو دن تک اپنے کمرے میں رہو، تمہارا فون آف ہونا چاہیے۔ بس آرام کرو۔" جسپال نے گہری سنجیدگی سے کہا تو اس نے پوچھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یار......! اگر ایسی کوئی صورت حال ہوتی نا تو وہ جالندھر والا گھر میرے لیے چوہے دان ثابت ہوتا۔ من راج کسی لڑکی کے ساتھ عیاشی نہیں بلکہ میرے انتظار میں ہوتا۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"لیکن میری اطلاعات غلط نہیں ہوسکتیں؟" اس نے احتجاج کرنے والے انداز میں کہا تو جسپال ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "ہمارے بندے بھی ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ کوئی غلط اطلاع نہیں دیتے۔"

"ٹھیک......! میں مان لیتا ہوں پھر یوں ممکن ہے کہ تمہاری سکھ تنظیم کے لوگ نگاہ میں ہوں گے، میں نہیں...... میں مانتا ہوں اور میں استعمال بھی کرتا ہوں کہ جدید ترین آلات بندے کی لوکیشن کے بارے میں معلوم کرلیتے ہیں۔ میں نے یہ آپشن ذہن میں رکھا ہے۔ اب تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں نے جلدی نہیں، وقت پر انہیں ٹھکانے لگایا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے گرد گھیرا تنگ کریں، میں نے ان کا حصار ہی توڑ دیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں شاید ہی ہماری ضرورت پڑے......؟" انوجیت نے پوچھا۔

"ایک پرانی کہاوت ہے نا، دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے...... اسی طرح دشمن وہ ہوتا ہے جو دھوکے سے وار کرے اور منافق وہ ہوتا ہے جو تمہیں ختم کرنے کے لیے بڑے صبر سے وقت کا انتظار کرے اور موقع ملتے ہی تمہیں ختم کرنے کی کوشش کرے۔ دھوکا وہ بھی دے گا۔ اس لیے اپنے سائے سے بھی چوکنا رہو۔ کیونکہ مصیبت کے وقت ہی دشمن کا، منافقوں کا اور بے غیرتوں کا پتہ چلتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو تم اگر ان کے نیٹ ورک میں اپنے بندے داخل کرسکتے ہو تو کیا وہ تمہاری سکھ تنظیم میں نہیں ہوں گے؟"

"ایسا ممکن ہے......" انوجیت نے سرسراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ جان لو کہ اب کوئی راز، راز نہیں ہے۔ ایک میدان جنگ ہے اور ہم لڑ رہے ہیں۔ جس کا وار چل جائے گا اور یہ ذہن میں رکھنا انوجیت، میری لڑائی کسی دھرم کے لیے نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنا ذاتی انتقام لینا ہے۔ بس......"

"مجھے تمہاری صاف گوئی اچھی لگی میں چاہوں گا اگر تم ضرورت محسوس کرو تو مجھے ضرور کہنا۔" اس نے یاس بھرے لہجے میں کہا۔

"تم اس قدر اجنبیت سے کیوں کہہ رہے ہو میرے دوست...... اصل میں تم میرے ذاتی دوست کی حیثیت سے نہیں ایک سکھ تنظیم کے فرد کی حیثیت سے سوچ رہے ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم دھرم کی سیوا چھوڑ دو، میں کہتا ہوں کرو، ہر مذہبی انسان کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارے۔ لیکن ان قوتوں کا کیا کیا جائے جو یہ بھی نہیں کرنے دیتیں۔ جان لو کہ طاقت ہی بنیادی چیز ہے ورنہ دوسرے تم لوگوں کو کچل کر آگے بڑھ جائیں گے۔ تم ایک سکھ تنظیم

کے فرد ہو تم رہو، لیکن میرے معاملے کو اس سے خلط ملط مت کرو۔"

"تم بھی تو ایک سکھ ہو۔ اگر تمہارے سامنے دھرم کا کوئی معاملہ آجائے تو تم کیا کرو گے؟" اچانک انوجیت نے اس سے پوچھا۔

"یہ تو اس معاملے کی نوعیت پر ہوگا نا میرے یار، میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں، سکھ دھرم میں دستار کی اہمیت اس قدر ہے کہ سر کٹا دیں لیکن دستار کی عزت پر آنچ نہ آنے دیں...... کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"بالکل ایسے ہی ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"اب مجھے یہ بتاؤ، میں کہیں بے بس ہو جاؤں اور وہ لوگ میری دستار اتار کر مٹی میں رول دیں تو کیا مجھے آرام سے سر کٹا دینا چاہیے؟" جسپال نے سکون سے پوچھا۔

"نہیں، جہاں تک ہو سکے، ان کا سر کاٹ دینا چاہیے۔" وہ جوش اور جذبے سے بولا۔

"لیکن اگر میں سر کاٹ لینے کی پوزیشن ہی میں نہیں ہوں، بلکہ بے بس ہوں، تب مجھے کیا کرنا چاہیے، سکون سے اپنا سر ان کے سامنے پیش کر دینا چاہیے کہ میں اپنی دستار کی حفاظت نہیں کر سکا۔" جسپال نے کہا تو انوجیت الجھتے ہوئے بولا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"یہی کہ میں دھرم کے لیے کمزوری کا باعث نہ بنوں، بلکہ اگر میری جان جاتی ہے تو اس سے دھرم مضبوط ہو۔ میں وہ وقت ہی نہ آنے دوں جب کوئی میری دستار کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ میں اپنے ذاتی معاملے کے لیے دھرم کو استعمال نہ کروں اور جہاں تک تمہارا سوال ہے کہ اگر دھرم کا معاملہ میرے سامنے آجائے تو میں کیا کروں گا۔ میں یہ دیکھوں گا کہ دھرم کو فائدہ کیسے ہوگا، جان دے دینے سے یا اس

مہکتی کلیاں

☆ کچھ باتیں اور منظر یادوں کے طوفان میں ان تنکوں جیسے ہوتے ہیں جن کے سہارے دور تک اور دیر تک بہا جا سکتا ہے۔ (اختر عباس)

☆ انسانی زندگی دنیا میں اس شمع کی مانند ہے جو ہوا میں رکھی گئی ہو۔ (بطلیموس)

☆ انسان کے اطوار اس کو گناہ گار نہیں بنا سکتے جب تک اس کا دل گناہ گار نہ ہو۔ (ایمکس)

☆ جھگڑا نہ کرنا کمزوری نہیں بلکہ زندگی کا اعلیٰ اصول ہے۔ (بشریٰ رحمن)

☆ عورت کو خاک کرنے کو ایک بچہ کافی ہے۔ (بشریٰ رحمن)

(سپنا مغل...... فیصل آباد)

معاملے کو نظرانداز کر دینے سے...... یہ جان لو انوجیت کہ طاقت کا غلط استعمال بھی شکست کی طرف لے کر جاتا ہے۔"

"تم تو بڑے سخت قسم کے خیالات رکھتے ہو۔" انوجیت نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہم سکھوں نے اپنی طاقت کا بے جا استعمال کیا ہے اور ہم ابھی تک ایسے معاملات میں الجھے ہوئے ہیں، جسے ہندو ہماری کمزوری بنا کر ہمیں نہ صرف مزید کمزور بنا رہے ہیں بلکہ ظلم در ظلم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، دربار صاحب میں شہیدوں کی یادگار بنانے کا معاملہ ہے، چل رہا ہے نا......"

"ہاں! چل رہا ہے۔" انوجیت نے کہا۔

"انہی شہیدوں کے لیے نا، جو نہتے مارے گئے اندرا حکومت نے اپنی پوری طاقت لگا کر انہیں ختم کیا، اب سکھ کمیونٹی، اپنے ہی مذہبی ادارے میں، اپنے ہی لوگوں کے لیے ایک یادگار بنانا چاہتی ہے، لیکن نہیں

بنا پا رہے، کیوں؟ پنجاب کے سکھ...... پوری دنیا کے سکھ...... اسے کیوں نہیں بنا پا رہے۔"

"کانگریس حکومت نہیں چاہ رہی......" انوجیت نے دھیرے سے کہا۔

"میں یہ پوچھتا ہوں، حکومت روبوٹ چلاتے ہیں یا انسان......؟" جسپال نے جوش سے پوچھا۔

"انسان ہی چلاتے ہیں۔"

"یعنی گوشت پوست کے انسان...... جو منافق ہیں، کیا انہیں کسی شے کا خوف نہیں ہے، سکھ دھرم کے لوگ انہیں اتنا بھی خوف نہیں دے سکتے...... کہ یادگار کے معاملے میں اپنی دشمنی سے باز آجائیں، ایک شخص سنت جرنیل سنگھ بھنڈرا والا تھا، جس نے اندرا حکومت کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ آج اس جیسا ایک بھی بندہ ہوتا تو یادگار کب کی بن چکی ہوتی۔ اب سنو، میں کیا سوچتا ہوں۔"

"کہو......" وہ بولا۔

"یادگار کے لیے میں کسی ایک بھی سکھ کا قتل نہیں چاہتا۔ مطلب، اس کے لیے کوئی تحریک چلے اور سامنے سے گولیاں کھالی جائیں...... یہ بے وقوفی ہے...... بلکہ خود کو ایسا بنا لیا جائے کہ وہ خوف زدہ ہو کر خود کہیں ہم اس راہ میں مزاحمت نہیں کریں گے، جو سکھ قوم چاہے وہی ہوگا۔" جسپال نے کہا تو انوجیت نے پوچھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"دو محاذوں پر لڑنا ہوگا۔ سکھ اتہاس (تاریخ) کے لیے نئی نسل کو بتانا ہوگا، اپنی خامیوں کو دور کر کے طاقت ور قوم بننا ہوگا۔ خصوصاً پنجاب کے سکھوں کو بہت مضبوط ہونا ہوگا۔ دنیا بھر کے سکھ ان کے لیے جان اور مال قربان کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔" جسپال سنگھ نے جوش بھرے لہجے میں کہا تو انوجیت کافی دیر تک خاموش رہا، پھر بولا۔

"میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو، تم جو چاہو سو کرو، میں بہر حال تمہارے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں۔"

"اچھا، چھوڑو ان باتوں کو...... میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ حویلی کے لیے......"

"ہاں......! وہ میں نے ایک ٹھیکیدار سے بات کی تھی۔ وہ آج کل میں آجائے گا۔" انوجیت نے کہا۔

"وہ آ نہیں جائے گا، اسے ابھی بلاؤ، بلکہ اسے کہو کہ چند مزدور وہاں بھیجے، میں آج ہی اس کا کام شروع کراؤں گا۔ اس کا بھی ایک مقصد ہے...... فوراً فون کرو۔"

"میں ابھی کرتا ہوں......" انوجیت نے کہا اور اپنے سیل فون سے رابطہ کرنے لگا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد جسپال سنگھ، انوجیت سنگھ اور ہرپریت کور اپنی جیپ میں گھر سے نکلے۔ ان کا رخ اوگی پنڈ کی طرف تھا۔ ٹھیکیدار سے بات ہو گئی تھی اور مزدور اس حویلی کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ انوجیت ڈرائیونگ کر رہا تھا اور وہ تینوں خاموش تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سڑک پر تھے اور پھر وہ تیزی سے چلتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ جسپال دوسری بار اس گاؤں میں آیا تھا۔ پہلی بار اس کے جذبات میں غصہ، بے بسی اور مات ہو جانے کا احساس تھا، اب ویسا نہیں تھا، بلکہ اس میں ہیجان، انتقام اور بھڑ جانے کا حوصلہ موجود تھا۔ شاید اسی لیے ان میں کوئی بات نہیں ہو رہی تھی، سبھی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔ یہاں تک کہ گاڑی ان کی حویلی کے سامنے جا رکی۔ سامنے ہی کچھ مزدور کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ایک خوش پوش نوجوان سنگھ کھڑا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے انوجیت نے بتا دیا کہ یہی ٹھیکیدار ہے۔

وہ گاڑی سے اتر کر ان کے قریب گئے، ملنے ملانے کے بعد جسپال نے کہا۔

"ٹھیکیدار جی...... آپ نے کام دیکھ لیا؟"

"جی، دیکھ لیا۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کتنے دنوں میں ہوگا یہ کام؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کوئی ایک ہفتہ لگ جائے گا......" اس نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"رقم کی پروا نہیں کرنی۔ سب کچھ آپ نے کرنا ہے۔ بس نیم کے درخت کا خیال رکھنا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بڑے نوٹوں کی دو گڈیاں جیب سے نکالیں اور اس کی طرف بڑھا دیں۔ "یہ رکھیں، مزید کی ضرورت ہوگی تو مل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے جی، میں ابھی سے کام شروع کروا دیتا ہوں۔" ٹھیکیدار نے کہا تو جسپال نے ایک نگاہ حویلی پر ڈالی، جس کی خستہ حالت نے اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو مزید ہوا دے دی۔ اسے خود پر قابو پانے میں چند منٹ لگے۔ اس دوران انوجیت نے ٹھیکیدار سے کہا۔

"تمہیں جو بات پوچھنا ہو، یا کچھ کہنا ہو، مجھ سے رابطہ رکھنا۔"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا۔ تو وہ تینوں اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے واپس پلٹے تبھی ان کے قریب ایک کار آن رکی۔ جس کے رکتے ہی پسنجر سیٹ سے ایک لمبا تڑنگا جوان برآمد ہوا۔ اس نے شلوار قمیص کے ساتھ ویسٹ کوٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر پر گہرے نیلے رنگ کی پگڑی، سیاہ داڑھی مونچھیں اور پاؤں میں سیاہ رنگ کا جوتا پہنا ہوا تھا۔ اس دوران پچھلی نشستوں سے تین باڈی گارڈ اسلحہ لیے برآمد ہوئے۔

"بلجیت سنگھ، رویندر سنگھ کا بیٹا، جو ادھر کا سرپنچ ہے۔" انوجیت نے آہستگی سے جسپال کو بتایا تو اس کے

نگینہ حیات

☆ اپنی شخصیت کو سنوارنے اور زندگی بہتر بنانے میں اتنے مصروف ہو جاؤ کہ دوسروں پر تنقید کرنے کے لیے تمہارے پاس وقت ہی نہ بچے۔

☆ اچھے لوگ، اچھی باتیں، اچھی یادیں اور اچھے خیالات زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

☆ زندگی میں آپ دو ہی اشخاص کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایک دوست اور دوسرا دشمن۔

☆ اگر آپ اپنی زبان سے وعدہ لیں کہ وہ صرف معقول بات کرے گی تو آپ دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ آپ خاموش ہوتے جا رہے ہیں۔

☆ خوشیاں مٹھی میں بند ان رنگین تتلیوں کی طرح ہوتی ہیں جو ہتھیلی کے کھلتے ہی راستہ بدل لیتی ہیں۔

(عاصمہ گیلانی...... ملک وال)

ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تبھی وہ ان کی طرف دیکھتا ہوا قریب آ گیا اور ان کے پاس آ کر طنزیہ اور حقارت بھرے لہجے میں بولا۔

"میرے بارے میں انوجیت نے تمہیں بتا ہی دیا ہوگا، نہیں معلوم تو پورا تعارف کراؤں......"

"تم سے تعارف ہی کے لیے نہیں، پوری جان پہچان ہی کے لیے تو ادھر اوگی میں آیا ہوں۔ اچھا ہے تو خود ہی چل کر میرے پاس آ گیا۔ ورنہ میں نے تو تجھے ملنا ہی تھا۔" جسپال نے غراتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ اس دوران گاؤں کے لوگ بھی ان کے گرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔

"اش کے بھئی...... بڑے عرصے بعد کوئی میرے سامنے بولا ہے۔ خیر دیکھ لیتے ہیں، جتنا بولتے ہو اتنا برداشت بھی کر لیتے ہو۔" اس کا لہجہ ہنوز حقارت آمیز

تھا تو جسپال نے کہا۔

"یہ تو وقت بتائے گا نا بلجیت، کون کیا ہے؟"

"وقت ہم نے کہیں سے لینے جانا ہے۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔

"مرد ہو تو اپنی زبان پر قائم رہنا۔ بھاگنا نہیں، آؤ ابھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال لیتے ہیں۔" جسپال نے اپنا ہاتھ کھول کر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"مجھ تک پہنچنے کے لیے تمہیں کئی ہاتھوں سے لڑنا ہوگا۔ جبکہ......"

"اوئے میں تمہاری بات کر رہا ہوں، بلجیت...... پرائے بازوؤں پر تو ہیجڑا بھی بات کر لیتا ہے۔" جسپال نے طنزیہ انداز میں کہا تو بلجیت کے چہرے پر کئی بل آ گئے۔ بلاشبہ وہ سمجھ چکا تھا کہ جسپال اسے کس راہ پر لا رہا ہے۔ اس لیے بات بدلتے ہوئے بولا۔

"وقت آنے پر تیرے ساتھ پنجہ بھی لڑا لوں گا، فی الحال تو میں سرپنچ کی حیثیت سے آیا ہوں، تجھے کس نے اجازت دی ہے کہ اس حویلی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کر سکے۔"

"یہ حویلی میرے پرکھوں کی ہے، جو یہاں کے بے غیرت بزدلوں کے دھوکے کا شکار ہو گئے تھے۔ دل تو کرتا ہے کہ ان بے غیرتوں کو ختم کرنے کے بعد ہی اسے ٹھیک کراؤں، مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں اس حویلی کا وارث یہاں آ گیا ہوں۔ اب جس میں ہمت ہے وہ مجھے روک لے......"

"میں روکنے آ گیا ہوں تمہیں...... تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ تم اس حویلی کے وارث ہو، اب اگر ہمت ہے تو بات کرو......" بلجیت نے انتہائی غصے میں کہا۔ کیونکہ جسپال نے اس کے سامنے ہی اس کے بڑوں کو گالی دے دی تھی۔

"بولو......! کیا کروں، جس سے تمہیں یہ پتہ چل جائے کہ میں تمہاری بات نہیں مانتا۔" اس نے بلجیت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"پورا گاؤں گواہ ہے کہ تم نے میری بات نہیں مانی، تم اس حویلی کے اندر داخل ہو کر دکھا دو۔" اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"لو پھر، میں جا رہا ہوں...... اگر تم میں ہمت ہے تو مجھے روک لو......" جسپال نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی جیکٹ میں ڈالے اور حویلی کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اسی لمحے بلجیت کے باڈی گارڈوں نے اپنی گنیں سیدھی کیں اور اس پر تان لیں۔ وہاں پر کھڑے ہر شخص نے اپنی سانسیں روک لیں۔ وہ جسپال کو حویلی کے ٹوٹے ہوئے پھاٹک کی جانب بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ تبھی ہرپریت تیزی سے اپنی جیپ کی جانب بڑھی اور ڈیش بورڈ سے اپنا پسٹل نکال کر وہیں بیٹھ گئی۔ انوجیت اس سارے منظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تبھی جسپال حویلی کے پھاٹک کے اندر پہنچ گیا پھر وہیں کھڑے ہو کر اس نے بلجیت کو پکارا۔

"اوئے بلجیت......! میں اپنی حویلی کے دروازے پر کھڑا ہوں، اس حویلی کے دروازے پر جسے بے غیرتوں نے آگ لگائی تھی اور میرے بڑوں کو زندہ جلایا تھا۔ میں یہاں کھڑے ہو کر عہد کرتا ہوں کہ میں نے بھی ان بے غیرتوں کو زندہ جلانا ہے۔ اب اگر تم میں ہمت ہے تو روک لو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی دونوں جیبوں سے دو پسٹل نکال لیے۔ صورت حال انتہائی خطرناک ہو گئی تھی۔ شاید بلجیت کو اس کی طرف سے اس قدر مزاحمت کی امید نہیں تھی، یا پھر کوئی اور بات تھی، وہ تذبذب میں کھڑا اس کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ انوجیت آگے بڑھا اور بولا۔

"بلجیت......! اگر تم چاہتے ہو کہ یہاں کوئی خون نہ ہو، تو ابھی پلٹ جاؤ۔ ورنہ کوئی نہیں جانتا، کس کی

لاش یہاں گر جائے۔"

"میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔" بلجیت نے کہا اور اپنے لوگوں کو اشارہ کر کے واپس گاڑی میں جا بیٹھا۔ وہ مصلحت سے کام لے کر اس ٹکراؤ سے بچ جانا چاہتا تھا۔ اسے جسپال کے اندر کی شدت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک مر جاتا تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ مصیبت تو اسے ہی ہونا تھی، سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے...... ایسے ہی موقع کے لیے اس نے خود پر قابو پایا اور وہاں سے چلا گیا۔ آخر وہ گاؤں کا سرپنچ تھا۔ اتنی تو عقل تھی اس میں۔ اس نے جسپال کے اندر بھڑکنے والی آگ کی تپش کا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ چلا گیا۔ تو جسپال نے ایک طویل سانس لی پھر ٹھیکیدار کے قریب آ کر بولا۔

"تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں صبح سے لے کر شام تک یہیں بیٹھا کروں گا، تم اپنا کام شروع کرو۔ میں دیکھتا ہوں کون روکتا ہے۔"

تبھی ٹھیکیدار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"او بھاء جی! آپ فکر نہ کرو، اب ہفتے میں نہیں صرف تین دن میں کام ختم ہو گا۔"

"اور تم یقین رکھنا، تجھے روکنے کوئی نہیں آئے گا۔" جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کوئی بات کیے بغیر جیپ کی طرف بڑھا۔ انوجیت ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو جیپ چل دی۔ جسپال تیزی سے اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

❀......□......□......❀
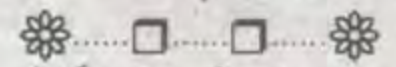
میں اور چھاکا بائیک گھمائے نور نگر کی طرف جا رہے تھے۔ چھاکا میرے پیچھے اس لیے نہیں آیا تھا کہ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں شاہ زیب کے ساتھ گیا ہوں اور مجھے خطرہ ہے، بلکہ دلبر کے کنویں پر سردار

دنیاوی لذتیں

مامون رشید نے ایک دن حسن بن سہیل سے کہا۔

"جس نے دنیا کی تمام لذتوں پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لذت ایسی ہے جس سے انسان کسی نہ کسی وقت اکتا جاتا ہے لیکن سات لذتیں ایسی ہیں جن سے کبھی اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ گندم کی روٹی، بکری کا گوشت، ٹھنڈا پانی، ملائم کپڑا، خوشبو، گداز بستر اور ہر قسم کے حسن کو دیکھنا۔" حسن بن سہیل نے کہا

"امیر المومنین ایک چیز رہ گئی اور وہ ہے لوگوں سے بات چیت کرنا۔" مامون رشید نے اس کی تصدیق کی۔

(ذکیہ ابراہیم...... چیچہ وطنی)

شاہ دین کے لوگوں نے پوچھ تاچھ کی تھی۔ وہ کتوں کی طرح ہر اس بندے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، جس کا کسی نہ کسی حوالے سے کوئی تعلق میرے ساتھ بنتا تھا۔ یہ میرے لیے حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ یہ تو اب کوئی راز نہیں رہا تھا کہ ملک سجاد کے بھیجے ہوئے لوگ مجھے ہی قتل کرنے آئے تھے اور ان کے بارے میں سردار شاہ دین کی اجازت اور مرضی شامل تھی جو وہ اس کے ڈیرے پر آ کر ٹھہرے تھے۔ اب ان کا قتل نہ صرف سردار شاہ دین کے لیے چیلنج تھا بلکہ اس کی علاقے میں حاکمیت پر سوال اٹھ گیا تھا۔ اپنے علاقے میں دشمنی کچھ الگ تاثر رکھتی ہے، لیکن یہ انتہائی بری بات تھی کہ اپنے ہی علاقے کے بندے کو مارنے کے لیے کوئی دوسرا یہاں کے کسی بڑے سے تعاون لے۔ ملک سجاد نے تو بڑے مان اور کروفر سے اپنے بندوں کو بھیجا ہو گا کہ وہ مجھے قتل کر کے چپ چاپ واپس لوٹ جائیں گے لیکن اب صورت حال

بن گئی تھی کہ اگر وہ سردار شاہ دین اس بات کو مانتا ہے کہ وہ ملک سجاد کے بندے تھے تو پورے علاقے میں نہ صرف اس کا تاثر خراب ہوتا بلکہ نفرت بھی پھیل جاتی، ورنہ پیرزادہ کے بندے مر جانے کی وجہ سے پیرزادہ کے ساتھ شاہ دین کو دشمنی کرنا پڑتی۔ رندھاوا اگر مجھے بروقت اطلاع نہ دیتا تو شاید میں ان کے دھوکے میں آ جاتا۔ اب میرے ذہن میں فقط ایک ہی سوال تھا کہ رندھاوا کا اس میں کیا فائدہ ہے؟ یہ تو وقت آنے پر ہی مجھے معلوم ہو سکتا تھا، فی الحال مجھے گاؤں پہنچ کر اپنے بندوں کا تحفظ کرنا تھا۔ خصوصاً دلبر کے لوگوں کا...... ان میں، اگر کوئی پھٹ گیا تو پیرزادہ کی دشمنی مول لینی پڑ جائے گی۔ مجھے گاؤں میں داخل ہونے کے لیے شاہ دین کی حویلی کے سامنے سے ہو کر جانا تھا۔ اگرچہ وہ سڑک سے ذرا ہٹ کر تھی لیکن اس کے بندے وہیں سڑک پر ہی موجود ہوتے تھے۔ میں کسی بھی متوقع صورت حال کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ مگر حویلی اور اس کے ارد گرد کہیں بھی کوئی ہلچل نہیں تھی۔ میں اور چھاکا گاؤں میں داخل ہو گئے اور چوک میں اچھو کریانے والے کی دکان پر جا ٹھہرے، چوک میں برگد کے درخت تلے گاؤں کے بہت سارے لوگ جمع تھے۔ عموماً وہاں لوگ جمع رہتے تھے، لیکن اس دن کچھ زیادہ تعداد تھی۔ بلاشبہ وہاں پر علاقے میں ہونے والے واقعات پر تبصرہ آرائی ہو رہی تھی۔ میرے رکتے ہی لوگوں نے میری طرف دیکھا اور آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ میں نے جاتے ہی اچھو سے کہا۔

"فون ملاؤ...... وہی جو تو نے مجھے دیا تھا۔"

"ابھی ملاتا ہوں......" اس نے کہا، پھر دکان میں کھڑے گاہکوں کو تیزی سے نمٹانے لگا۔ چند منٹوں بعد اس نے وہ نمبر ملا کر مجھے دیا۔ چند گھنٹیاں جانے کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا، تو میں نے اس کی ہیلو کے جواب میں کہا۔

"ملک سجاد ہی بات کر رہے ہو نا، یا اپنا فون کسی اور کو دے دیا ہے؟"

"بکواس کرو...... کون ہو تم؟"

"وہی، جس کو مارنے کے لیے تم نے اپنے بندے بھیجے تھے۔"

"اوہ...... تم...... جمال......" اس نے غراتے ہوئے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں تو تیرے انتظار میں تھا، تو نے خود آنے کی دھمکی دی تھی۔ اب ہیجڑوں کی طرح بندے بھیج دیئے۔"

"لگتا ہے تو میرے ہی ہاتھوں سے بوٹی بوٹی ہو گا۔" اس نے بھنا کر جواب دیا۔

"تو آؤ نا، کس نے روکا ہے ورنہ مجھے بتاؤ، میں آ جاتا ہوں، مرد کی زبان ہوتی ہے، ہیجڑے اپنی بات سے پھرتے ہیں۔"

"لے پھر انتظار کر، میں آ رہا ہوں۔ شام سے پہلے میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔"

"نہ آئے تو...... اپنا پتہ بتاؤ......" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو وہ گالیاں بکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میرا کام ہو گیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھا اور پیدل ہی چند قدم کے فاصلے پر برگد کے درخت تلے موجود لوگوں کے درمیان ایک چارپائی پر آ بیٹھا تو ایک بزرگ سے بندے نے کہا۔

"او پتر......! تو قتل ہو گئے علاقے میں...... کچھ پتہ چلا کیا ہوا ہے، کس وجہ سے ہوئے......"

"چاچا......! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ لڑائی ان بڑے لوگوں کی ہوتی ہے اور مرتے ہیں غریب غربا، ان کے گیٹ پر ہی غریب بندوقیں لے کر ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے

نوجوانوں کو ان کی خدمت کرنے کے لیے بھیجتے ہو اور پھر پوچھتے ہو یہ قتل کیوں ہوئے۔" میں نے غصے میں کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"تیرا کیا مطلب ہے' یہ سرداروں اور پیرزادوں کی آپسی لڑائی میں مارے گئے؟"

"ممکن ہے' میلے پر کیا ہوا تھا' نورنگر کے لوگوں نے پیرزادوں کے بندے زخمی نہیں کئے تھے جواب تک اسپتالوں میں پڑے ہیں۔ کیا پیرزادوں نے چوڑیاں پہنی ہوئی ہیں۔ پر دکھ اس بات کا ہے' جو بھی مرے ہیں غریب ہی مرے ہیں۔"

"مجھے نہیں لگتا جمالے کہ یہ پیرزادوں کی لڑائی ہے' چھ بندے باہر کے ہیں' اپنے علاقے کے نہیں۔" اس نے شک بھرے انداز میں کہا۔

"اب یہ تو سردار ہی جانتا ہے نا کہ وہ بندے کہاں سے لایا تھا اور کیوں؟ یہ سوال اس سے پوچھنا چاہیے؟" میں نے کہا تو وہ قدرے تذبذب سے بولا۔

"یہاں سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ چھ بندے کل مختلف جگہوں پر تیرا پوچھ رہے تھے۔ لگتا ہے انہیں تیرے ساتھ کوئی دشمنی تھی۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر ان چھ لوگوں کا سردار کے ڈیرے پر کیا کام؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا نا کہ سردار مجھے قتل کروانا چاہتا تھا۔ چاچا......! یہ بھی چال ہے ان سرداروں کی...... میری دشمنی ان بندوں کو بتا کر خود پیرزادوں کے سامنے سچا ہو جائے۔ میں تو کہتا ہوں گاؤں کے بڑوں کو اکٹھا کریں اور چلیں سردار کے پاس اور جا کر پوچھیں......" میں نے وہ بات کہہ دی جس کے لیے میں ان کے پاس آیا تھا۔

"بات تو تیری ٹھیک ہے۔" چاچے نے سر ہلا کر کہا تو دوسرے لوگ بھی اس کے ہمنوا ہو گئے۔ تبھی ان میں سے ایک نوجوان نے کہا۔

"اب اگر...... یہ ریت پڑ گئی کہ باہر سے بندے منگوا کر یہاں کے بندوں کو مارا جائے' تب دونوں طرف سے بندے تو ہمارے ہی علاقے کے مریں گے' ہو سکتا ہے کل ہماری باری ہو۔ کیا ان بڑوں کی لڑائی میں ہم ہی غریبوں کو مرنا ہے؟"

"اب یہ سوچنا تو آپ سب کو ہے' ہمیں سوچنا ہے' رات بستی میراں شاہ کے تین بندے مرے' کل نورنگر کے مر جائیں گے' ہم غریبوں کے گھر ہی کیوں اجڑیں' وہ لوگ خود کیوں نہ اس آگ میں جلیں' جنہوں نے یہ آگ لگائی ہے۔" میں نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اب دیکھو......! کتنی بڑی کمینگی ہے کہ ان مرنے والے لوگوں کے بارے میں اپنے ہی گاؤں کے لوگوں سے پوچھ تاچھ کر رہے ہیں' انہیں دھمکیاں دے رہے ہیں۔ پیرزادوں سے کیوں نہیں پوچھتے۔" ایک جوشیلے نوجوان نے غصے میں کہا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں جی' مرنا تو ہے ایک دن' مگر یوں بے مقصد مرنا' کم از کم مجھے گوارا نہیں۔ دیکھنا' میں یہ سوال سردار شاہ دین سے کروں گا' وہ مجھے کوئی جواب نہیں دے گا' بلکہ میری موت چاہے گا' آج میں مروں گا' کل تم اور تمہارے بچے ماریں گے یہ لوگ...... فیصلہ اب آپ لوگوں کو کرنا ہے۔" میں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا اور پلٹ کر بائیک کی طرف بڑھا' میں نے ادھر ادھر دیکھا' وہاں چھاکا نہیں تھا تبھی اچھو کریانہ والے نے کہا۔

"چھاکا کہہ گیا ہے کہ وہ گھر سے ہو کر تمہاری طرف آتا ہے۔"

مجھے اس کا یوں اچانک غائب ہو جانا کچھ عجیب سا لگا۔ اس لیے اضطراری طور پر میں اپنے گھر کی جانب بڑھا۔ گلی صاف تھی۔ میں نے کھلے ہوئے گیٹ کو دھکیلا اور بائیک سمیت اندر چلا گیا۔ تبھی

مجھے باہر والے کمرے میں چھاکا کھڑا دکھائی دیا۔ وہ میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ میں جلدی سے اس طرف بڑھ گیا۔ اندر وہی کل والا بندہ بیٹھا ہوا تھا جو رندھاوا کی طرف سے مجھے ملنے آیا تھا۔ میں ہاتھ ملا کر اس کے پاس بیٹھ گیا تو وہ بولا۔

"اوپر سے سختی کے ساتھ ہدایت آ گئی ہے کہ ان نو بندوں کے قاتلوں کو فوراً پکڑا جائے۔"

"رندھاوا نے کیا رپورٹ دی ہے اپنے افسروں کو؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"انہوں نے تو یہی رپورٹ دی ہے کہ یہ سرداروں اور پیرزادوں کی آپس کی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ دونوں طرف سے رندھاوا صاحب پر کوئی دباؤ نہیں' وہ جو دباؤ بھی ڈلوا سکتے ہیں اوپر ہی سے ڈال رہے ہیں۔ کیونکہ ان اشتہاریوں کے سر پر قیمت تھی۔ جس کا کریڈٹ انہیں جاتا ہے۔ رندھاوا صاحب کی کوشش یہی ہے کہ اسے پولیس مقابلہ دکھایا جائے۔ پیرزادے اس پر راضی نہیں ہو رہے ہیں۔" اس بندے نے سمجھایا۔

"ایسے تو سردار بھی نہیں مانیں گے۔ ان کے ڈیرے پر فائرنگ ہوئی۔ ان کا نام بھی آئے گا؟" میں نے کہا۔

"اسی وجہ سے وہ کسی تیسرے گروپ پر یہ سب کچھ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب دیکھیں کیا بنتا ہے۔" اس نے کہا اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "رندھاوا صاحب نے کہا ہے' ملک سجاد کو آپ فون کر کے دھمکی دیں۔ اسے کسی طرح یہاں لانے پر اکسائیں اور کبھی اس کے علاقے میں جانے کی غلطی نہ کریں۔ وہ آ گیا تو معاملے کی نوعیت بدل جائے گی' کیونکہ ہمارے ڈی ایس پی صاحب کی ان سے پرانی دشمنی ہے۔"

"مطلب تم لوگ اسے ٹریپ میں لا رہے ہو۔" میں نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ کاندھے اچکا کر بولا۔

"ایسے ہی ہو گا' آپ کے لیے ایک اور پیغام یہ ہے کہ آج رات آپ لوگوں کے درمیان رہیں۔ کچھ بھی کریں لیکن گاؤں میں لوگوں کے درمیان رہیں۔"

"کیوں؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"یہ میں نہیں جانتا۔" اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر میں ملک سجاد کو فون کر دیتا ہوں' اسے یہاں آنے پر اکساتا ہوں تو پھر اگر وہ آ گیا تو مجھے ہی اس کا سامنا کرنے پڑے گا۔ وہ اکیلا تو آنے سے رہا اور......"

"وہ جس وقت وہاں سے چلا' اس وقت یہاں آپ کے پاس اطلاع پہنچ جائے گی۔ ہم کوئی غافل تو نہیں بیٹھے۔" اس نے تیزی سے جواب دیا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں اب چلتا ہوں' آپ محتاط رہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ چھاکے کے ساتھ باہر نکل گیا۔

گھر کے اندر اماں میرے انتظار میں تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میں دہل کر رہ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اماں کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور پیار سے پوچھا۔

"اماں......! کیا بات ہے' ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"اتنی آگ ہے تیرے اندر...... اتنی نفرت...... اتنا غصہ...... نو بندے...... ایک ہی رات میں......" انہوں نے یوں اٹک اٹک کر کہا جیسے یہ سب کچھ کہتے ہوئے انہیں بہت دکھ ہو رہا ہو۔ تب میں نے کہا۔

"ہاں ماں...... بچپن سے اس آگ میں جل رہا ہوں...... اتنی دیر سے بھڑکتی ہوئی آگ...... اپنا کچھ تو اثر رکھتی ہے۔"

"میں کیسی ماں ہوں پتر......! جس نے خود تجھے

اس آگ میں دھکیل دیا۔ مائیں تو اپنے بیٹوں کو بڑا آدمی بنانے کے نہ صرف خواب دیکھتی ہیں بلکہ پوری جان لگا دیتی ہیں...... اب تو جس راہ پر چل پڑا ہے پتہ نہیں کب تیرا ساتھ......'' یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔

''تو فکر مت کر ماں...... میں ایسے نہیں مرنے والا' مروں گا تو اپنے دشمنوں کو برباد کر کے ہی مروں گا...... تو بس میرے لیے دعا کرتی رہا کر......'' میں نے اماں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا تو انہوں نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا' پھر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''بیٹا...... تیرے لیے ہی تو دعا کرتی ہوں' شاید اسی لیے زندہ ہوں...... چل تو بیٹھ میں تیرے لیے کھانا لاتی ہوں۔''

''ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔ صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔'' میں نے کہا اور اماں سے الگ ہو کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی۔ جب میں بائیک لے کر دلبر کے کنویں کی طرف چل دیا۔ چھاکا واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں اس کے گھر بھی گیا لیکن وہ صبح سے ہی واپس نہیں پلٹا تھا۔ میں اس وقت دلبر کے کنویں پر جا رہا تھا' میں گاؤں سے نکل کر کنویں کے راستے پر تھا کہ سامنے سے دور ایک جیپ کنویں کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ ایک دم سے مجھے یوں لگا کہ اس میں بیٹھے لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ مجھے کیسے خبر ہوگئی۔ پھر خود پر ہنس دیا کہ رات بھر سے یہی سوچتا چلا آرہا ہوں اور ایسے ہی خطرناک حالات سے گزر رہا ہوں۔ ایسے میں خیالات بھی شک آلود ہوگئے ہیں۔ یہ فطری سی بات ہے کہ جب انسان مخدوش حالات میں سے

گزرتا ہے یا اسے کہیں تھوڑا بہت بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ بے حد چوکنا ہو جاتا ہے۔ بقا کی جنگ میں تو یہ بھی انسان کے گلے پڑ جاتی ہے۔ جس بندے کا کوئی دشمن نہ ہو' وہ ایسے تجربات سے نہیں گزر سکتا' لیکن جب دشمنی ہو' خطرہ محسوس ہوتا ہو' یا منافقوں کو ان کے بلوں سے نکالنا ہو تو پھر فطرت ایسی ایسی صلاحیتوں سے نوازتی ہے کہ بندہ خود حیران رہ جاتا ہے۔ یہیں سے منفی اور مثبت سوچ دو مختلف راہوں پر لے جاتی ہے۔ وہ منافق جو پہلے ہی حسد کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے' وہ کبھی اچھا نہیں سوچ سکتا اور جو اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہے اور مثبت سوچ رکھتا ہے فطرت بھی اس کا ساتھ دیتی ہے کہ عمل اس کی سوچ کا اظہار ہوتا ہے۔ میں انہی خیالات میں کھویا ہوا' بائیک لیے جا رہا تھا' میرے اردگرد کھیت تھے اور ہری بھری فصلیں' گندم کی بالیاں ابھی آرہی تھیں۔ میں انہی رنگوں میں الجھا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ جیپ پر پڑی۔ وہ جیپ وہیں کھڑی تھی۔ مجھے لگا کہ میرے دماغ نے خطرے کا الارم یونہی نہیں بجایا۔ کچھ ہے' میں نے بائیک وہیں روکی اور فصلوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا' کنواں نسبتاً اونچی جگہ پر تھا۔ میرے درمیان صرف ایک کھیت کا فاصلہ تھا' آگے کچے کمرے اور پھر وہ لوگ تھے' دلبر اور اس کے ساتھ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور چار بندے ان پر اسلحہ تانے کھڑے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا' دلبر کے پاس ہی چھاکا بیٹھا ہوا تھا۔ صورت حال بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں نے اگرچہ اپنا پسٹل نکال لیا تھا' لیکن ان پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چند لمحے مزید وہیں رکے رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ ان کی پشت میری طرف تھی۔ میں اس انتظار میں تھا کہ کسی ایک کا چہرہ تو میری طرف ہوتا کہ مجھے معلوم ہو جائے وہ کون ہیں؟ میں اگر ایک پر بھی فائر کرتا تو سامنے بیٹھے ہوئے لوگ باقی تینوں کا نشانہ ضرور بن جاتے۔ میرے لیے لمحہ لمحہ قیمتی تھا۔ میں اچانک سامنے بھی نہیں آنا چاہتا تھا کہ کوئی گھبرا کر فائر ہی نہ جھونک دے۔ تبھی حملہ آوروں میں سے ایک نے کہا۔

''دلبر بتا دے' بتا دے دلبر! ہمارے تینوں بندے وہاں تک کیسے پہنچے۔ ان کی دشمنی صرف تیرے ساتھ تھی۔''

اس کے اس فقرے سے میں سمجھ گیا کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ وہ پیرزادہ کے بندے تھے۔ تبھی میں نے سامنے آئے بغیر کہا۔

''میں بتاتا ہوں کہ وہ کیسے وہاں گئے۔''

مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ضرور چونکے ہوں گے اور ان کا دھیان میری طرف ہوا ہوگا۔ مجھے پتہ تھا کہ چھاکے کے لیے اتنی مہلت ہی کافی ہوگی۔ میں چند لمحے رک کر سامنے آیا تو چھاکا اور دلبر دو بندوں پر حاوی ہو چکے تھے۔ اور باقی دونوں سے نبرد آزما تھے۔ میں نے اونچی آواز میں کہا۔

''اوئے چھوڑ دو ان کو...... لیکن ہتھیار لے لو......''

چند لمحوں میں ہی ان کی گنیں چھین لی گئیں۔ وہ نہتے ہو گئے۔ میں آگے بڑھا اور ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ چاروں میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سامنے پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئے۔ باقی ان کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔

''دیکھو...... اگر ہم چاہیں تو ابھی تم چاروں کو اپاہج بنا کر واپس بھجوا دیں اور...... بھجوا بھی دیں گے اگر تم لوگوں نے غلط بیانی کی تو......'' یہ کہہ کر میں نے ایک لڑکے سے کہا۔ ''پانی پلاؤ ان لوگوں کو۔''

میرے یوں کہنے پر وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ وہ لڑکا پانی لینے چلا گیا تو میں نے کہا۔

"سچی بات کرنی ہے' صرف سچی...... بولو' کس نے بھیجا ہے۔"

"پیرزادہ وقاص نے......" ان میں سے قدرے ادھیڑ عمر بندے نے کہا۔

"کیوں......؟" میں نے پوچھا۔

"قتل ہونے والوں کی دلبر سے بھی دشمنی تھی۔ اس لیے پوچھنے آ گئے۔"

"خود آئے ہو یا پیرزادہ نے بھیجا ہے؟" میں نے پھر سے پوچھا۔

"انہوں نے ہی بھیجا ہے۔" اس بندے نے دوبارہ کہا تو میں چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"تو پھر اسے جا کر بتا دو' دلبر نے وہ بندے نہیں مارے' بلکہ ان نوواردوں نے مارے ہیں اور ہم سب ان کے چشم دید گواہ ہیں۔"

"وہ کیسے؟" ادھیڑ عمر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"اب تم لوگ بچے تو نہیں ہو کہ یہ باتیں پولیس تک پہنچائی جائیں۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ میں اور دلبر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان چھ کو مارنے گئے تھے' سردار کے ڈیرے پر' وہاں صرف دو ہی تھے۔ باقی چار ہمیں نہیں ملے' وہاں ان سے سامنا ہوا' کچھ پٹاخہ بازی ہوئی اور ہم نے انہیں قابو میں کرلیا۔ ان سے باقیوں کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ نزدیک سے کہیں شراب لانے گئے ہیں۔ انہیں بھٹی کے بارے میں پتہ تھا' ہمیں بھی معلوم تھا' ہم جب وہاں پہنچے تو ان میں مڈبھیڑ ہوچکی تھی اور زخمی حالت میں پڑے تھے تمہارے تینوں لوگ مارے جاچکے' ان میں سے صرف ایک زندہ تھا' اسے ہم نے ماردیا۔ پھر بھٹی کو چھوڑ کر واپس آ گئے۔"

"کیا یہ سچ ہے جمالے......" اس بندے نے پوچھا۔

"بالکل سچ' سولہ آنے سچ......" میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

"بات ہضم نہیں ہوئی......" وہ پھر بولا۔

"تو پھر کیا لینے آئے ہو یہاں...... تمہاری دشمنی تو سردار سے بھی ہے' اس کے پاس کیوں نہیں گئے۔ اس لیے کہ انہیں تم لوگ ڈرا دھمکا نہیں سکتے۔ جاؤ' جاکر پیرزادہ سے کہو ان بے چارے غریبوں کو نہ ستائے' بلکہ ان سرداروں سے پوچھے کہ وہ چھ نووارد یہاں کیوں تھے' اس سوال کا جواب دے دیں گے تو پھر ان کے قاتل بھی مل جائیں گے۔ یہ میرا پیغام دے دینا پیرزادہ کو...... جاؤ اب۔"

"اوئے جمالے...... انہیں یونہی جانے دے رہے ہو...... انہوں نے ہم پر اسلحہ تانا ہے' تم نہ آتے تو شاید یہ ہمیں......" دلبر نے کہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔

"دیکھو...... پیرزادہ وقاص کی میرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں اس سے دشمنی کرنا چاہتا ہوں' انہیں پانی پلاؤ اور جانے دو۔"

"نہیں' جمالے نہیں...... میرے کنویں پر کوئی مجھ پر اسلحہ تانے' یہ کیسے ہوسکتا ہے' کل کلاں ہر کوئی ایرا غیرا اسلحہ لے کر یہاں چڑھ دوڑے گا' نہیں انہیں یونہی نہیں جانے دوں گا...... چاہے تو بھی میرا دشمن بن جائے۔"

دلبر انتہائی غصے میں تھا' اس نے اپنے قریب کھڑے لڑکے سے گن پکڑی اور اس کا بولٹ ماردیا۔

(باقی آئندہ)

برائی رتیں

ہجر و فراق کی دھوپ میں جھلسنے والے ہر پل جیتے اور مرتے ہیں ان کے لیے زندگی اک سوال کی مانند ہوتی ہے جیسے حل کرتے کرتے وہ موت کی دہلیز تک پہنچ جاتے ہیں مگر جب مایوسی کے اتھاہ اندھیروں میں وصل کا چراغ اچانک جل اٹھتا ہے تو......

روایاتوں کے اسیر لوگوں کا قضیہ' قارئین نئے افق کے لیے ایک خوب صورت سچی کہانی

کئی دنوں سے پورا شہر دھند کی لپیٹ میں تھا کئی برسوں کے بعد لاہور کے مکینوں نے ایسے سرد اور منجمد کرنے والے دن رات دیکھے تھے۔ اب تو لوگ رخ ماہتاب کو دیکھنے کے لیے ترس رہے تھے۔ پندرہ دنوں سے ایک ہی موسم ٹھہرا ہوا تھا' سرد اور برفیلا موسم وہ سوچ رہی تھی کتنی رتیں بدلیں' کتنے موسم آئے' کبھی ساون برستے دیکھا' کبھی اداس شاموں نے رلایا۔ کبھی طویل اور لمبی راتوں کے رتجگے' کبھی خزاں رسیدہ موسم' تو کبھی جون کی گرما دینے والی دوپہر' کبھی حبس زدہ راتیں۔ کتنے ہی موسم گزرے مگر اس کی آنکھوں میں اور اس آنگن میں تو ایک ہی موسم ٹھہرا رہا' انتظار کا موسم' سزا کا موسم' خود اذیتی کا موسم' ناکردہ گناہوں کا موسم' وہ اس کو کوئی بھی نام دیتی' اذیت پہلے سے بڑھ جاتی۔ زندگی گرلانے لگتی اور موت کا سا سکوت ہر سو چھا جاتا۔ اس برفیلے موسم کی مانند اس کے جذبات بھی سرد اور منجمد تھے' دس سالوں کی برف جمی تھی' اس جمی برف کو صرف جذبوں کی حدت ہی پگھلا سکتی تھی مگر جذبوں کی حدت کہاں تھی اس نے تنہا کالی راتیں کاٹیں تھیں اس لیے تو جنوری کی اس خون جما دینے والی سرد شام میں وہ کھلے آنگن میں بیٹھی دھند میں جانے کس کو تلاش کررہی تھی۔ ماضی جو کٹ گیا' حال جس سے آنکھیں چرانے پر مجبور تھی اور مستقبل کی اسے خبر نہ تھی۔

"گل لالہ! آپ کو آغا جان یاد فرما رہے ہیں۔"

"آغا جان!" وہ چونک پڑی اور پھر روبوٹ کی مانند اٹھی اور آغا جان کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

دایہ سعدیہ نے اسے تاسف سے دیکھا اور اک آہ اس کے لبوں سے نکلی۔

وہ آغا جان کے سامنے بیٹھی تھی' کبھی اس کے کمرے میں آنے کے لیے وہ ترستی تھی اور رخ عالم کے ساتھ چھپ چھپ کر اس کمرے کو اندر سے دیکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ اس کمرے میں کسی کو بھی آنے کی اجازت نہ تھی مگر آج اسے اس کمرے کی ہر چیز ازبر ہوچکی تھی وہ آنکھیں موند کر بتاسکتی تھی کہ آغا جان کا بیڈ کہاں ہے۔ ڈوبتے سورج کا منظر کہاں آویزاں ہے' رائٹنگ ٹیبل کہاں ہے' شکاری تلواریں اور شیر کی کھال کس کونے میں ہے۔

"گل لالہ! ہمارا انتظار ختم ہوا وہ کل لوٹ رہا ہے' دس سالوں کے بعد جب کہ اس آنگن میں ہمارے اور آپ کے سوا اس کا استقبال کرنے کے لیے کوئی باقی نہیں رہا۔ اب موت کا سکوت ٹوٹے گا' اب کسی کی آواز گونجے گی۔ جاؤ گل لالہ! اپنی نگرانی میں اس مکان کو گھر کی طرح آراستہ کراؤ۔ میں سب کو اس کے لوٹ آنے کی نوید دے رہا ہوں۔"

اس نے آغا جان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ آج ان کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک تھی۔ ہجر و فراق کے وصل میں بدلنے کی چمک' زندگی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لینے کی چمک' زندگی سے بھرپور مسکان اور چمک ان کے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی تھی ورنہ تو اس آنگن میں اترتے ہی اس نے آغا جان کے چہرے پر موت کی

خاموشی دیکھی تھی اور آنکھوں میں رتجگوں کی لالی اترتی محسوس کی تھی مگر آج......

''گل لالہ! کہاں کھوگئی ہو؟ تمہاری سزا ختم ہوئی' وہ لوٹ رہا ہے جاؤ کل کی تیاری کا سوچو اور یہ سفید لباس اتار دو' کل میں تمہیں اس سفید لباس میں نہ دیکھوں۔''

''جی آغا جان!'' وہ کہہ کر رکی نہیں' اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اس پناہ گاہ میں جس کے در و دیوار اس کی اذیتوں کے گواہ تھے ان در و دیوار نے اس معصوم لڑکی کی سسکیوں اور آہوں کو اپنے اندر سمیٹا تھا' اس کی تنہائیوں میں اس کا ساتھ دیا تھا۔

آغا جان اب تو سزا شروع ہوگی' سزا ختم نہیں ہوئی میں نے تو اس آنگن میں اترتے ہی ماضی کی محبتیں بھلا کر اپنے آپ کو سزا کے لیے تیار کرلیا تھا۔ اپنے جسم کو نیلو نیل دیکھنے کی تیاری کرلی تھی۔ اپنی روح کو نشتر سے چھلنی کرنے کی نوید سنادی تھی کہ قصاص میں آئی لڑکی بہو نہیں سزا ہوتی ہے۔ میں اس آنگن میں اتاری گئی تھی' خون بہا کے طور پر۔ میرے دس سال کون لٹائے گا' وہ دن جو کالج میں سکھیوں کے ساتھ باتیں' مستقبل کے انوکھے خواب سجاتے گزرنے تھے وہ اس آنگن میں اپنا مقام تعین کرنے میں گزار دیئے۔ اماں نے مجھے کب بہو مانا' ایک بیٹے کا خون بہا اور دوسرے بیٹے کو دربدر کرنے کا سبب ہی قرار دیا۔ وہ زبان جو کبھی میرے لیے پھول برساتی تھی اب انگارے برساتی تھی' کچوکے لگاتی تھی۔ مرتے وقت بھی ان کی آنکھوں میں میرے لیے صرف نفرت تھی' شدید نفرت۔ میری دوست میری ہم دم جو مجھے بہلانے کی کوشش کرتی تھی خود اس موت آسا خاموشی سے گھبرا کر ایسی گئی کہ پھر پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔

اور اب میں اس کے لوٹ آنے کی کیا خوشی مناؤں کہ اب ہی تو سزا شروع ہوگی۔ میں اس کے ماں جائے کا خون بہا ہوں۔ جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا اور جس کی میت پر اس نے قسم کھائی تھی کہ میں تیرے قاتلوں سے ایسا انتقام لوں گا کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں گی کہ انتقام کسے کہتے ہیں؟

آنے والی بیل نے اسے چونکا دیا۔

''یہ رانگ نمبر...... میرے سیل پر تو رخ عالم کے سوا کسی کی کال نہیں آئی تو پھر یہ کال کس کی ہوسکتی ہے نہیں! میں نہیں اٹینڈ کروں گی۔'' بیل تواتر سے بجتی رہی اور پھر بند ہوگئی شاید کال کرنے والا خود ہی تھک آ گیا اور پھر میسج کی ٹون نے اسے چونکا دیا' اس نے بے اختیار اسکرین آن کی۔

تیرے آبلہ پا
تپتی ریت پر
جلتے انگاروں پر
ملنے کی آس و نراس میں
یونہی چلتے رہے
خود اذیت میں
دن گزرتے رہے
در بہ در ہم یونہی بھٹکتے رہے
غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک
اک مسلسل سفر
رتجگوں کی کہانی
اگر تم سنو
آنکھوں سے لہو ٹپکنے لگے
سانس چلنے سے رکنے لگے
مگر اس خطا کار کو اپنے گناہ گار کو
بخش دو...... بخش دو

نظم کیا تھی خود اذیتی کا منہ بولتا ثبوت' نظم پڑھتے پڑھتے وہ بیتے دنوں میں کھوگئی

وہ اپنے آنگن کے دو ہی تارے تھے لالہ بخت گل اس سے پانچ سال بڑے تھے۔ دونوں میں بہت پیار تھا۔ بابا اور اماں کی آنکھوں کے تارے تھے' بہاولپور ان کا آبائی گھر تھا' جہاں زمینیں ان کی ماں دھرتی کا مقام رکھتی تھیں اور بابا' ماں کو اپنی دھرتی سے جدائی گوارہ نہ تھی مگر بخت گل کا دل بہاولپور کے بجائے لاہور میں لگتا تھا۔ وہ یہاں پنجاب یونیورسٹی سے بی ایس سی آنرز کررہا تھا اور وہ خود بھی بہاولپور سے زیادہ لاہور کی شیدائی تھی مگر چھٹیوں میں ہی لالہ کے پاس آتی کیونکہ اماں اسے میٹرک کے بعد لاہور بھیجنے پر راضی ہوئی تھیں وہ دونوں کو ایک ساتھ جدا کرنے پر راضی نہ تھی۔ یہاں لاہور میں ماڈل ٹاؤن میں آشیانہ کے نام سے بہت خوب صورت بنگلہ تھا' جہاں چھٹیوں میں خوب رونق لگتی تھی' ان کے بنگلے کے سامنے ہی آغا جان کا بنگلہ تھا۔ جو بابا کے بہت گہرے دوست تھے اور بہاولپور کے ہی مکین تھے' بس کبھی کبھار آغا جان اور اماں رخِ عالم' ماہ عالم اور ماہتاب عالم کے پاس آتے تھے پھر خوب رونق لگتی۔ رخ عالم بھی اس کے ساتھ بہاولپور میں ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کررہی تھی دونوں کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ دوستی کے انمول بندھن میں بندھی ہوئی تھیں۔ رخ عالم آغا جان کے بجائے بابا سے ہر بات کرلیا کرتی تھی اور اکثر کہتی بابا جان یہ ہمارے آغا جان سے آپ کی دوستی کیسے ہوئی' آپ دونوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آپ کے سامنے زبان چلتی ہے اور خوب چلتی ہے مگر آغا جان کے سامنے چلتی زبان تالو سے چپک جاتی ہے حالانکہ وہ کہتے کچھ بھی نہیں مگر ان کی بارعب شخصیت کا کچھ ایسا اثر ہوتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں' اس کے بابا ہنس دیئے۔

ماہتاب عالم لالہ کے ساتھ بی ایس سی آنرز کررہے تھے اور ان دونوں میں بھی بے پناہ پیار تھا۔ ایک جان دو قالب تھے جب کہ ماہ عالم ابھی ایف ایس سی میں تھے۔ دونوں گھرانوں میں خونی تعلق نہ ہونے کے باوجود خونی تعلق سے بڑھ کر پیار تھا۔ آغا جان اور اماں بھی بہاولپور میں ہی رہتے تھے۔

وہ میٹرک میں تھی کہ ان کے گاؤں میں ایسا سانحہ ہوا جس نے اسے گاؤں سے باغی کردیا۔ وہ رسم و رواج سے نفرت کرنے لگی۔

''بابا یہ ظلم ہے آپ جرگہ کے سردار ہیں مگر آپ کا فیصلہ ظلم و زیادتی کے زمرے میں آتا ہے۔ خدارا اس نام نہاد جرگہ کو ختم کریں' عدالتوں کا کام ہے انصاف کرنا' تحقیق کرنا۔ جرگہ کے لوگ بغیر تحقیق کے فیصلے صادر کرتے ہیں' بابا آپ تو پڑھے لکھے ہیں ایک کے کیے کی سزا دوسرے کو کیوں ملنی چاہیے۔ قتل کوئی کرے اور خمیازہ ماں' بہن بیٹی کو بھرنا پڑے۔''

''بابا کی جان! تم نہیں سمجھو گی' ہم قبائلی لوگ ان رسم و رواج پر اپنی جان بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہ روایات ہمارے آباؤ اجداد کی نشانی ہیں اور میں تو جرگہ کا سردار ہوں' جو بھی فیصلہ کیا ہے ثبوت کو دیکھ کر کیا ہے۔ آفتاب نے قتل کیا ہے اور پھر غائب ہوگیا ہے تو قصاص کی صورت میں اس کی بہن کا نکاح ملک فیاض سے ہی ہوگا' یہ خون بہا ہے۔''

''لیکن بابا! ملک فیاض بڈھا کھوسٹ اور آفتاب کی بہن سدرہ ابھی ساتویں کلاس میں پڑھتی ہے' آپ کو کیا پتا وہ معصوم لڑکی...... اُف! کتنا برا حال تھا اس کا' وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی لیکن اس کے خوابوں کے قاتل آپ سب ہیں۔ وہ ساری عمر کیسے اس خاندان میں رہے گی' جہاں اسے قاتل کی بہن کے نام سے پکارا جائے گا۔ کیسے اس کی روح پر نشتر چلائے جائیں گے' آپ آفتاب کو تلاش کریں وہ مجرم ہے وہی سزا کا مستحق ہے' اس کے جرم کی سزا اس کی معصوم بہن کیوں بھگتے۔''

''ہاں بابا! میں گل لالہ کے ساتھ متفق ہوں' آغا جان بھی اس پنچایت میں شامل ہیں ان سے میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر آپ سے تو کہہ سکتی ہوں۔ آپ سب پڑھے لکھے ہونے کے باوجود عقل و شعور رکھنے کے باوجود غلط فیصلہ کرتے ہیں یہ جرگہ سسٹم ختم کریں اور عدالتیں قائم ہونی چاہیے تاکہ اصل مجرم کو سزا ملے۔''

''ارے بابا کی جانو! تم لوگ ابھی چھوٹی ہو' بس پڑھائی پر توجہ دو تم نہیں سمجھو گی کہ بعض اوقات اپنی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے کڑوا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔ ہمارے قبائلی علاقوں کی شان ہی جرگہ سے ہے' ہمیں کسی عدالت کی ضرورت نہیں' ہم خود اپنے مسائل حل

کر سکتے ہیں خود فیصلہ کر سکتے ہیں' جیسے ہمارے آباؤ اجداد کسی کے محتاج نہیں تھے اسی طرح ہمیں بھی کسی کا محتاج نہیں ہونا یہی ہماری شان ہے۔''

''نہیں بابا! یہ جھوٹی روایات ہے اگر ہمارے آباؤ اجداد غلط تھے تو ضروری نہیں کہ ہم بھی غلط کام کریں' ویسے ہم اسلام کا پرچار کرتے ہیں لیکن اسلام تو غلط اور جاہلانہ روایات کو اپنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد بتوں کے پجاری تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک خدا پر ایمان لائے اور اس پیغام کو پھیلایا۔''

''بس گل لالہ! ختم کرو اس بحث کو اب میں مزید کچھ نہیں سنوں گا۔'' اور وہ رخ عالم کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

''سچ لالہ! مجھے تو سدرہ کی شکل نہیں بھول رہی' کیسے ڈر خوف اس کے چہرے سے ہویدا تھا جیسے اسے سولی پر چڑھانے کی سزا سنائی گئی ہو۔''

''رخ سولی چڑھنا اور کسے کہتے ہیں؟ صرف منصور بن حلاج ہی سولی پر نہیں چڑھا تھا سقراط نے ہی زہر نہیں پیا تھا' ہم جیسی لڑکیوں کو بھی سولی چڑھایا جاتا ہے اور بار بار چڑھایا جاتا ہے۔ زہر ایک ہی دفعہ نہیں پلایا جاتا بلکہ گھونٹ گھونٹ' قطرہ قطرہ زہر ہمارے اندر ٹپکایا جاتا ہے اور جینے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے' موت کی بھی اجازت نہیں ملتی۔''

''بابا کو اگر اپنی بیٹی کے بارے میں ایسا فیصلہ دینا پڑے تو پھر پتا چلے کہ کیسے وہ خوابوں اور ارمانوں کا خون کرتے ہیں۔''

''ہائے گل! خدا نہ کرے کیسی باتیں کر رہی ہے۔ بابا اور آغا جان بھی تو مجبور ہیں جرگہ انہی کے دم سے قائم ہے۔ تمام لوگوں کا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے اکیلے وہ تو قصوروار نہیں ہیں ناں۔ بابا سے تو اتنی بحث کرلی توبہ کرو آغا جان سے ایک لفظ بھی بول سکیں۔''

''یار! آغا جان کیا واقعی اتنے سخت ہیں ان کا کمرہ کتنا زبردست ہے نا۔ میں تو جب لاہور گئی تھی تو کھڑکی سے دیکھا تھا شیر کی کھال کتنی زبردست لگ رہی تھی۔''

''پتا نہیں گل! آغا جان سخت ہیں یا نہیں لیکن ان سے بات کرتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے' بہت بارعب شخصیت ہے۔''

''نہیں جی' متاثر کن' اسیر کرنے والی۔ لگتا ہے اماں آغا جان کی شخصیت کی اسیر ہوگئی ہوں گی۔''

''ویسے آغا جان اماں سے بہت محبت کرتے ہیں' ایک دفعہ اماں بیمار ہوگئیں تو آغا جان سچ میں لگتا تھا جیسے سانس ان کی رک گئی ہو۔''

''اخاہ لیلیٰ مجنوں کی جوڑی......''

''اوئے خبردار جو میرے پیارے آغا جان کو مجنوں اور کالی لیلیٰ سے میری پیاری اماں جان کو ملایا۔''

''رخی! مجھے تو اب بہاولپور میں نہیں رہنا' بس میٹرک کے پیپر دینے کے بعد وہاں ہی پڑھوں گی۔ لالہ کے پاس چلی جاؤں گی۔''

''ہاں نا میں خود دونوں بھائیوں کے پاس چلی جاؤں گی۔ اماں اور آغا جان ادھر ہی رہیں' میرا تو خود ماہ عالم کے بغیر دل نہیں لگتا۔''

''بابا جان! گل لالہ اور رخ عالم کا ایڈمیشن لاہور یونیورسٹی میں کرا دیا ہے' اب انہیں ہمارے ساتھ بھیجنے کی تیاری کریں۔'' جب دونوں خاندان اکٹھے ہوئے تو بخت گل نے کہا۔

''یار تم تو ہمارے گھر کی چہکتی بلبلیں لے جاؤ گے ہم کیا کریں گے۔ یہ گھر تو بہت سونا ہو جائے گا۔''

''بابا! فکر نہ کریں ویک اینڈ پر ہم سب یہاں ہوا کریں گے۔''

یوں وہ لاہور چلی آئیں کبھی وہ آغا جان کے گھر چلی جاتی' کبھی رخ اس کی طرف چلی آتی۔

ایک دن وہ آغا جان کی طرف آئی تو سب آئے ہوئے تھے رخ کی پھوپو اور ان کی بیٹی جاناں آپی بھی خوب رونق لگی ہوئی تھی۔

''کیا تم یہاں ہی پائی جاتی ہو لالہ! کبھی اپنے گھر بھی ٹک جایا کرو' پڑھتی کب ہو تم؟''

اس نے چونک کر جاناں آپی کو دیکھا عجیب سرد اور نفرت بھری آنکھوں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اپنے لیے اتنی نفرت دیکھ کر اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو ماہتاب بھائی نے کہا۔

''جاناں! تمہیں کس بات پر اعتراض ہے لالہ اور رخ دونوں مل کر پڑھتی ہیں سو کبھی رخ ادھر چلی جاتی ہے' کبھی لالہ آجاتی ہے فرسٹ ائیر میں دونوں کی فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔''

''اوہ! ماہی آپ تو وکالت نہ کریں' میں جانتی ہوں یہ یہاں کیوں آتی ہے؟ سب سمجھتی ہوں۔''

وہ ہونق ہو کر جاناں آپی کو دیکھتی رہی' اس کی باتیں وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی' وہ کیا کہہ رہی ہیں اور کیوں کہہ رہی ہیں مگر اتنا اسے محسوس ہو چکا تھا کہ جاناں آپی کو اس کا اس گھر میں آنا سخت ناپسند ہے اس لیے اس نے رخ سے کہا۔

''اچھا رخ! میں چلتی ہوں تم رات کو چکر لگا لینا۔'' رخ اس کے ساتھ چلی آئی۔

''پلیز لالہ! مائنڈ نہ کرنا' جاناں آپی بڑی عجیب سی ہیں۔ میری تو خود ان سے نہیں بنتی۔ بھائی کے پیچھے پڑی رہتی ہیں' بخت گل بھائی سے دوستی کو سخت ناپسند کرتی ہیں' پتا نہیں کیوں انہیں پرخاش ہے۔''

''اچھا چھوڑو یار! جب تک وہ یہاں ہیں میں نہیں آؤں گی' تم آجایا کرنا۔''

سیکنڈ ائیر کے فائنل ایگزام دے کر وہ فارغ ہوئیں تو بخت لالہ اور ماہتاب بھائی بھی ایم ایس سی پارٹ ون کے ایگزام سے فارغ ہوئے۔ ماہ عالم کے پہلے سمسٹر کے ایگزام بھی ہو چکے تھے سو سب بہاولپور آگئے۔ دونوں گھرانوں کے آنگن میں رونق اتر آئی۔

تین دن بعد ایسا سانحہ ہوا جس نے دونوں گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی۔ ماہِ عالم اور بخت گل شکار کے لیے گئے دونوں میں نہ جانے کس بات پر جھگڑا ہوا کہ بخت گل نے ماہِ عالم پر گولی چلادی جس سے ماہِ عالم موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ محمد ریاض جو جاناں کا چچا زاد بھائی تھا وہ اس موقع کا گواہ تھا' اسی نے سب کو اطلاع دی۔ بخت گل نہ جانے کہاں چلا گیا' اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی یقین کرنا پڑ رہا تھا کہ بخت گل نے ہی ماہِ عالم کو مارا ہے اگر مارا نہ ہوتا تو لوٹ کر تو آتا۔ ماہتاب' آغا جان' اماں' رخ سب کی حالت بری تھی' وہ بابا جان سے پوچھ کر آغا جان کی طرف جانے لگی تو بابا نے کہا۔

''لالہ! اس وقت وہ صدمے کی حالت میں ہیں' تمہیں قاتل کی بہن سمجھیں گے۔ ابھی مت جاؤ' میں بھی نہیں گیا۔ جرگہ بلایا جا رہا ہے۔''

......☆......☆......

سردار! اب آپ کا بیٹا قاتل ہے' قتل کرنے کے بعد غائب ہے' تین دن ہوگئے ہیں وہ لوٹ کر نہیں آیا اب کیا فیصلہ کرنا ہے۔''

''جو آپ سب کا فیصلہ ہے وہی میرا فیصلہ ہوگا۔ انصاف اسی طرح کیا جائے گا جس طرح پہلے کیا جاتا رہا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے آپ کی بیٹی خون بہا کے طور پر آغا جان کے بیٹے ماہتاب کے حوالے کی جائے گی۔''

''نہیں! میں جرگہ کا یہ فیصلہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''کیوں آغا جان! وہ آپ کے دوست کی بیٹی ہے اس لیے نہیں' جب قاتل غائب ہو جاتا ہے تو پھر بہن بیٹی بھی قصاص کی صورت میں دوسرے فرد کے حوالے کی جاتی ہیں۔ آپ تو خود فیصلہ دینے والے ہیں پھر اب کیوں ہچکچاہٹ؟''

''ماہتاب عالم اس بات کے لیے راضی نہیں ہے۔''

''تو ٹھیک ہے گل لالہ کا نکاح آپ سے کر دیا جاتا ہے۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟''

”آغا جان آپ جرگہ اور اپنے قبائل کی روایات سے انحراف نہیں کر سکتے‘ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی سدرہ کا نکاح ملک فیاض سے ہوا تھا اور آج بھی قاتل قتل کرنے کے بعد غائب ہے۔“

”سردار گل! آپ چپ کیوں ہیں‘ فیصلہ سنائیں۔ آپ کی بیٹی ہے اس لیے‘ جرگہ میں سب نے آوازیں اٹھانا شروع کردیں اگر ماہتاب عالم نکاح کے لیے راضی نہیں تو پھر آغا جان......“ اور سردار گل نے آنسو بھری آنکھوں سے پہلے آغا جان کو اور پھر ماہتاب عالم کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے میں نکاح کے لیے تیار ہوں۔“

☆......☆......☆

”بابا! یہ کیسا فیصلہ ہے۔ میں...... میں...... نہیں بابا! مجھے اپنے ہاتھوں سے زمین میں دفن کردیں مگر اتنی بڑی سزا نہ سنائیں‘ میں اپنے اوپر قاتل کی بہن کا لیبل سجا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔“

”بابا کی جان میں مجبور ہوں‘ مجھے وہی فیصلہ دینا ہے جو جرگہ کے سرکردہ لوگ دیں گے‘ میں انہیں جھٹلا نہیں سکتا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اپنے بیٹے کا قصاص نہ دوں‘ نہ جانے بخت گل نے ایسا کیوں کیا‘ وہ ایک دفعہ جرگہ میں آتو جاتا۔ وہ اتنا جذباتی تو نہیں تھا کہ ایک دم سے گولی چلا دیتا۔ سب ثبوت اس کے خلاف ہیں اس کی شکاری بندوق سے گولی چلی ہے اور پھر محمد ریاض جوان کے ساتھ تھا اس نے گواہی دی ہے۔ میں کیسے ان گواہوں کو جھٹلا سکتا ہوں حالانکہ میرا دل کہتا ہے کہ میرا بیٹا قاتل نہیں ہے مگر جرگہ تو گواہ اور ثبوت دیکھتا ہے اسے دل کی گواہی سے کیا سروکار۔“

”بابا‘ اماں! میں آپ لوگوں کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی‘ قصاص میں جانے والی لڑکی کو تو پیچھے مڑ کے دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“

”لالہ آغا جان‘ آپی آمنہ‘ ماہتاب اور رخ تجھ سے بہت محبت کرتے ہیں وہ تجھے ہم سے ملنے سے نہیں روکیں گے۔ تُو پہلے بھی تو ان کے گھر جاتی رہتی ہے نا۔“

”بابا! پہلے کی بات اور تھی اب کی بات اور ہے‘ اب...... اب تو وہ مجھے قاتل کی بہن سمجھیں گے۔ وہ زبان جو کبھی پھول برساتی تھی اب نفرتوں کے تیر برسائے گی۔ بابا آپ کی بیٹی اتنی نفرتوں کو نہیں سہہ پائے گی۔“

”میری بیٹی بہت بہادر ہے۔“ اس کی اماں اور بابا کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

دوسرے دن اس کا نکاح ماہتاب عالم سے ہوگیا‘ نہ وہ دلہن بنی نہ ہاتھوں پر مہندی رچی‘ نہ دل میں کوئی ارمان جاگے۔ یوں لگا جیسے کسی مُردے کو زمین میں دفنا دیا گیا ہو۔ اس کے کانوں نے بس ایک ہی آواز سنی‘ لاہور چلنے کی تیاری کرو‘ ہمارا اب اس گاؤں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

آغا جان سمیت وہ سب اسی دن لاہور آگئے۔ رخ اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

”لالہ! ابھی تم میرے کمرے میں سو جاؤ کیونکہ ماہی بھائی کی ذہنی حالت خراب ہے وہ کسی رشتے کو قبول نہیں کر پا رہے۔ تھوڑا وقت کا انتظار کرو‘ اللہ بہتر کرے گا۔“

”رخ! اللہ کیا بہتر کرے گا‘ اماں کی آنکھوں میں میرے لیے بہت نفرت ہے۔ آغا جان گم صم ہیں اور ماہتاب بھا...... پلیز اب ان کا تم سے نکاح ہوچکا ہے‘ بھائی کا لفظ بھول جاؤ۔“

”ہاں انہوں نے تو ماہ عالم کی میت پر قسم کھائی ہے کہ وہ قاتلوں سے ایسا انتقام لیں گے ان کی روحیں سسک سسک کر اس دنیا سے رخصت ہوں گی۔ رخ! میں اتنی ساری نفرتیں نہیں سہہ پاؤں گی‘ اپنے بھائی سے کہنا مجھے ایک ہی دفعہ ماہِ عالم کے پاس پہنچا دیں۔“

”ارے پاگل ہوگئی ہو میرا دل کہتا ہے کہ بخت لالہ نے قتل نہیں کیا۔ پتا نہیں کیا سازش ہوئی ہے ماہی بھائی اور آغا جان بھی بخت لالہ کو قاتل ماننے پر تیار نہیں مگر

بظاہر سارے ثبوت ان کے خلاف ہیں اور وہ خود بھی نہ جانے کہاں غائب ہیں۔“

وہ ساری رات جاگتی رہی اس گھر میں میرا کیا مقام ہے؟ صبح اسے اپنے مقام کا پتا چلا۔

”اٹھو! یہاں تم عیش کرنے نہیں آئیں‘ ناشتہ بناؤ اور سارے گھر کا کام کروگی۔“

”اماں...... اماں کیا ہوگیا ہے آپ کو؟“

”میرے معاملے میں کوئی بات نہیں کرے گا‘ یہ میرے بیٹے کے قاتل کی بہن ہے‘ میں اسے معاف نہیں کروں گی اور ماہتاب کو بلاؤ۔“

”اماں...... اماں ماہتاب بھائی گھر پر نہیں ہیں وہ کہیں چلے گئے ہیں‘ کہاں...... کچھ پتا نہیں۔ بس یہ صرف اتنا لکھ کر گئے ہیں کہ میں گھر چھوڑ کر جارہا ہوں‘ مجھے تلاش نہ کیا جائے۔ میں خود ہی لوٹ آؤں گا۔“

”ہائے کلموہی...... منحوس! تیرے بھائی نے میرے ایک بیٹے کو کھالیا اور تیرے سبز قدموں نے میرے دوسرے بیٹے کو نگل لیا۔“ انہوں نے لالہ پر مکے برسانے شروع کردیئے۔

”آمنہ! یہ کیا ہورہا ہے؟ چھوڑ دو بچی کو‘ جاؤ رخ! اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔“

☆......☆......☆

اور پھر دس سال دس صدیوں پر محیط ہوگئے۔ صرف رخ کا سہارا تھا جس کی محبت ہمیشہ پہلے دن کی طرح تروتازہ رہی۔ اماں نے صرف نفرتوں کے تازیانے برسائے اور آغا جان تو بالکل خاموش ہوگئے۔ رخ نے اسے کالج جوائن کرنے کے لیے کہا مگر دل مردہ ہوچکا تھا‘ کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی۔ بابا اور اماں نے بھی رابطہ نہ کیا وہ سب کے لیے زندہ ہوتے ہوئے بھی مرگئی۔ وہ ہنسی اور قہقہے جن سے کبھی آنگن گونجتا تھا اب اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی۔ کبھی کبھی اسے لگتا جیسے وہ مردہ ہے۔ رخ کی شادی ہوگئی اماں کے انتقال کے بعد تو وہ بالکل ہی گم صم ہوگئی۔

اماں چاہے کوستیں‘ بددعائیں دیتیں مگر گھر میں ان کی آواز تو گونجتی تھی۔ آغا جان اپنے کمرے اور وہ اپنے کمرے میں کسی روح کی مانند چکراتی رہتی۔ مؤذن کی اذان اسے حال میں کھینچ لائی۔

اب زندگی کا ایک نیا امتحان‘ اب نہ جانے میرے ساتھ کیا ہوگا؟ لان میں آغا جان کی آواز گونجنے لگی۔

”یہ پودوں کو ٹھیک کرو‘ جلدی کرو۔ شام تک سب مہمان آرہے ہیں اور سنو! گل لالہ سے کہو تمام کمروں کی سیٹنگ تبدیل کرائے‘ پردے بھی تبدیل کرائے۔ تمام ملازمین کو بلاؤ‘ دایہ سعدیہ کھانا اپنی نگرانی میں بنوانا۔ دس سالوں بعد میرا بیٹا لوٹا ہے‘ وہ کمرے میں بیٹھی آغا جان کی خوشی سے سرشار آواز سن رہی تھی۔

☆......☆......☆

لان نئے سرے سے پھولوں سے مہک اٹھا‘ آغا جان نے نہ جانے کہاں کہاں سے گملے منگوائے تھے۔ کچن سے اشتہا انگیز کھانوں کی مہک آرہی تھی‘ اسے نہ خوشی کا احساس تھا نہ دکھ کا‘ عجیب سی کیفیت تھی جب رخ نے اسے کہا۔

”لالہ! آج میرا ماہی بھائی آرہا ہے اس کے استقبال کی تیاری کرو‘ جیسے ہی مجھے آغا جان نے اطلاع دی میں نے میرب سے کہہ کر سیٹ بک کرائی۔ دل چاہ رہا تھا اڑ کر پہنچ جاؤں‘ دیکھو آج آغا جان کیسے جوان لگ رہے ہیں۔ رات آٹھ بجے تک سب پہنچ رہے ہیں۔ اٹھو نا یار! اچھا سا سوٹ پہنو۔“

”رخ! میرے پاس کوئی سوٹ نہیں ہے بس یہی گنتی کے چند جوڑے زندگی گزارنی ہو تو چند جوڑوں میں گزر جاتی ہے اور میری زندگی بھی گزر رہی ہے کس کے لیے نئے سوٹ لیتی‘ کس کے لیے بجتی سنورتی۔ جب سجنے سنورنے کی عمر تھی وہ تو گزر گئی‘ اب چھوڑو ایک قاتل کی بہن کیا اپنے مجازی خدا کا سواگت کرے گی بس یوں ہی رہنے دو‘ ویسے بھی اب تو جذبوں پر ایسی برف جمی ہے کہ مجھے کچھ بھی احساس نہیں ہے کہ میرے اردگرد کیا ہورہا

ہے۔ نہ مجھے کسی سے کوئی دلچسپی ہے بس سانس کی آمدورفت ہے نہ جانے کب سانس بند ہوجائے اور جسم و جاں کا رشتہ ٹوٹ جائے۔"

"خدا نہ کرے لالہ! ایسی باتیں نہ کرو' اللہ تمہیں سلامت رکھے۔"

☆......☆......☆

"بابا کی جان' کہاں ہے آغا جان میرے آنگن کا تارا کدھر ہے' اسے بابا کی آواز سنائی دی اور وہ بے اختیار ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی۔

بابا...... اماں...... بخت لالہ اور ماہتاب!

"بخت لالہ! آپ کہاں چلے گئے تھے اور...... اور یہ آپ کو کیا ہوا؟ سرخ و سفید صحت مند بخت لالہ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ وہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

"لالہ میری جان! تمہیں میری وجہ سے سزا ملی پر میں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔"

"آغا جان! میرا دل کہتا تھا کہ میرا بیٹا بے گناہ ہے اور میں اس وقت ہی اپنے دوست کے پاس جاؤں گا جب سرخرو ہوں گا اس کے سامنے۔" بابا نے بے اختیار آغا جان کو گلے لگایا۔

"گل خان...... میرے دل نے بھی تو گواہی دی تھی۔ بخت بیٹا جو سانس بھی لیتا ہے تو ماہتاب سے پوچھ کر وہ کیسے ماہ عالم کو قتل کرسکتا ہے جب کہ ہم سب کی جان تو ماہ عالم میں تھی لیکن شاید اس سانحہ کو اسی طرح رونما ہونا تھا مجھے ماہتاب نے سب کچھ بتادیا ہے۔" آغا جان بابا کے گلے لگ کر رو پڑے۔ "دیکھ نا تیری بھابی بھی چھوڑ گئی مجھے تنہا کرگئی۔ اس نے آغا جان کو آج اس طرح بلک بلک کر روتے دیکھا کہ آغا جان کبھی اس کے سامنے نہ روئے تھے۔ برسوں کا غبار آج آنسوؤں کی صورت بہہ نکلا تھا۔

وہ تو بخت لالہ کو دیکھے جارہی تھی۔

"لالہ! اپنے بابا اور اماں سے نہیں ملوگی؟"

بابا نے اسے اپنی باہوں میں بھرلیا مگر اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ بے حسی سی طاری تھی اس پر۔

"آغا جان! میری لالہ ایسی تو نہ تھی۔" اماں نے بے اختیار اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"اماں! میں ٹھیک ہوں' آغا جان نے میرا بہت خیال رکھا ہے بس مجھے لالہ کے بارے میں بتائیں یہ کہاں چلے گئے تھے' کیوں چلے گئے تھے؟"

"میری گڑیا! میری جان یہ سب باتیں تمہیں ماہتاب بتائے گا اسی نے تمہارے لالہ کو تلاش کیا ہے۔"

"بابا جان! آغا جان پرانی باتیں چھوڑیں' چلیں کھانا کھائیں۔ میں نے دسترخوان سجادیا ہے آج سالوں بعد تو اکٹھے ہونے کا موقع ملا ہے۔ کل کو بھولیں آج کو یاد رکھیں کیوں میرے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔"

"بالکل جی! ہماری بیگم کبھی غلط کہہ ہی نہیں سکتیں۔"

"پاپا جانی! ابھی کل ہی تو آپ ماما سے کہہ رہے تھے کبھی تو سیدھی بات کرلیا کرو۔"

"دیکھا پول کھول دیا نا' آپ کے لاڈلے نے۔" اس نے واصف کو آغا جان کے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

رات گئے وہ اس کے کمرے میں آیا۔

"گل لالہ! میں تمہارا مجرم ہوں یا شاید ہم سب مجرم ہیں یا ہم میں سے کوئی بھی مجرم نہیں ہے شاید اس طرح تقدیر نے لکھا تھا اور ہونی کو تو کوئی بھی ٹال نہیں سکتا۔ کیا دس سالوں کی داستان سنوگی؟"

"اگر آپ سنانا چاہتے ہیں تو سنادیں۔"

"تمہاری کوئی مرضی نہیں ہے؟"

"میری مرضی...... قصاص اور خون بہا میں آنے والی لڑکی کی کوئی مرضی نہیں ہوتی ہے وہ تو بس سزا ہوتی ہے۔"

"گل لالہ! ایسا تو نہ کہو' تم سزا نہیں بلکہ کسی دل کی آرزو بن کر آئی تھیں مگر......" اس نے چونک کر ماہتاب کو دیکھا۔

"جس جذبے کو میں نے اپنے آپ سے بھی چھپا کر

رکھا ہے۔ جانے اس کی خبر جاناں کو کیسے ہوگئی شاید محبت کرنے والے کو خود بہ خود آگہی حاصل ہوتی ہے۔ میں کسی اور سے محبت کرتا تھا اور جاناں مجھ سے...... جب جاناں نے اپنی محبت کا واسطہ دیا اور کہا میں نے بچپن ہی سے تمہارے خواب دیکھے ہیں کیونکہ امی نے بچپن ہی سے مجھے کہا تھا کہ تم ماہتاب کی دلہن بنوگی۔"

"تو میں نے اسے سختی سے کہہ دیا کہ یہ پھوپو کی غلطی ہے میری نہیں۔ میں اسے صرف کزن سمجھتا ہوں اس کے علاوہ کچھ نہیں اور جہاں تک شادی کا تعلق ہے تو میں اسی سے شادی کروں گا جس نے مجھے اسیر کیا ہے۔"

"جاناں پر میری کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ وہ ہر قدم پر مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتی رہی اور میں ہر قدم پر اسے ریجکٹ کرتا رہا۔ جاناں! محبت ایک بے اختیار جذبہ ہے' محبت کی نہیں جاتی' ہوجاتی ہے اور ہوجانے والے جذبے کو ہم کر نہیں سکتے۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو اس لیے وقت ضائع نہ کرو۔ میں نے اسے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل میں میری محبت کے خلاف زہر بھرتا جارہا ہے اور وہ ایک زہریلی ناگن کا روپ اختیار کررہی ہے جو صرف ڈستی ہے اور ڈسنے کے بعد تڑپنے کا نظارہ کرتی ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ جب اندھے انتقام پر اترتی ہے تو کسی رشتے کو خاطر میں نہیں لاتی۔ جاناں نے بھی کچھ ایسی ہی پلاننگ کی تھی اس نے مجھ سے میری محبت چھیننے کے چکر میں میرا بھائی مجھ سے چھین لیا۔ اس کی پلاننگ ہی الٹی ہوگئی تقدیر نے ہماری قسمتوں میں کچھ اور ہی رقم کر رکھا تھا۔

اس نے پلاننگ کی تھی کہ ماہ عالم کو اغوا کرا کر قید رکھے گی اور ماہِ عالم کی گن سے بخت کو قتل کرادے گی۔ اس طرح جب ماہ عالم حاضر نہیں ہوگا تو قصاص کی صورت میں رخ کا نکاح عالم چچا سے کردیا جائے گا۔ روایات کے مطابق اور یوں دونوں خاندانوں میں ہمیشہ کے لیے دشمنی ہوجائے گی اور اگر آغا جان میری آرزو پوری کرنے کے لیے تمہارا رشتہ مانگیں گے تو یہ رشتہ نہیں ہوگا اور یوں میں اپنی محبت سے محروم ہوجاؤں گا اور جاناں کی شادی مجھ سے ہوجائے گی مگر ہوا سب کچھ الٹ' اس کے چچازاد اور ریاض نے ماہ عالم کو قتل کردیا اور بخت گل کو اغوا کرکے اپنے ساتھ لے گئے یوں قصاص کی صورت میں تم میری زندگی میں آگئیں۔ جب جاناں کو یہ پتا چلا تو پاگل ہوگئی وہ تو تمہیں مجھ سے دور کرنا چاہتی تھی مگر تقدیر نے تمہیں ہی میری زندگی کا ساتھی بنادیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ میں محبت پاکر بھی تشنہ رہا وہ جو کہتے ہیں نا کہ محبت کے تین پہر ہوتے ہیں پہلا پہر تشنگی کا جب انسان محبت سے دور ہوتا ہے دوسرا پہر سیرابی کا ہے جب انسان محبت پالیتا ہے تو اس کی روح سیراب ہوجاتی ہے اور تیسرا پہر پھر تشنگی کا جب انسان محبت کھودیتا ہے یا پھر کھودینے کا دھڑکا لگا رہتا ہے پھر روح سیراب نہیں ہوتی بلکہ تشنہ سے تشنہ تر ہوجاتی ہے اور میں نے محبت کو پا بھی لیا مگر سیرابی میرا مقدر نہ بن سکی اس لیے کہ میں نے ماہ عالم کی میت پر قسم کھائی تھی کہ جب تک اس کا قاتل پکڑا نہیں جاتا مجھ پر ہر خوشی حرام ہے اور اس لیے میں تمہیں دیکھے بغیر یہاں سے چلا گیا کیونکہ اگر تمہیں دیکھ لیتا تو پھر میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑجاتیں۔

میں ڈھونڈتا رہا قاتل کو بھی اور بخت گل کو بھی کیونکہ میرا دل کہتا تھا کہ بخت گل قاتل نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی کی سازش ہے مگر جاناں کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا کہ آستین کا سانپ میری پھوپو زاد ہوگی۔ میں نے جنگلوں کی خاک چھانی' شہروں میں دربدر پھرتا رہا' صحرانوردی کرتا رہا۔ پہاڑوں میں پھرتا رہا مگر نہ قاتل ملا اور نہ ہی بخت گل۔ میں نے کبھی کسی سے رابطہ نہ کیا' یہاں تک کہ اماں کے اس دنیا سے چلے جانے کا بھی پتا نہ چلا' میں اپنی ماں کو بھی آخری بار نہ دیکھ سکا۔ کتنا بدنصیب ہوں میں' ایک بیٹا خدا کے پاس چلا گیا اور میں جیتے جی اپنے خاندان کے لیے مرگیا کئی دفعہ سوچا کہ

لوٹ جاؤں مگر ہر بار ماہِ عالم کی سوال کرتی آنکھیں نظر آتیں۔ بھیا میرے قاتل کو نہیں پکڑو گے ایک مہینہ پہلے میں رات کے اندھیرے میں بہاولپور آیا تو میں نے ملک ریاض کو آدھی رات کے وقت جاناں کے ساتھ دیکھا' دونوں چپکے چپکے پہاڑوں کی طرف جارہے تھے۔ میں یونہی بغیر سوچے سمجھے ان کے پیچھے چل پڑا' وہ دونوں ایک غار میں چلے گئے جس کا منہ پتھر سے بند تھا۔ میں غار کے باہر چھپ گیا وہ دونوں واپس گاؤں کی طرف گئے تو میں غار کے اندر گیا تو دیکھا بخت گل زنجیروں میں قید دنیا سے بے خبر پڑا تھا۔ برسوں کا مریض' مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ سب کیا ہے اور بخت گل کو جاناں اور ریاض نے کیوں قید کر رکھا ہے۔ میں وہاں سے نکلا اور رات کے اندھیرے میں گل چچا سے ملا' انہیں ساری بات بتائی انہیں بھی کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے اگر بخت گل نے ماہ عالم کو قتل کیا ہے تو ان دونوں نے اسے جرگے کے سامنے پیش کرنے کے بجائے قید کیوں کر رکھا ہے۔ گل چچا نے جرگے کے سرکردہ لوگوں سے بات چیت کی اور پھر تین چار دن کے بعد جب رات کے اندھیرے میں جاناں اور ریاض غار میں گئے تو ہم سب بھی ان کے پیچھے داخل ہوگئے پھر ریاض نے ساری بات بتادی کہ اس نے یہ قتل صرف جاناں کو پانے کے لیے کیا تھا' جاناں نے اسے کہا تھا کہ اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں یہ کام کرنا ہوگا ورنہ نہیں لیکن اس سے غلطی یہ ہوگئی کہ اس نے گن غلط اٹھالی۔ ماہ عالم کی بجائے بخت گل کی گن سے جب اس نے فائرنگ کی تو اچانک ماہ گل سامنے آیا اور بخت گل کے بجائے ماہ گل ہلاک ہوگیا تو اس نے بخت گل کو بے ہوش کرکے اپنے دوست کے گھر میں رکھا جو یہاں سے چلے گئے ہیں مگر آبائی گھر کی چابی اسے دے کر گئے تھے چونکہ گھر بند پڑا تھا اگر میں آتا تو لوگوں کو شک ہوجاتا اس لیے پھر میں نے پہاڑوں میں غار تلاش کیا اور رات کے اندھیرے بخت گل کو یہاں زنجیروں سے باندھ دیا اور مسکن آور دوا دے کر اسے سارا دن سلاتے' رات کو ڈرپ کے ذریعے خوراک دیتے۔ جرگے نے دونوں کو موت کی سزا کا حکم دیا اور ہم نے بخت گل کو اسپتال داخل کرادیا۔ اس کا علاج ہوتا رہا مگر ہم نے کسی کو بھی اطلاع نہ دی کہ علاج کے بعد ہی سب کو اطلاع دیں گے۔ اب بخت گل کی حالت کچھ بہتر ہوئی ہے تو میں نے آغا جان کو فون کرکے بتادیا اور اب تمہارے سامنے ہوں۔ دیکھو گل لالہ! ہمارا ملن قدرت نے یوں ہی لکھا تھا' تم میری زندگی کی اور اولین آرزو اور خوشی ہو' مجھے نہیں پتا کہ میرے دل میں کیسے تمہاری محبت نے گھر کیا مگر......''

''اتنی حیران ہو کر نہ دیکھو میں جانتا ہوں کہ تمہیں میرے کسی جذبے کی خبر نہیں حالانکہ کہا جاتا ہے کہ محبوب کو خبر ہوجاتی ہے چاہے کسی اور کو ہو نہ ہو مگر یہاں دشمنوں کو خبر ہوگئی مگر اس کو خبر نہ ہوئی جسے خبر ہونی چاہیے تھی۔''

''گل لالہ! میں تمہارے دس سال تو نہیں لوٹا سکتا مگر کوشش کروں گا کہ تم ان دس سالوں کی اذیتوں کو بھول جاؤ۔ اتنی محبت اور اتنی چاہت دوں گا کہ تمہیں صرف آنے والا کل اور حال یاد رہے۔''

اور گل لالہ نے دیکھا کہ ماہتاب کی آنکھوں میں محبت کی قندیلیں روشن تھیں۔ اپنی قندیلیں جس کی روشنی اسے تابناک حال اور مستقبل کی خبر دے رہی تھی' اس کی اذیتوں کا ازالہ ہوجانے کی نوید...... اس نے سرشاری سے اپنی نگاہیں جھکادیں۔

☐

چھوٹی زندگی

انجم سہنوانی

یہ زندگی اک سرائے ہے اک کمرہ امتحان' اور اس امتحان کا ممتحن اللہ تعالیٰ ہے جو اپنے بندوں کو عقل و شعور دے کر آزماتا ہے کہ آیا وہ اس کے شکر گزار بنتے ہیں یا ابلیس کے پیروکار۔ وہ کسی کو اپنی نعمتیں دے کر آزاد چھوڑتا ہے تو کسی کو ان سے دور رکھ کر اس کے صبر کو دیکھتا ہے۔
حالات کی ماری ایک دوشیزہ کا احوال' وہ معاشرہ کے لیے امتحان بن گئی۔

حالات کے ماروں کے لیے ایک رہنما مگر سچی تحریر

ریلوے اسٹیشن پر مجسٹریٹ چیکنگ ہو رہی تھی۔ ٹی ٹی بہت سے لوگوں کو پکڑ کر لایا تھا جن کی ایف آئی آر درج کی جارہی تھی۔ ان لوگوں میں ایک لڑکی بھی تھی' اس کے پھٹے پرانے کپڑے بمشکل اس کے بدن کو ڈھانپ پارہے تھے۔ اس کی حالت ایک بھکارن سے بھی بدتر تھی اور اس کے بدن سے ایسی بدبو اٹھ رہی تھی کہ اس کے پاس کھڑا ہونا بھی دشوار تھا' ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مہینوں سے نہائی بھی نہیں تھی۔

اس کی ایف آئی آر لکھتے ہوئے ریلوے مجسٹریٹ نے پوچھا۔ ''بتا بغیر ٹکٹ سفر کیوں کر رہی تھی؟''

اس نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ ''صاحب لاہور آنا تھا۔''

''لاہور کیوں آنا تھا اور تمہارا گھر کہاں ہے۔''

اس بار ریلوے مجسٹریٹ نے ذرا غصے سے پوچھا۔

وہ لڑکی ہاتھ جوڑ کر ملتجی لہجے میں بولی۔ ''صاحب کیوں جلے پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ آپ نے مجھے بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے ہوئے پکڑا ہے جو کارروائی کرنا ہے آپ کرو۔ لیکن مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔''

اس بار ریلوے مجسٹریٹ نے کچھ جھلاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو میرا وقت برباد مت کرو۔ فٹافٹ بتادو کہ تمہارا گھر کہاں ہے' تمہارے باپ کا کیا نام ہے اور بھی جتنا کچھ بتانا چاہتی ہو' بتادو۔''

اس لڑکی کو لگ رہا تھا کہ جب تک وہ کچھ بتائے گی نہیں ریلوے مجسٹریٹ اسے نہیں چھوڑے گا تو اس نے ایک گہری سانس لے کر بولنا شروع کیا۔

''صاحب میرا نام نازو ہے میں سیالکوٹ سے آگے ایک گاؤں کی رہنے والی ہوں اور میرے باپ کا نام امام دین تھا' وہ ۱۹۹۹ء میں کارگل میں شہید ہوگئے تھے ان کی شہادت کے بعد حکومت کی جانب سے معاوضے کے طور پر ہمارے خاندان کو دس لاکھ روپے کا چیک ملا تھا میرے خاندان میں میری ماں کے علاوہ میرا ایک چھوٹا بھائی تھا ابا جی کی شہادت کے بعد اماں نے خود کو سنبھالا اور ہم دونوں بچوں کی پرورش میں لگ گئی۔

لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ جب دن خراب چل رہے ہوں تو کچھ بھی اچھا نہیں ہوتا' ویسے ہی کچھ

ہم لوگوں کے ساتھ بھی ہوا۔

ایک دن اماں حکومت کی جانب سے معاوضے کے طور پر ملنے والے دس لاکھ روپے کے چیک کو کیش کروا کر واپس گھر آ رہی تھی کہ راستے میں کچھ ڈکیتوں نے وہ رقم چھین لی اور چلتے بنے اماں ان کی اس حرکت پر کھڑی روتی رہی لیکن کچھ کر نہ سکی۔

حالانکہ یہ رقم اماں کے شوہر کا نعم البدل نہیں تھی، لیکن وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ اب وہ اپنے شہید شوہر کے بچوں کی پرورش کیسے کرے گی۔

میری ماں بہت ہمت والی عورت تھی صاحب اس نے ان حالات میں بھی خود کو گرنے نہیں دیا اور اب اس کا ایک ہی کام ہوتا تھا کہ دن رات بیلوں کی طرح کھیتوں میں کام کرتے رہنا اور ہم دونوں بہن بھائی کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے پڑوس کے گھروں میں بھی کچھ کام کر لیا کرتی تھی۔

ہم ایسے ہی اپنی زندگی گزارتے رہے سچ کہتے ہیں کہ کسی کے جانے سے زندگی کا سفر تھم نہیں جاتا' اب ماں اپنی محنت سے اور ہماری تھوڑی بہت مدد کے سہارے اس گھر میں زندگی کے سفر کو جاری رکھے ہوئے تھی۔''

ریلوے مجسٹریٹ' ٹی ٹی' سپاہی اور کچھ لوگ اب اس کی بات کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔

نازو تھوڑی دیر خاموش رہی پھر کھنکار کر اپنے گلے کو صاف کرتے ہوئے آگے بولنے لگی۔

''آج ابا جی کی شہادت کو لگ بھگ تیرہ چودہ برس ہو رہے ہیں' اماں جی کے مطابق میری شادی کی عمر ہو گئی تھی اب اسے یہ فکر کھانے لگی تھی کہ مجھ غریب کی بیٹی سے کون شادی کرے گا لیکن میری ماں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ہی اس نے اس فکر کو جان کا روگ بنایا۔

اب وہ میرے لیے رشتہ تلاش کرنے میں لگ گئی اور اس میں کامیاب بھی ہو گئی ہمارے گاؤں سے دور کے ایک گاؤں میں سرور نام کے ایک بندے سے میری شادی طے کر دی گئی لڑکے والوں نے جو بھی مطالبہ رکھا تھا اس کو پورا کرنے کے لیے اماں نے اپنے سارے کھیت بیچ دیئے اسے اپنی بیٹی کی خوشی سے زیادہ کچھ بھی عزیز نہیں تھا ادھر ماں ساری تیاریاں کر چکی تھی کہ ایسے میں انہیں لڑکے والوں کی طرف سے ایک خط ملا اس میں جانے کیا لکھا تھا کہ ماں کا چہرہ ایک دم بے رونق سا ہو گیا ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے بدن سے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو وہ ایک زندہ لاش کی طرح ہکا بکا کھڑی رہی تھی۔

مگر انہوں نے پھر خود کو سنبھالا اور میرے سسرالی گاؤں جا کر میرے ہونے والے سسر کے سامنے بلک بلک کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ایسا نہ کریں نہیں تو ہم برباد ہو جائیں گے ہم کہیں منہ دکھانے لائق نہیں رہیں گے میں نے آپ کے مطالبات پورے کرنے کے لیے اپنی زندگی کی ساری کمائی لگا دی ہے اب میری اتنی حیثیت نہیں ہے کہ لڑکے کو ایک موٹر سائیکل بھی دے سکوں۔''

انہوں نے میری ماں سے کہا۔ ''دیکھو بھئی پہلے میرا لڑکا کچھ نہیں کرتا تھا اب وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے اگر تم یہ رشتہ توڑ دو گی تو میرے بیٹے کو دوسری دلہن نہیں ملے گی کیا جھکنا تو تمہیں ہے اور فیصلہ بھی تم کو ہی کرنا ہے ہاں ایک بات اور' بارات میں کافی لوگ ہوں گے' ان کی خاطر

داری میں کوئی کمی نہیں آنی چاہئے۔''

اتنا سن کر میری ماں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا انہوں نے اپنے ہونے والے سمدھی کے پیر پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ظلم نہ کریں میں موٹر سائیکل تو نہیں دے سکوں گی لیکن باراتیوں کے لیے مجھ سے جو بن پڑے گا ضرور کروں گی مگر اس غریب بیوہ پر تھوڑا رحم کریں۔''

لیکن انہوں نے ماں کی ایک نہ سنی اور اپنا آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم میرے بیٹے کی موٹر سائیکل والی خواہش کو پورا کر سکتی ہو تو ہم بارات لے کر آئیں گے' نہیں تو تم کہیں اور دیکھو۔''

ماں نے جاتے جاتے ان سے بس اتنا ہی کہا۔ ''صاحب میں باراتیوں کی خاطر مدارت کا پورا خیال رکھوں گی اور آپ لوگوں کا انتظار کروں گی۔''

آخر وہ منحوس دن بھی آ گیا میری شادی کا دن تیاری پوری تھی لیکن بارات ہمارے گھر کے دروازے تک نہیں آئی انتظار کرتے کرتے پوری رات گزر گئی اور سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا ماں کا حال یہ ہو رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی کہ اب میری بچی سے شادی کون کرے گا اتنا کہہ کر ماں وہیں زمین پر گر گئی اور پھر کبھی نہ جاگنے والی نیند میں سو گئی۔

کچھ سال پہلے ہمارے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا اور اب جب ہم ایک خوشی کے منتظر تھے' مگر لگتا تھا کہ قدرت کو ہماری یہ خوشی منظور نہیں تھی اور ہماری ماں بھی ہم سے چھن گئی۔

میرا چھوٹا بھائی ماں کے مردہ بدن سے لپٹ کر رو رہا تھا میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا' اب میں کیا کروں؟''

اتنا کہہ کر وہ لڑکی پھر چپ ہو گئی اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسوؤں کی دھارا ایسے بہہ رہی تھی جیسے اب کبھی رکے گی نہیں اب اس کے آس پاس کافی بھیڑ جمع ہو چکی تھی مگر سب خاموشی کے ساتھ اس کی داستان سن رہے تھے لڑکی کو ان سے کسی سے کوئی مطلب نہیں تھا وہ تو بس روئے جا رہی تھی۔

اب ریلوے مجسٹریٹ صاحب بھی کافی نرم ہو کر اس کی باتیں سن رہے تھے' اور ان کی سخت آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں۔ لڑکی کو چپ ہوتا دیکھ کر انہوں نے رندھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آگے کیا ہوا بیٹا۔''

ریلوے مجسٹریٹ کی آواز سن کر وہ لڑکی اپنی سوچ سے باہر آ گئی اور پھر لمبی سانس لے کر بولنے لگی۔ ''ہم بھائی بہن بے سدھ اپنی ماں کے مردہ بدن سے لپٹ کر روئے جا رہے تھے اور ہمارے رونے کی آوازیں جب آس پڑوس کے گھروں میں پہنچیں تو انہیں معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ کیا اندھیر ہو گیا ہے۔ گاؤں والوں نے مل ملا کر ماں کے کفن دفن کا بندوبست کیا۔''

یہ بتاتے ہوئے نازو کے چہرے پر درد کی پرچھائیاں صاف دیکھی جا سکتی تھیں اسی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بدقسمتی کے کن اندھیروں میں گم ہے اور اس نے اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں ہی وقت کے ظالم تھپیڑوں کو کیسے سہا ہے۔

''ماں کے مرنے کے بعد ہم دونوں بھائی بہن کی تو ایسی حالت تھی کہ کئی دنوں تک بنا کچھ کھائے پیئے روئے جا رہے تھے محلے دار ہمیں زبردستی کچھ کھلا پلا دیتے اور بڑی بوڑھیوں نے

ہمیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ زندگی ہے' اس میں سب کچھ ممکن ہے تم دونوں خود کو سنبھالو' لیکن ہم دونوں پر ان کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہورہا تھا' کہاوت ہے نا کہ انسان کتنے بھی بڑے غم سے دوچار ہو وقت اس کا مرہم بن جاتا ہے اور باقی چیزوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے انسان اپنے پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہوجاتا ہے یہ پیٹ بہت ظالم ہے صاحب ہم کتنے دکھی ہیں' ہمارے ساتھ کیا قیامت گزر گئی ہے' کیسے ہماری دنیا اجڑ گئی ہے' اس پاپی پیٹ کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا' اسے تو اپنا دوزخ بھرنا ہوتا ہے' اور اس کے بھرنے کے چکر میں انسان کو اپنا ہر غم' ہر دکھ بھولنا پڑتا ہے۔

مجھے اپنی فکر نہیں تھی' مگر جب میں اپنے چھوٹے بھائی کا چہرہ دیکھتی تو سوچتی کہ اب اس کا دنیا میں میرے علاوہ اور کون ہے اگر ایسا ہی چلتا رہا تو' میں اپنی ماں تو کھو ہی چکی تھی' اپنے چھوٹے بھائی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے پھر میں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ اپنے لیے نہ سہی لیکن اپنے بھائی کے لیے میں ساری دنیا سے لڑ پڑوں گی۔''

اب ہم دونوں معمول کی زندگی جینے کی کوشش کررہے تھے ہم پورا دن دوسروں کے کھیتوں میں کام کرتے رہتے' ہم جی تو رہے تھے' لیکن اب وہ پہلے والی زندگی خام خیال بن چکی تھی' کبھی کبھی تو ہمارے پاس کھانے کے نام پر صرف پانی ہی ہوتا تھا ان حالات میں بھی ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے تھے لیکن قسمت کو شاید ہماری یہ چھوٹی سی خوشی بھی پسند نہیں تھی۔ اسی دوران ایک اور حادثہ ہوگیا۔

اس رات ایسی برسات برسی جیسی ہم نے زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی اور لگ رہا تھا کہ جیسے آسمان سے برسنے والا یہ پانی اب اس وقت تک نہیں رکے گا جب تک پوری زمین کو جل تھل نہ کردے اس تیز بارش کی وجہ سے دریا میں سخت سیلابی ریلا ابھر کر آیا تھا' کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ پڑوسی ملک کی شرارت تھی کہ انہوں نے اپنی زمینوں کو محفوظ رکھنے کے لیے سیلاب کا رخ ہمارے ملک کی طرف موڑ دیا تھا۔ جو بھی تھا ہمارے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا دریا کنارے گاؤں والوں کا بنایا ہوا بند اس طوفانی سیلاب کو روکنے میں ناکام ہوگیا اور پانی چنگھاڑتا ہوا ہر طرف پھیل کر تباہی پھیلانے لگا تھا چار سو بھگدڑ مچی ہوئی تھی ہر چیز تنکے کی طرح اس پانی میں بہتی جارہی تھی اور ماں باپ کے گزرنے کے بعد چھوٹا بھائی جو میرے جینے کا واحد سہارا اور آسرا تھا' وہ بھی اس سیلابی ریلے کی نذر ہوگیا۔

کچھ فوجی رضا کاروں نے کئی اور لوگوں کی طرح مجھے بھی بچا کر ایک امدادی کیمپ میں پہنچا دیا میں وہاں اپنے بھائی کو بہت ڈھونڈتی رہی کہ شاید وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر یہاں پہنچ گیا ہو لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

پھر جیسا کہ ہوتا ہے وہ سیلابی ریلہ گزر گیا اور اپنے پیچھے غموں اور دکھوں کی ان کہی کہانیاں چھوڑ گیا انسان پھر انسان ہے وہ پھر جینے کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے میں بھی کبھی بھیک مانگ کر اور کبھی کسی کے کھیت میں کام کرکے اپنی پاگلوں جیسی زندگی گزارنے لگی۔

وقت یونہی گزرتا رہا اور پھر ۲۰۰۸ء کا سال آ گیا پورے ملک میں الیکشن کا واویلا مچا ہوا تھا۔

سیاسی کارکن اور رہنما ہمارے گاؤں میں بھی آ کر اپنی اپنی خوبیاں بتانے لگے اسی دوران ایک رہنما کی نظر مجھ پر پڑ گئی اس نے لوگوں سے پتہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ بیچاری قسمت کی ماری ہے اور اپنا پورا خاندان کھو کر دنیا میں اکیلی رہ گئی ہے۔

وہ رہنما مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا کہ ہم عوامی خادم ہیں اور عوام کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے تم میرے ساتھ لاہور چلو وہاں میں تمہیں اپنے لیڈر سے ملواؤں گا اور تم کو تمہارے سارے نقصان کا معاوضہ دلواؤں گا تمہیں رہنے کے لیے گھر بنوا کر دوں گا' گاؤں والوں کو سمجھا بجھا کر وہ رہنما مجھے لاہور لے آیا پہلے تو وہ مجھے اس آفس سے اس آفس میں گھماتا رہا اور موبائل پر جانے کیا کیا گٹ پٹ کرکے ملتان کی ایک طوائف کے پاس مجھے ایک لاکھ روپے میں بیچ دیا یہ تھی عوامی لوگوں کی عوامی خدمت۔

لیکن میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ میرا سودا ہوچکا ہے۔ وہ طوائف مجھے بیٹی بیٹی کہہ کر اپنے ساتھ ملتان لے گئی اس کے گھر پہنچ کر جب میں نے وہاں کے رسم و رواج دیکھے تب مجھے اندازہ ہوا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے اور میں ایسی کیچڑ میں دھنسنے والی ہوں جہاں سے نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو اس عورت نے مجھے پکڑ لیا اور بہت مارا میں رونے لگی تو وہ نائیکہ بولی۔ ''دیکھو اب رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا میں نے تمہیں ایک لاکھ روپے میں خریدا ہے جب تک میری رقم بمعہ سود کے وصول نہیں ہوجاتی میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔''

میں نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا اور اب مجھے اس سیاسی رہنما کی میٹھی میٹھی باتیں سمجھ میں آ رہی تھیں کہ وہ مجھے کیا معاوضہ دلوائے گا اسے میں ایک بپتا کی ماری لڑکی نہیں بلکہ ایک لاکھ روپے کا چیک لگ رہی تھی اور مجھے اس نائیکہ کے ہاتھ میں دے کر سمجھیں کہ اس نے وہ چیک کیش کروالیا تھا۔

وہ عورت میرے پاس آئی اور بڑے میٹھے انداز میں بولنے لگی۔ ''دیکھو جتنی جلدی ہو سکے تم میری بات مان لو اور جو میں کہتی ہوں وہ کرتی جاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہوگا اور تم ایک اچھی زندگی گزارنے لگو گی۔''

میں بے بس اس کی بات سنتی رہی اور اپنی زندگی پر غصہ کرتی رہی کہ اس سے تو اچھا تھا کہ میں بھی اپنے بھائی کے ساتھ اس سیلاب کی نذر ہو جاتی کم از کم میری پاکیزگی تو داغدار نہ ہوتی میں اپنے مرحوم ماں باپ کی روحوں سے یہی سوال کر رہی تھی کہ کیا یہی دن دیکھنے کے لیے مجھے اس دنیا میں چھوڑ گئے تھے اپنی جس بچی کو آپ لوگ سینے سے لگا کر رکھتے تھے کیا اب اس کے مقدر میں دوسروں کے سینے میں ٹھنڈ پہنچانا لکھ دیا گیا ہے ایک شہید جو وطن کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گیا کیا اس کی اپنی بیٹی کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں۔''

لڑکی کے ایک ایک لفظ نے وہاں کھڑے تمام لوگوں پر جیسے جادو سا کر دیا تھا وہاں اتنی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی۔

نازو نے خود پر قابو پاتے ہوئے پھر بولنا شروع کیا۔ ''اور یہی سب سوچتے سوچتے رات ہو گئی، سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے یا جو ان کا کام تھا اس میں مشغول تھے۔ لیکن میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی میں بس یہی سوچ رہی تھی کہ کسی طرح ایک بار یہاں سے نکل جاؤں اور موقع کی تلاش میں تھی خوش قسمتی سے اسی رات میں یہ موقع بھی مل گیا اور میں چپکے سے وہاں سے نکل کر بے تحاشہ ایک طرف دوڑنے لگی، ایک چوراہے پر میں نے کچھ چنگ چی کھڑے دیکھے میں نے ایک چنگ چی والے سے کہا کہ بھائی مجھے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ دو تو وہ پیسوں کے بارے میں اور نہ جانے کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگا شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس شہر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور اتنی رات گئے اکیلی لڑکی کو پا کر وہ ناجائز فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ ظالم میرے ساتھ زبردستی کرنے لگا تو برابر میں کھڑے چنگ چی والے نے اسے ڈانٹا اور مجھ سے پوچھا کہ بہن تم نے کہاں جانا ہے تو میں رونے لگی اور روتے ہوئے کہا کہ مجھے ریلوے اسٹیشن چھوڑ دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔

ایک بڑے عرصے کے بعد مجھے کوئی نیک انسان ملا تھا۔ اس نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ دیا میں بھاگتی ہوئی اندر گئی تو ایک پلیٹ فارم پر ٹرین کھڑی ہوئی تھی میں اس کے اندر چھپ کر بیٹھ گئی۔ وہ ٹرین پنڈی جا رہی تھی اور وہی اس کا آخری اسٹیشن تھا۔ میں اسی اسٹیشن پر بھیک مانگ کر اپنا گزارا کرنے لگی۔''

اتنا کہہ کر وہ لڑکی پھر چپ ہو گئی۔ اب وہاں موجود ہر آنکھ نم ہو چکی تھی اور ہر کوئی یہ سوچ رہا تھا کہ یہ زندگی اس بیچاری کے ساتھ کیسا کھیل کھیل

رہی ہے۔

لڑکی کچھ دیر رک کر اپنی سانسیں ترتیب میں لاتی رہی اور پھر بولنے لگی۔

''بس ریلوے مجسٹریٹ صاحب وہیں پنڈی میں ہی بھیک مانگ کر اپنا گزارا کر رہی تھی کہ یہ والی ٹرین وہاں کھڑی تھی اور مجھے پتہ چلا کہ یہ لاہور جا رہی ہے تو میں نے سوچا کہ چلو جب یہی زندگی جینا ہے تو لاہور چلی جاتی ہوں میرے پاس ٹکٹ کے لیے پیسے تو تھے نہیں کہ ٹکٹ لے سکتی، میں پھر اس ٹرین میں چھپ کر بیٹھ گئی لگتا ہے قسمت کو میرے ساتھ کوئی دشمنی ہے کہ اس ٹرین کی چیکنگ ہونے لگی اور اب میں آپ کے سامنے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے الزام میں کھڑی ہوئی ہوں۔

صاحب میں زندگی اور قسمت کے اس کھیل سے اب تھک چکی ہوں آپ کو جو کارروائی کرنی ہے کریں لیکن میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکیں نہ چھڑکیں۔'' اور وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

پلیٹ فارم پر ایک ہجوم سا جمع ہو چکا تھا کچھ دیر پہلے تک جو لوگ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے، اب ان کی آنکھوں میں اس کی درد بھری کہانی کے آنسو تھے ریلوے مجسٹریٹ کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی سے کیا بولے اسے بولنے کے لیے موزوں الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے یہی حال سب کا تھا اور سب گنگ سے کھڑے یک ٹک اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔

ویسے تو وہاں بھیڑ میں موجود ہر آنکھ نم تھی لیکن ان میں سے دو لوگ ایسے تھے جو اس لڑکی نازو کی طرح روئے جا رہے تھے یوں سمجھ لیں کہ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

ان دونوں میں ایک چھوٹا سا مونگ پھلی بیچنے والا لڑکا تھا جو اس لڑکی کی پوری کہانی کو بہت غور سے سن رہا تھا اور روئے جا رہا تھا وہ کوئی اور نہیں اسی لڑکی نازو کا چھوٹا بھائی تھا جو سیلابی ریلے میں بہہ گیا تھا، لیکن اس کی جان بچالی گئی تھی۔

جب نازو نے اپنی آپ بیتی ختم کی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے آس پاس کتنے لوگ موجود ہیں اور اس کی باتیں سن رہے ہیں یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی اور اس کی نظر اس روتے ہوئے چھوٹے لڑکے پر پڑی دیکھتے ہی وہ اپنے بھائی کو پہچان گئی اور دوڑ کر اسے گلے سے لگا لیا اور اپنی بانہوں میں ایسے بھینچ لیا جیسے اب وہ اسے اپنی آغوش سے کبھی جدا نہیں کرے گی۔

''تم کہاں تھے میرے بھائی میرے لعل دیکھو تمہارے بغیر تمہاری بہن کتنی اکیلی ہو گئی تھی دیکھو تمہارے بغیر کہاں کہاں بھٹکتی پھری ہوں۔''

بچھڑے ہوئے بھائی بہن کے ملن سے جہاں لوگوں کے دلوں کو ایک اچھوتی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی وہیں ان دونوں بہن بھائیوں کا رونا دیکھ کر ان کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔

کچھ دیر رونے کے بعد لڑکی نے دوبارہ اپنے بھائی سے پوچھا۔ ''بھائی تم لاہور کیسے آ گئے۔''

لڑکا لمبی لمبی ہچکیاں لیتا ہوا رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''باجی جب ہم سیلاب میں بہہ گئے تو مجھے آپ کا کچھ پتہ نہیں چلا اور میں پانی میں بہت دور تک بہتا چلا گیا کچھ دور بہتے ڈوبتے مجھے کسی پیڑ کا تنا مل گیا جو پانی میں بہہ رہا تھا، میں اس پر بیٹھ گیا رات سے صبح ہوئی رضا کار ٹیمیں ہیلی کاپٹر سے لوگوں کو تلاش کر رہی تھیں ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور انہوں نے مجھے بچا لیا میں نے آپ کو

بہت تلاش کیا مگر آپ نہ جانے کہاں گم ہوچکی تھیں پھر میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے آپ بھی اماں اور ابا کے پاس تو نہیں چلی گئیں میں ادھر ادھر بھٹکنے لگا اور لوگوں سے بھیک مانگ کر جینے لگا ایک دن ایسے ہی میں اسی اسٹیشن پر لوگوں سے بھیک مانگ رہا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے روک لیا اور میرے بارے میں پوچھنے لگا جب میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو اس نے مجھے بھیک مانگنے سے منع کردیا اور اپنی جیب سے مجھے مونگ پھلیاں اور کچھ بھنی ہوئی دالیں خرید کردیں کہ انہیں بیچ کر اپنا گزارا کرو بھیک مانگنے سے اپنے ہاتھ کی کمائی خدا کو زیادہ پسند ہے پھر اس نے مجھ سے کہا کہ بیٹا اسٹیشن کے پیچھے میرا گھر ہے' تم چاہو تو وہاں رہ سکتے ہو اور ہاں یہ مت سمجھنا کہ میں تم پر کوئی احسان کررہا ہوں۔ تم معاوضے کے طور پر میرے گھر کی تھوڑی صفائی ستھرائی کردیا کرنا بس باجی تب سے میں انہی کے گھر میں رہتا ہوں صبح اور شام کو ان کے گھر کی صفائی کرتا ہوں پھولوں کو پانی دیتا ہوں اور باقی وقت اسٹیشن پر مونگ پھلی بیچتا ہوں آج بھی میں مونگ پھلی بیچ رہا تھا کہ یہاں بھیڑ کو دیکھ کر میں بھی ادھر چلا آیا اور کیا دیکھا کہ آپ یہاں ہیں۔''

یہ سن کے نازو نے اسے پھر اپنے گلے سے لگا لیا جیسے اتنے عرصے جدا رہنے کی کسر پوری کررہی ہو۔

اور وہ دوسرا آدمی جو اس بھیڑ میں انہی کی طرح رو رہا تھا' وہ دیکھنے میں اور لباس کی وجہ سے ایک فوجی جوان لگ رہا تھا سب کچھ سننے کے بعد وہ نازو کے پاس آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''تم مجھے اور میرے باپ کو معاف کردو تم نے آج تک جو بھی مصیبتیں اٹھائی ہیں وہ سب میرے والد کی وجہ سے اٹھائی ہیں۔''

اب نازو' اس کا بھائی اور وہاں موجود لوگ اسے ایسے دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ تم کون ہو بھائی۔

وہ لڑکا بھی شاید ان کی نظریں بھانپ گیا تھا۔ بولا۔ ''میں وہی بدنصیب ہوں جس سے تمہاری شادی ہونے والی تھی' اور میرے باپ کے لالچ کی وجہ سے وہ شادی نہ ہوسکی۔ حالانکہ اس وقت میں کچھ نہیں کرسکا' کیونکہ باپ کی بات ماننا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ مگر آج میں تم سے اس غلطی کی جو مجھ سے انجانے میں ہوئی اور میرے والد سے ہوئی' اس کے لیے تم سے معافی مانگتا ہوں اور اب میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ کیا تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو۔''

یہ سن کر ریلوے مجسٹریٹ صاحب اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔ ''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں اس لڑکی کو اپنی سگی بیٹی کی طرح رخصت کروں گا۔'' ریلوے مجسٹریٹ کی بات سن کر سب کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے تھے۔

پھر کیا تھا۔ اسٹیشن پر موجود ہر شخص ان کی شادی کی تیاری کرنے لگا۔ اور اسٹیشن کی مسجد کے پیش امام کو بلوا کے چند گھنٹوں کے اندر اندر قبول ہے کی گردان نے نازو کی بدقسمتی کو خوش قسمتی کی نئی رت میں تبدیل کردیا تھا۔

✻

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

صائمہ......فیصل آباد

ج: مسئلہ نمبر 1:۔ سورۃ طٰحٰہ کی شروع کی 5 آیات ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ پڑھ کر دم کریں۔

نمبر 2:۔ فجر اور عشاء میں 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم بھی کریں اور پانی بھی پلائیں دم کیا ہوا۔

نمبر 3:۔ رات کو جب سوجائے سرہانے کھڑے ہوکر 1 تسبیح ''سورۃ العصر'' کی پڑھیں اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اتنی آواز میں کہ اگر وہ جاگ رہی ہو تو سن سکے۔ نیت:۔ راہِ راست پر آرہی ہے۔

رشتے کے لیے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 مرتبہ بعد نماز فجر اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ گھر کا کوئی بھی فرد پڑھ لے۔

خدیجہ......سرگودھا

ج:۔ ''یا سمیع'' 313 مرتبہ بعد نماز عشاء اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔ نام کے معنی ذہن میں رکھ کر پڑھیں تصور بھی کریں ٹھیک ہونے گا۔

ساجد......شورکوٹ

ج:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کردیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔

''لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم'' اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف 1000 مرتبہ پڑھ کر پانی پہ دم کریں۔ زیادہ سے زیادہ وہ پانی پلائیں پانی اس میں ملاتے بھی رہیں۔

رشتہ کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

عزیز فاطمہ......لانڈھی' کراچی

ج:۔ بعد نماز فجر 3 مرتبہ سورۃ یسین 1 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر اپنے تمام مسائل کے لیے دعا کریں۔

شہنیلا توصیف......فیصل آباد

میں نمازیں بھی پڑھتی ہوں اور وظیفے بھی کرتی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑ رہا جو اچھے رشتے ہوتے ہیں وہ ہو نہیں پاتے پہلے ہی کوئی نہ کوئی رکاوٹ ہوجاتی ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے اور گھر والوں کے جملہ مسائل حل ہوجائیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

ج:۔ رشتہ کے لیے بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ 1 مرتبہ پورا کلمہ پھر ''لا الہ الا اللہ'' 99 مرتبہ پھر محمد رسول اللہ اس طرح 3 تسبیح کرنی ہیں۔ بعد نماز عشاء۔

بعد نماز فجر سورۃ یسین اور سورۃ المزمل کا معمول بنالیں۔ ان شاءاللہ کاموں میں رکاوٹیں نہیں آئیں گی۔

جمیل......ساہیول

ج:۔ بعد نماز عشاء سورۃ عبس 23 پارہ 3 مرتبہ پڑھیں بغیر بسم اللہ۔ درود شریف کے ساتھ۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74. 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ وظیفہ خلوص اور یکسوئی کے ساتھ کریں ان شاءاللہ جلد خوش خبری ملے گی۔

نادیہ......گجرات

ج:۔ وظیفہ جاری رکھیں۔ صدقہ بھی دیں (مرغ/

بکرا) نیت جو رکاوٹ ہے وہ ختم ہو جائے۔
مہوش "یا فتاح" روزانہ 1 تسبیح کریں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

آمنہ اعوان...... حیدرآباد

ج:۔ بچیوں کے لیے:۔ سورۃ الفاتحہ، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق، سورۃ الناس 7'7 مرتبہ پڑھ کر دم کیا کریں صبح و شام۔
"یا عدل" 313 مرتبہ روزانہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ کیس کے لیے۔
ہر نماز کے بعد "یا ولی" 41 مرتبہ پڑھیں۔ شوہر کے دل میں اپنی اور بچیوں کی الفت کا تصور رکھ کر۔

نادیہ طاہر...... گوجرہ

ج:۔ "یا رئوف" 286 بار ہر نماز کے بعد پڑھ کر سب کے راضی ہونے کی دعا مانگیں۔ 3 ماہ تک۔

کمال فاطمہ...... نیو کراچی

ج:۔ "یا متعالی" ہر فرض نماز کے بعد 151 بار ورد کریں اور دعا کریں۔ جلد کامیابی ہوگی۔

حنا ریاض...... لاہور

ج:۔ آپ نماز کی پابندی کریں۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔
نیت اور دعا یہ ہو کہ جہاں میرے حق میں بہتر رشتا ہو وہاں ہو۔ جلد از جلد۔ ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ جلد حل ہو جائے گا۔ وظیفہ پابندی اور خلوص کے ساتھ کریں۔
دوست نما دشمنوں سے بچیں عقل استعمال کریں۔

نسرین کوثر...... لاہور

ج:۔ تارا میرا تیل (کڑوا تیل) اس پر 11 مرتبہ سورۃ عبس (23 واں پارہ) پڑھ کر دم کریں روزانہ وہ تیل سر پر لگائیں۔

ثمینہ ارشاد...... رحیم یار خان

ج:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔
پھر دعا بھی کریں ان شاء اللہ مسئلہ جلد ہو جائے گا۔

شائستہ غلام محمد...... میلسی

ج:۔ "یا ولی یا والی" 101 بار پڑھیں ہر نماز کے بعد دعا مانگیں۔

صبا اقبال...... گجرات

ج:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ المزمل (اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف) پڑھ کر دم کر دیں چینی سب گھر والوں کے استعمال میں آئے۔
رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔

ث۔ش...... کھاریاں

ج:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر دعا کریں۔ اپنے رشتے کے لیے۔
"یا فتاح" روزانہ 1 تسبیح نتیجہ آنے تک۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

گل آرا...... آزاد کشمیر

ج:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اچھے اور جلد رشتوں کے لیے دعا کریں اور راضی بھی ہو جائیں۔

آمنہ بتول...... بہاولپور

ج:۔ 41'41 پڑھیں رات سوتے وقت سورۃ

الفلق اور سورۃ الناس اور اپنے جسم پر پھونک ماریں۔
بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 بار پڑھ کر اچھے رشتے کی دعا کریں۔ دورانیہ 3 ماہ۔

شہناز بیگم...... کراچی

ج:۔ بڑا بیٹا نماز کی پابندی کرے۔ فجر کی نماز کے بعد 1 مرتبہ سورۃ یسین اور 1 مرتبہ سورۃ رحمن پڑھے۔
فوراً گھر لینا ٹھیک نہیں حاسدین کی دشمنی کا اندیشہ ہے۔ کچھ وقت ٹھہر کر جو مناسب ہو وہ فیصلہ کرلیں۔ سارے پیسے کاروبار میں نہ لگائیں۔

ریحانہ تبسم...... لالہ موسیٰ

ج:۔ تبسم ارم اور عائزہ نوشین جب سو جائیں ان کے سرہانے کھڑے ہو کر الگ الگ سورۃ العصر 41 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ نیت یہ رکھیں کہ فرمانبردار ہو رہی ہیں۔ اتنی آواز میں پڑھیں کہ اگر جاگ رہی ہوں تو سن سکیں۔
رشتوں کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف رشتوں کے لیے دعا بھی کریں۔
اگر ممکن نہ ہو تو ہر فرض نماز کے بعد پڑھ کر تصور میں دونوں بیٹیوں کی شکل لا کر ان پر دم کریں۔ اللہ مہربان ہو۔

نغمانہ...... کھاریاں

ج:۔ 11 مرتبہ سورۃ عبس 23 پارہ۔ بغیر بسم اللہ بغیر درود شریف۔ رات کو پڑھ لیں۔ دو بوتل پر دم کریں۔
ایک کو صبح پورے گھر کی دیواروں پر چھڑک دیں دوسری سب گھر والے تھوڑا تھوڑا استعمال کریں۔
روزانہ کا عمل ہے۔ 3 ماہ تک کرنا ہے۔
۲:۔ ایک تیل کی بوتل پر دم کریں۔ سورۃ عبس 11 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف روزانہ سر پر لگائیں۔ ان شاء اللہ سر کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔

رابعہ تنویر...... لاہور

ج:۔ چونکہ آپ نے گھر کا مکمل پتا اور گھر کے افراد کے نام تحریر نہیں کیے۔ اس لیے گھر کے حالات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گندے عمل کی وجہ سے ہوا ہے۔
روزانہ سورۃ بقرہ 1 مرتبہ پڑھ کر 2 بوتل پر دم کریں۔ ایک بوتل کا پانی پورے گھر میں چھڑکیں۔ دوسری تمام گھر والے صبح شام استعمال کریں۔ 3 ماہ تک جاری رکھیں۔ صدقہ بھی دیں۔

ماریہ شکیل...... فیصل آباد

ج:۔ ہر فرض نماز کے بعد "سورۃ العصر" 21 بار پڑھیں۔ اول و آخر 3'3 بار درود شریف۔ تصور میں بھائی کو سامنے رکھ کر۔ پڑھنے کے بعد تصور میں بھائی پہ پھونک ماریں نیت اچھا اور فرمانبردار ہونے ہو۔

عاصمہ نورین...... لاہور

ج:۔ رات سوتے وقت سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق، سورۃ الناس 19'19 بار۔ یہ وظیفہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ

حسیب احمد...... ملتان

ج:۔ 11 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کے تیل پر دم کریں اور پانی پر روزانہ تیل کی مالش کریں اور پانی زیادہ سے زیادہ پلائیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف ہر ماہ یہ عمل کرلیا کریں۔
رزق میں فراوانی کے لیے صدقہ دیا کریں۔ ہر نماز کے بعد سورۃ القریش 11 مرتبہ پڑھا کریں۔

صائمہ...... حجرہ شاہ مقیم

ج:۔ سورۃ ال عمران آیت 38 ہر نماز کے

بعد 11 مرتبہ پڑھیں (دونوں) دعا بھی کریں۔

سورۃ عبس (23واں پارہ) 11 مرتبہ بعد نماز عشاء پڑھ کر اپنے او پر دم کریں۔

ان شاءاللہ آپ کی مراد جلد پوری ہوگی۔

ماہ نور......سرگودھا

ج:۔"یا علیم" پڑھنے سے پہلے 11 بار درود شریف پڑھیں۔ رشتے کے لیے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 بار بعد نماز فجر پڑھیں اور دعا مانگیں۔

مس ناز......کراچی

ج:۔ اول وآخر 11'11 بار درود شریف۔ 141 بار سورۃ الفلق اور سورۃ الناس روزانہ پڑھ کر سب گھر والے پئیں اور در و دیوار پہ چھڑکیں۔ 40 دن بعد بہتری شروع ہوگی۔ یہ عمل 3 ماہ تک جاری رکھیں۔

اسماء......میر پور خاص

ج:۔ کاروباری ذہن نہیں ہے آپ کے شوہر کا۔ "سورۃ النصر" 30واں پارہ۔ بعد نماز عشاء 125 بار اول وآخر درود شریف 25'25 بار۔ روزانہ بلا ناغہ پڑھیں۔ بہت اچھا رسپانس ملے گا۔ پڑھنا صرف شوہر کے لیے ہے۔

مریم شاہین......گوجر خان

ج:۔"یا لطیف یا ودود" 11'11 مرتبہ رات کے وقت اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

آمنہ......حیدرآباد

ج:۔ روزانہ 3 بار سورۃ 'الجن' پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پلائیں اور تیل پر دم کر کے سر میں لگائیں۔ ان شاءاللہ ایک ماہ میں فرق آجائے گا۔

ن......خانیوال

ج:۔ رات کو سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 41'41 بار پڑھ کر بندش و رکاوٹ ختم ہونے کی دعا کریں۔

بعد نماز فجر سورۃ فرقان کی آیت نمبر 74' 70 بار پڑھ کر رشتے کے لیے دعا کریں۔ 3 ماہ تک۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔
ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔
rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے جولائی 2013ء

نام............ والدہ کا نام............ گھر کا مکمل پتا............

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں............

خوشبو سخن

عمر اسرار

آئیڈیل

معصوم ذہنو
من کے بچو
آئیڈیل مت بناؤ تم
آئیڈیل تراشے بت ہیں
جنہیں ہم ہاتھ سے بناتے ہیں
پوجتے ہیں چاہتے ہیں
تن من اپنا وارتے ہیں
ٹوٹ جائیں گر تو
مٹی مٹی ہوجاتے ہیں
قسمت اپنی کھوجاتے ہیں
ایسے ہی گر کبھی
آئیڈیل نا معتبر ٹھہریں
کرب و نارسائی لیے
معصوم ذہن مرجاتے ہیں
من کے سچے
زندگی کی کڑی مسافت میں
لحظہ لحظہ بکھر جاتے ہیں

ریحانہ سعیدہ......لاہور

غزل

میری زندگی یوں سزا ہوگئی
محبت تری جو عطا ہوگئی
مہک مجھ کو پھولوں کی آنے لگی
تری یاد بادِ صبا ہوگئی
نگاہیں اٹھا کے جو دیکھا مجھے
میری زندگی کیا سے کیا ہوگئی
وہ باتیں دلائیں اسے یاد کیا
مرا بولنا اک خطا ہوگئی
تماشہ میری زندگی بن گئی
سنا ہے کہ تو بے وفا ہوگئی
ہو رانا پہ اب تو کرم کی نظر
ستم کی ترے انتہا ہوگئی

قدیر رانا......راولپنڈی

گیت

ذرا متوالی سی
کچھ دیکھی بھالی سی
میرے شہر کی اک لڑکی
اک لڑکی......
میرے شہر کی اک لڑکی
کھوج تتلیوں جیسی پر شوق آنکھوں میں
اک چڑیا چہکتی ہے یوں گھر کے دریچوں میں
راہ میں کتابیں لیے اک روز ڈر گئی جو
ہاتھوں سے اڑا آنچل اس کا ہواؤں میں
ذرا لاابالی سی
کچھ بھولی بھالی سی
میرے شہر کی اک لڑکی
پلی نازوں سے وہ کومل کومل مزاج کی
باپ کی نور نظر انا' ماں کے لاج کی
محبت میں کھا گئی پھر دھوکا وہ بھی
تماشا دیکھتی آنکھ رہی ہے وحشی سماج کی
ذرا من چلی سی
کچھ سیدھی سادھی سی
میرے شہر کی اک لڑکی
اک لڑکی
میرے شہر کی اک لڑکی......!!

سید عبداللہ شاہد......حیدرآباد

غزل

عمر کا سورج ڈھلے مدت ہوئی
قبر کی جانب چلے مدت ہوئی
بوجھ ہے اب تو یہ جسمِ ناتواں

ہم بھی تھے اچھے بھلے مدت ہوئی
شکر ہے کہ جاں کو آنے والے سانپ
آستینوں میں پلے مدت ہوئی
اب تو بے گانوں میں کھو کے رہ گئے
ساتھ اپنوں کے چلے مدت ہوئی
اب تو وہ گردن اڑانے کو پھریں
وہ جو ملتے تھے گلے مدت ہوئی
ہوگئی ہے زندگی کچھ پرسکوں
غم ملے اوپر تلے مدت ہوئی
ہم نے راہِ عشق وحشی میں قمر
طے کیے سب مرحلے مدت ہوئی

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

زندگی

سلامت رہے تو جہاں بھی رہے
رواں اے زندگی تو رواں ہی رہے
ہزار روپ میں آشکار ہے تو
ظلم کو تیغ آب دار ہے تو
تقدیر کی کہیں شکار ہے تو
ہر اک رنگ میں تو عیاں ہی رہے
رواں اے زندگی تو رواں ہی رہے
بچھڑی کہیں اپنے پیاروں سے تو
دور ہے گنگناتی بہاروں سے تو
نبرد آزما خلفشاروں سے تو
سر پر سایہ فلکن آسماں ہی رہے
رواں اے زندگی تو رواں ہی رہے
ترا یہ قافلہ کبھی رکا ہی نہیں
گزر گئی ہے تو بے نشاں بھی کہیں
کبھی چھوڑے نقشِ کفِ پا بھی وہیں
فطرت برحق تری پاسباں ہی رہے
رواں اے زندگی تو رواں ہی رہے
حقیقت سے اپنی تو ہے بے خبر
ظاہر ہی تری خاطر ہے پر اثر
جو فطرت شناسا ہو تری نظر
جہاں بھر کی تو رازداں ہی رہے
رواں اے زندگی تو رواں ہی رہے
سلامت رہے تو جہاں بھی رہے

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم

غزل

میرے دیس کے سارے دریا کدھر گئے
بہت سے لوگ یہاں پیاسے مر گئے
عدو کے لشکروں سے لڑتا رہا تمام عمر
تنہا مجھے چھوڑ کر سب لوگ مر گئے
پرندے اب جائیں تو جائیں کہاں
ان کے تو یہاں ٹوٹ سارے پر گئے
مرے ساتھ کیا ہوا کچھ پتا ہے تمہیں
سارے لوگ مجھ کو بلا کر اپنے گھر گئے
بہت دیر سے تلاش میں لگا ہوا ہے
قاتل اس طرف گیا لوگ جدھر گئے

وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

تیری یاد میں پھول کھلنے لگے
بچھڑے ہوئے لوگ پھر سے ملنے لگے
مہکتی یادیں اور تیرا مسکرا دینا
تیری نظروں کے تیر پھر سے چلنے لگے
ہمت نہیں کہ تیری طرف میں دیکھوں
ساتھ جو نہ دے سکے دل جلانے لگے
صدا یہ آئی ہے تیرا کوئی بھی نہیں جاوید
جسے چاہا تھا وہ بھی نظر چرانے لگے

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غزل

دھندلی دھندلی سی سحر آج بھی ہے
پرخطر راہ گزر آج بھی ہے
کل بھی سائے تھے گریزاں اس سے
دھوپ سے تنگ شجر آج بھی ہے

وہ جو ملتا تھا غریبوں کو کبھی
وہی محنت کا ثمر آج بھی ہے
کارواں جا بھی چکا ہے لیکن
راہ میں گرد سفر آج بھی ہے
جن نگاہوں نے کیا تھا بے خود
ان نگاہوں کا اثر آج بھی ہے
جس کو اخبار میں پڑھ کر ہوا ملال
اے جمال ایسی خبر آج بھی ہے

سمیع جمال...... کراچی

نظم

ہر فرد یہاں پر تاجر ہے
ہر وقت تجارت ہوتی ہے
تم آپ ہی اپنے دام کرو
چھپ کر نہیں سرعام کرو
کیا لوگے اپنی یاری
کیا لوگے تم دلداری کا
غم خوار بنوگے کتنے میں
تم پیار کروگے کتنے میں
سب جذبے میرے نام کرو
ہم نام تم اپنے دام ہو
پر دام چکانے کی خاطر
ہم اپنے دفتر کھولیں تو
ہم اپنی جیب ٹٹولیں تو
بس پیار ملے گا تھوڑا سا
اظہار ملے گا تھوڑا سا
یہ سکے یہاں کب چلتے ہیں
کیا ادھار ملے گا تھوڑا سا
یہ دنیا بے اعتباری کی
یہ غرض ہے ہر بیوپاری کی
چل چھوڑ تمنا جذبوں کی
ہم خالی ہاتھ ہی آئے تھے
چل، پھر خالی ہاتھ ہی چلتے ہیں

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال

نظم

دھیمے دھیمے چلتے چلتے
وقت سہانا بیت گیا
اک آہو کی زاری سے
بن کا سکوت ہے ٹوٹ گیا
کس سے شکایت کیسا گلہ
جو ہونا تھا وہ ہو بھی گیا
اپنا جیون لوٹ کے سارا
کس جانب طوفان گیا
اس دنیا کی محفل سے
جو بھی گیا بیزار گیا
چوٹ لگی کچھ ایسی آسی
ٹوٹ کے دل ہے بکھر گیا

خالد فاروق آسی...... ملت کالونی، فیصل آباد

غزل

اب گلہ کیوں کر رہے ہو تم اس کے روٹھ جانے کا
ہنر تمہی کو نہ آسکا ہوگا اس کا ساتھ نبھانے کا
اک اور وصل کی خواہش سمجھ سے بالا ہے
لگ رہا ہے مجھے یہ خواب بس ایک دیوانے کا
وفا اور جفا کے سلسلے یونہی سدا چلتے رہیں گے
کبھی نہ ختم ہونے کا معاملہ ہنسانے اور رلانے کا
جانِ ناتواں کا کچھ تو اب خیال کرو
فائدہ کیا ہے کسی بے وفا کی یاد میں دل جلانے کا
گو اس سے بچھڑ کر اک عمر گزار دی میں نے
سلیقہ ابھی تک آ نا سکا مجھے اس کو بھلانے کا
میں نے ہنس ہنس کر سہے ہیں تیری جفا کے زخم
خواہش ہے کہ آجائے ہنر تیری یاد کو دل سے مٹانے کا
یہ سوچ کر کہ جفا کے زخم سے روح ہے گھائل
حوصلہ پھر کبھی پا سکا نہ کسی سے دل لگانے کا
خوش امیدی سے میں کبھی پیچھے نہ ہٹا لیکن
موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اکثر نے مجھے ستانے کا

کاظم حسین......کراچی

لاعلاج روگ

دوستیاں تو لاعلاج روگ ہوتی ہیں
پانی میں گھلے رنگ کی طرح
بڑھتی پھیلتی ہیں
آکاس بیل کی طرح
دکھوں محرومیوں کی طرح
حبس زدہ شام کی طرح
دوستیاں تو لاعلاج ہوتی ہیں
درد کی لذت کی طرح
جو کبھی تڑپتا نہیں
کبھی روتا نہیں
بس......!
دوستیاں تو لاعلاج روگ ہوتی ہیں

ساجد عباس اعوان......حافظ آباد شی

اچھا نہیں لگتا

صدیوں کی تھکن
من میں اتر آئی ہے
بے نام منزل کا سفر
تیرے سنگ بھلا لگتا تھا
پاؤں کے چھالے بھی
پھولوں کی طرح کھلتے ہیں
تم ساتھ تھے جب میرے
یہ سفر سہانا لگتا تھا
کڑی دھوپ بھی سایہ تھی
تم ساتھ تھے جب میرے
دل معمور تھا خوشیوں سے
دکھ کا گہرا سایہ بھی
میرے پاس نہ آتا تھا
ہر راہ کہکشاں تھی
ہر رستہ سہانا تھا
منظر وہ گلابوں کے
آنکھوں میں بسے رہتے تھے
جب سے تم نے رستہ بدلا
کچھ بھی نہیں ہے اچھا لگتا

زینب ظفر زریں......قلعہ دیدار سنگھ

غزل

نہیں رسوائی کا ڈر ہے میں آؤں گا
ہتھیلی پر مرا سر ہے میں آؤں گا
اڑانوں پر کبھی پہرے نہیں لگتے
بھلے یہ جسم بے پر ہے میں آؤں گا
تمہاری ہر برائی کو بھلا دوں گا
مرا دل اک سمندر ہے میں آؤں گا
مجھے اب ناخدا کی کیوں ضرورت ہو
مرا جذبہ ہی رہبر ہے میں آؤں گا
صدائیں مجھ کو دیتی ہے مری منزل
کوئی سودا مرے سر ہے میں آؤں گا
مسافر کب تلک گھر کو بھلائے گا
ترا پہلو میرا گھر ہے میں آؤں گا
مرے آزاد مجھ کو قید کر لینا
رہائی سے یہ بہتر ہے میں آؤں گا

آزاد حسین آزاد......کراچی

ذوق آگہی

عفان احمد

پانچ باتیں

ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پانچ باتوں پر ضرور عمل کرو۔
۱: گناہوں سے پرہیز کرو تم سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔
۲:۔ خدا نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو تو سب سے بڑے دولت مند بن جاؤ گے۔
۳:۔ اپنے پڑوسی سے احسان کرو تو مومن بن جاؤ گے۔
۴:۔ لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔
۵:۔ زیادہ نہ ہنسا کرو زیادہ ہنسنے سے دل مر جاتا ہے۔

وسیم اختر......راولپنڈی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

غم کو خوشی سے برداشت کیا جائے تو غم کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ (اووڈ)
جب بھی کسی بدقسمتی سے بچ جاتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک خوش قسمتی ہے۔ (والٹن)
زندگی میں دو المیے ہوتے ہیں ایک جس کی خواہش ہو اس کا نہ ملنا اور دوسرا جس کی خواہش ہو اس کا مل جانا۔ (برنارڈ شا)
سرکہ کے بجائے شہد کے ذریعے مکھیاں پکڑنا آسان ہے۔
(انگریزی کہاوت)
اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کریں تو کبھی اپنی خوبیوں کا ذکر نہ کریں۔ (پاسکل)

ریاض بٹ......حسن ابدال

موت سے فرار ممکن نہیں

ایک لنگڑے لولے آدمی نے کن کھجورے (بہت سے پاؤں والے کیڑے) کو مار ڈالا ایک اللہ والے کا اس پر گزر ہوا انہوں نے فرمایا: سبحان اللہ! باوجود سیکڑوں پاؤں ہونے کے جب موت آ پہنچی تو ایک بے ہاتھ پاؤں والے سے نہ بھاگ سکا۔
فائدہ: آنے والی مصیبت کو دور کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے لہٰذا اس پر صبر کرنا چاہیے اور اللہ کی مشیت پر راضی رہنا چاہیے۔

محمد صدیق اختر......ملتان

کھانے کی مقدار کے بیان میں

ایک حکیم صاحب اپنے بیٹے کو زیادہ کھانے سے منع کرتے تھے اس لیے کہ پیٹ بھر کر کھانا بیمار کر دیتا ہے۔ بیٹے نے کہا: اے ابا! بھوک تو آدمی کو مار ڈالتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا خوش طبع لوگ کہتے ہیں پیٹ بھر کر مر جانا بھوکا مر کر جینے سے بہتر ہے؟ باپ نے کہا: بیٹے! کھانے پینے میں میانہ روی کا خیال رکھ اس لیے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ بڑھو اسراف نہ کرو نہ اتنا زیادہ کھا کہ تیرے منہ سے نکل پڑے اور نہ اتنا کم کھا کہ کمزوری سے جان نکلنے لگے کھانے میں اگرچہ زندگی ہے لیکن جو کھانا مقدار سے زیادہ ہوگا بیمار کر دے گا۔ اگر گلقند پیٹ بھرنے پر کھائے گا تو نقصان دے گا اور سوکھی روٹی دیر سے خوب بھوک لگنے پر کھائے گا تو گلقند کا مزا اور فائدہ دے گی۔ (گلستان ص ۱۰۹)
فائدہ: نہ اتنا کم کھاؤ کہ کمزوری سے فرائض میں خلل واقع ہو جائے اور نہ اتنا زیادہ کھاؤ کہ اس سے

بندگی میں سستی اور بیماری پیدا ہو جائے۔

مشتاق حسین...... میر پور خاص

حضرت سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ کی اپنی سر گزشت

حضرت سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دمشق کے دوستوں سے مجھ کو رنجش پیش آ گئی، اس لیے میں بیت المقدس کے جنگل کی طرف نکل آیا اور میں نے جانوروں سے انس پیدا کر لیا یہاں تک کہ ایک دن عیسائیوں نے مجھ کو پکڑ کر قیدی بنا لیا اور یہودی کے ساتھ طرابلس کی خندق کھودنے میں مٹی کے کام پر لگا دیا۔ حلب کا ایک رئیس کہ اس سے ہماری پرانی جان پہچان تھی اُدھر سے گزرا اس نے مجھ کو پہچان کر کہا: یہ کیا حالت ہے جو میرے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ میں نے کہا: کیا عرض کروں، میں آدمیوں سے پہاڑوں اور جنگلوں میں بھاگا پھرتا تھا تا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کام میں مشغول نہ ہوں، آپ خود ہی اندازہ فرمائیے کہ اس گھڑی میرے دل پر کیا گزرتی ہوگی کہ حیوانات کی جماعت سے موافقت کرنی پڑی (دوستوں کے ساتھ جیل خانہ کی زندگی بہتر ہے غیروں کے ساتھ چمن کی زندگی سے)۔

اس حلب کے رئیس کو میری حالت پر رحم آیا اور اس نے دس دینار میں عیسائیوں کی قید سے مجھ کو خرید لیا اور اپنے ہمراہ حلب لے گیا، اس کی ایک نوجوان لڑکی تھی سو دینار سرخ کے عوض اس کا نکاح مجھ سے کر دیا، جب ایک مدت گزر گئی تو اس بیوی نے کج خلقی اور لڑائی جھگڑا شروع کر دیا، زبان چلانے لگی اور میری زندگی کو تلخ کرنے لگی (بُری عورت نیک مرد کے گھر میں اسی دنیا میں اس کے لیے دوزخ ہے، پناہ بُرے ساتھی سے خدا کی پناہ اے ہمارے ربّ ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، آمین)۔

ایک مرتبہ وہ ملامت کی زبان دراز کر کے کہہ رہی تھی تُو وہی تو ہے جس کو میرے باپ نے دس دینار میں عیسائیوں کی قید سے خرید کر چھڑایا تھا۔ میں نے کہا: ہاں! میں وہی ہوں جس کو تیرے باپ نے دس دینار میں عیسائیوں کی قید سے چھڑایا اور سو دینار میں تیرا ہاتھ پکڑوا دیا یعنی ایک آفت سے چھڑا کر دوسری اس سے بڑی آفت میں پھنسا دیا۔

میں نے سنا ایک بزرگ نے ایک بکری کو بھیڑیے کے منہ اور پنجہ سے چھڑایا اور اپنے گھر لے آیا، رات کو اس کے گلے پر چھری چلانے لگا، بکری کی روح نے اس سے فریاد کی اور کہا: میں تو تیری شکر گزار تھی کہ تُو نے بھیڑیے کے منہ سے مجھ کو بچایا مگر جب انجام دیکھا تو معلوم ہوا کہ تُو خود ہی بھیڑیا ہے۔

فائدہ: دوستوں کی تکلیف پر صبر کرنا چاہیے اور خانگی معاملات میں ضبط وتحمل سے کام لینا چاہیے۔

عشرت نور...... سکھر

ایک نصیحت

اگر تجھ کو مخلوق سے تکلیف پہنچے تو رنجیدہ نہ ہو اس لیے کہ مخلوق سے نہ راحت پہنچ سکتی ہے اور نہ رنج۔ دوست کی موافقت اور دشمن کی مخالفت کو خدا تعالیٰ کی طرف سے جان اس لیے کہ دونوں کے دل اسی کے قبضہ میں ہیں۔

نور الصباح سعید...... کراچی

چند تمثیلات

☆ بے علم صوفی بلا دروازہ کے مکان کے مانند ہے۔ جاہل عبادت گزار پیدل چلنے والے کی مانند اور سست عالم سوئے ہوئے سوار کی مانند ہے۔

☆ جاہلوں میں عالم کی مثال ایسی ہے جیسے اندھوں کے درمیان کوئی خوب صورت محبوب ہو۔

☆ مال دار کی آنکھ مال سے سیر نہیں ہوتی جس طرح شبنم سے کنواں پُر نہیں ہوتا۔

☆ جس کے ساتھ اللہ کی یاد ہو اس کی حالت خوب تر ہے اگرچہ وہ حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح مچھلی کے پیٹ میں کیوں نہ ہو۔

☆ گناہ بُرا ہے لیکن عالم سے ہونا بہت بُرا ہے اس لیے کہ علم شیطان سے لڑنے کا ہتھیار ہے، جب ہتھیار والا ہی گرفتار ہو جائے تو یہ بہت افسوس کی بات ہے۔

☆ بقولِ حکماء وفادار کتا ناشکرے انسان سے اچھا ہے۔

اقبال شمیم...... حیدر آباد

ظلم و ستم کی خرابی

خرابی اور بدنامی ظلم کے سبب سے آتی ہے، بڑا بدنصیب ہے وہ شخص جو کہ دوسروں کی دل آزاری کر کے عیش کرتا ہے، کمزوروں پر سختی کرنا کوئی کمال کی بات نہیں ہے، چڑیا چیونٹی کے سامنے سے دانہ اٹھا لے تو کیا تعجب ہے؟ ظالم کے چراغ کو بجھا دو، اس پر رحم کرنا دوسروں کے اوپر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

ملک اعجاز احمد...... دریا خان

سخاوت کی ترغیب

سخاوت کر، کل قیامت کے دن جب اعمال کا حساب ہوگا تو نیکیوں کے مطابق درجات دیئے جائیں گے۔ سخاوت خدا کے مقبول بندوں کی عادت ہے۔ سخاوت سے آدمی کو نیک نامی اور دوسری بھلائیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسی خوبی ہے جو بہت سے عیوب کو چھپا لیتی ہے۔

اشرف حسین...... خانیوال

چغلی کا فتنہ

دو آدمیوں میں لڑائی جھگڑا آگ کی مانند ہے اور چغل خور آدمی لکڑیاں لا کر اس میں ڈالنے والا ہے، چغل خور پرانی لڑائی کو تازہ کرتا ہے اور بھولے دل کے نیک آدمیوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے سوئے ہوئے فتنہ کو جگانے والے بدنصیب چغل خور سے بچ کر رہنا، آدمی کا کنویں میں ہاتھ پاؤں باندھے ہوئے پڑے رہنا لگائی بجھائی کرنے کے لیے چلنے پھرنے سے بہتر ہے۔

تسنیم احمد...... لاہور

عشق الٰہی کا ثبوت عقلی دلیل سے

اے برادر! تیرا اپنے جیسے مٹی کے بنے ہوئے سے عشق کرنا تیرے صبر اور دل کی راحت کو اڑا دیتا ہے، بیداری میں تو اس کے رخسار اور تل پر فریفتہ ہے، سونے میں اس کا خیال آتا رہتا ہے تو اس کے پیر پر خلوص سے سر رکھنے کو تیار ہو جاتا ہے، اس کے وجود کے سامنے دنیا کو معدوم سمجھتا ہے۔ جب تیرا روپیہ معشوق کی نظر میں نہیں آتا ہے تو تجھے سونا چاندی اور مٹی یکساں معلوم ہوتا ہے تو اس کی جگہ آنکھ میں سمجھتا ہے اور اگر تو آنکھ بند کرتا ہے تو وہ دل میں ہے اس کے ہوتے ہوئے دوسرے کی گنجائش نہیں رہتی دوسرے سے دل نہیں لگتا ہے۔

تجھے دنیا میں رسوا ہونے کا ڈر نہیں، نہ تو صابر بن سکتا ہے اگر تیرا دنیا کا محبوب تیری جان مانگے تو ہتھیلی پر رکھ دے گا اگر تیرے سر پر تلوار رکھے تو سر دھر دے گا، وہ عشق اور تعلق جس کی بنیاد خواہش پر ہے اس قدر فرماں روا اور تکلیف دہ ہے تو پھر تجھے عاشقانِ الٰہی سے کیوں تعجب ہے؟ وہ تو حقیقت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں، معشوق کے ذکر میں دنیا سے غافل ہیں معشوق کی فکر میں جان سے بے نیاز ہیں، خدا کے دھیان میں مخلوق سے بھاگتے ہیں ان کا

علاج دوا سے کرنا مناسب نہیں ہے' عہد الست کی آواز آج بھی ان کے کانوں میں اسی طرح ہے قالوا بلیٰ کی فریاد کا شور کررہے ہیں ہَوا کی طرح پوشیدہ ہیں اور تیز رفتار ہیں کوئی گوشہ نشین ہے کوئی مسافرت میں خاک آلود ہیں ان کی آہیں گرم ہیں نالہ اور نعروں میں لگے ہوئے ہیں' مشک کی طرح خاموش اور تسبیح کرنے والے ہیں آخری شب میں آنسو بہاتے ہیں دیوانگی میں رات اور دن کا بھی امتیاز نہیں کرتے نقاشِ ازلی کے حُسن و جمال پر ایسے دلدادہ اور عاشق ہیں کہ تصویروں کے حُسن سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔

صاحب دل چمڑی کو دل نہیں دیتے ہیں اگر کسی بے وقوف نے دل لگایا ہے تو وہ ناسمجھ ہے' وحدت کی خالص شراب جس نے پی لی ہے اس نے دنیا اور عقبیٰ کو بھلادیا ہے۔

دلدار بخش...... ٹھٹھہ

گلہائے متفرقہ

☆ جب تو یہ دیکھے کہ دشمن کی فوج میں پھوٹ پڑگئی ہے تو مطمئن ہوجا اور اگر وہ متفق ہوجائیں تو اپنی پریشانی کی فکر کر۔

☆ حد سے زیادہ غصہ کرنا وحشت لاتا ہے اور بے موقع نرمی کرنا ہیبت کو مٹاتا ہے نہ ایسی سختی کر کہ لوگ تجھ سے نفرت کرنے لگیں اور نہ اتنی نرمی کر کہ تجھ پر دلیر ہوجائیں اور تیری قدر نہ کریں۔

☆ ہر ایک کو طبعی طور پر اپنی عقل اور اپنے بچہ کی شکل اچھی معلوم ہوتی ہے اگرچہ کبھی خلافِ واقعہ بھی ہوتا ہے۔

☆ بے وقوف کے لیے خاموشی سے بہتر کچھ نہیں ہے اور اگر تو یہ مصلحت جان لیتا تو نادان نہ رہتا۔

☆ جو چیز جلد حاصل ہوتی ہے وہ دیر تک نہیں رہتی۔

☆ بہت سے کام صبر سے پورے ہوجاتے ہیں اور جلدی کرنے والا نقصان اٹھاتا ہے۔

☆ تحمل اور بردباری ابتداء میں کڑوی معلوم ہوتی ہے پھر عادت ہوجانے کے بعد شہد سے زیادہ میٹھی لگتی ہے۔

ایم عمران سعید...... فیصل آباد

لقمان حکیم کی ایک عجیب نصیحت

حکیم لقمان سے پوچھا گیا۔ آپ نے ادب کس سے سیکھا؟ انہوں نے فرمایا: بے ادبوں سے کیونکہ جو فعل ان کا مجھ کو پسند نہ آیا اس سے میں نے پرہیز کیا۔ (عقل مند کے سامنے اگر کھیل اور دل لگی کے طور پر بھی کوئی بات کہی جائے تو وہ اس سے بھی نصیحت حاصل کرلیتا ہے اور نادان کم فہم کے سامنے حکمت کی سیکڑوں باتیں پیش کی جائیں تو وہ ان کو کھیل مذاق سمجھے گا اور کوئی فائدہ حاصل نہ کرے گا)

فائدہ: عقل مند وہ ہے جو کہ نادان کی باتوں میں بھی غور کرے اور اس سے فائدہ حاصل کرے اور ان کے انجام سے عبرت حاصل کرے۔

عظیم راہی...... راول پنڈی

❖

قسط نمبر 10

گنگا کا پجاری

ایے حمید

جب بھی بارش اور جنگل کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے' ذہن میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پیکر چھن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پیکر محترم اے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے' ان کے بارے میں نئے افق کے مدیر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ اے حمید بارش کی منظر کشی کرتے ہیں تو کمرے میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش تھاتھپ برس رہی ہے اور جب وہ قہوہ کا ذکر کرتے ہیں تو قہوہ کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جادوگر تھے جو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔
زیر نظر ناول بھی اے حمید کا سفر نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایڈونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے فسانے بھی ملیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد بابا جی نے آنکھیں کھولیں۔ ہماری طرف دیکھا اور کہا۔

''اس کا ہمیں اختیار تو ہے مگر اجازت نہیں ہے۔ تمہیں اپنی مراد پوری کرنے کے لیے دلی شہر میں لال پہاڑی کے پیچھے بابا سدا رنگ کی خانقاہ جانا ہوگا۔ بابا سدا رنگ کا درجہ مجھ سے بہت اونچا ہے۔ وہ اگر چاہیں تو اس سانپ کو دوبارہ انسانی شکل میں واپس لاسکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بابا جی' کیا آپ......؟''

انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''اب تمہارا ہمارے پاس کوئی کام نہیں جاؤ بابا سدا رنگ کے پاس جاکر اپنی فریاد پیش کرو۔ اور سنو! اب کبھی ہندو نہ بننا۔ مسلمان ہوکر بت پرستوں والا حلیہ نہ بنانا۔ جاؤ۔''

میں نے نیلے سانپ کو اٹھا کر جیب میں ڈالا۔ بابا جی کو سلام کیا۔ کانچی نے بھی بڑے ادب سے بابا جی کو سلام کیا اور ہم دونوں جھونپڑی سے باہر آگئے۔ کانچی خاموش تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اسے کبھی گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ میں ہندو نہیں ہوں مسلمان ہوں۔ جب ہم احاطے کی دیوار کے دروازے میں سے نکل کر باہر آئے تو کانچی نے آہستہ سے کہا۔

''تم مسلمان تھے تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟ مجھے تو بتادیتے۔''

میں نے کہا۔ ''کانچی تم اندازہ نہیں لگاسکتیں کہ میرے ساتھ کیسی کیسی مجبوریاں نہیں تھیں۔ میں نے غیر مسلموں والا بھیس صرف پاروتی کی بھلائی کی خاطر اختیار کیا تھا۔ تم پاروتی کی اگر دردناک کہانی سنو تو تمہاری آنکھ سے آنسو نہ تھمیں کہ کس طرح ایک شریف گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی کو تمہارے ہندو سپیروں اور جوگیوں نے اغوا کیا اور پھر اس کے ساتھ کیسے کیسے مظالم کیے۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے چلا؟ کہاں پہنچ گیا اور پاروتی سے میری ملاقات کیسے ہوئی؟ یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔ اس داستان کو سنانے کا وقت نہیں۔''

ہم یکہ میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف جارہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے مسلمان ہونے کا راز کھل جانے پر کانچی کو نفسیاتی طور پر دھچکا لگا ہے۔ وہ خاموش تھی۔ میں نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی۔ یکہ سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ جب ہم کافی دور نکل گئے تو میں نے کانچی سے کہا۔

''کیا بات ہے؟ تم چپ چپ ہو۔''

حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ چپ کیوں ہے۔ کہنے لگی۔

''ویسے ہی چپ ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

رانچی کے اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد میں نے دلی جانے والی گاڑی کے بارے میں ایک قلی سے پوچھا تو وہ بولا۔

''یہاں سے کوئی گاڑی سیدھی دلی نہیں جاتی آپ کو مرزا پور جانے والی گاڑی پکڑنی ہوگی۔ مرزا پور سے آپ کو دلی جانے والی گاڑی ملے گی۔''

قلی نے یہ بھی بتایا کہ یہ بڑا لمبا سفر ہے۔ کانچی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

''میں سوچتی ہوں اب میرا تمہارے ساتھ دلی جانا کوئی اتنا ضروری نہیں ہے۔ یہ کام تم خود بھی کر سکتے ہو۔ میں دیوتاؤں کا خزانہ پنڈت سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ محفوظ ہو گیا ہے۔''

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ میں ہندو نہیں مسلمان ہوں۔ کانچی کا دل مجھ سے اکھڑ گیا تھا۔ میں بھی اسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

''اگر تم واپس جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔ تمہاری مدد کے بغیر میں پاروتی کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔''

کانچی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کہنے لگی۔

''اس میں احسان والی کوئی بات نہیں ہے۔''

ہم خاموش ہو گئے۔ اس وقت ہم پلیٹ فارم کے بینچ پر بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا۔

''یہاں سے تم کس طرف جاؤ گی؟''

وہ بولی۔ ''میں سوچتی ہوں درگا پوجا کا تہوار شروع ہونے والا ہے۔ پہلے کلکتے کی یاترا کروں اس کے بعد اپنے وطن تبت چلی جاؤں۔''

مرزا پور جانے والی گاڑی پہلے آ گئی۔ میں یہاں کانچی سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ مرزا پور پہنچ کر میں نے گاڑی بدلی اور دلی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ آگے بھی بڑا لمبا سفر تھا۔ ٹرین الہ آباد کان پور اور علی گڑھ سے ہوتی ہوئی ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد دلی پہنچی۔ میں ابھی تک ہندو جوگیوں والے بھیس میں تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مگر میرے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے۔ اتنے روپے بھی نہیں تھے کہ نئے کپڑے خرید لوں۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ ماتھے پر جو تلک لگا تھا وہ مٹایا اور کرمنڈل بھی راستے میں ٹرین سے باہر پھینک دیا۔ دلی کے اسٹیشن پر گاڑی صبح کے وقت پہنچی تھی۔ میں نے اسٹیشن پر ہی تھوڑا سا ناشتہ کیا۔ ویٹنگ روم کے باتھ روم میں جا کر جیب سے پاروتی کے نیلے سانپ کو نکال کر دیکھا۔ سانپ بالکل ٹھیک تھا اور سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے پاروتی مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے اسے رومال میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ اب مجھے دلی شہر کی لال پہاڑی والی خانقاہ میں جانا تھا جہاں سدا رنگ بابا کا ڈیرہ تھا۔ نیلے سانپ کو پاروتی کی شکل میں واپس لانے کی یہی ایک امید باقی تھی کہ سدا

رنگ بابا ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔

میں سواریوں والے تانگے میں بیٹھ کر لال پہاڑی والی خانقاہ پر پہنچ گیا۔ وہاں باباجی کے عقیدت مند کافی تعداد میں خانقاہ کے باہر درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک ہندو جوگی کو یعنی مجھے دیکھا تو حیرت سے تکنے لگے۔ میں لوگوں سے دور ایک الگ تھلگ جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ باباجی ایک گھنٹے بعد عقیدت مندوں سے ملاقات کریں گے۔ اس دوران وہاں سماع شروع ہو گیا۔ لوگ سماع سننے جمع ہو گئے۔ میں نے سوچا چلو سماع سنتے ہیں۔ اس طرح وقت بھی گزر جائے گا۔ میں بھی لوگوں کے مجمع میں آ کر بیٹھ گیا۔ قوال کسی شاعر کا فارسی کلام گا رہے تھے۔ ساز اور ڈھولک بج رہی تھی۔ جب سماع کا رنگ خوب جم گیا اور قوالی تیز ہو گئی تو نیلا سانپ یعنی پاروتی میری جیب سے زور لگا کر باہر نکل آئی۔ میں اسے پکڑتا ہی رہ گیا اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے قوالوں کے سامنے جا کر پھن اٹھا کر رقص کرنے لگی۔ سب لوگ ایک سانپ کو یوں جھومتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

قوال پہلے تو کچھ خوفزدہ ہوئے مگر جب دیکھا کہ سانپ انہیں کچھ نہیں کہہ رہا بلکہ ان کی قوالی پر وجد کر رہا ہے تو انہوں نے بھی دھن تیز کر دی۔ پاروتی نے بھی رقص تیز کر دیا۔ میں خاموش بیٹھا یہ منظر دیکھتا رہا۔ آخر قوالی ختم ہو گئی۔ پاروتی رینگتی ہوئی چپ چاپ میرے پاس آ گئی۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ لوگ مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ سانپ کہاں سے لیا ہے؟ میں نے کہا۔

''بابا لوگ ہم تو فقیر آدمی ہیں۔ ایک جنگل سے مل گیا۔ زخمی تھا۔ ہم نے اس کا زخم دھویا۔ مرہم لگائی اور پھر جنگل میں چھوڑا تو یہ واپس نہ گیا۔ بس اسی روز سے ہمارے ساتھ رہ رہا ہے۔ آج ہم بابا کے درشن کرنے آئے۔ قوالی ہونے لگی تو سانپ وجد میں آ گیا۔''

میں اس سے زیادہ لوگوں کو اور کیا بتاتا۔ اتنے میں باباجی سدا رنگ نے لوگوں سے ملنا شروع کر دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد عقیدت مند خانقاہ کی کوٹھری میں جاتے اور باباجی کی دعائیں وصول کر کے پرسکون حالت میں واپس آ جاتے۔ آخر میری باری بھی آ گئی۔ جب میں باباجی کی کوٹھری میں داخل ہوا تو باباجی نے جلالی آواز میں کہا۔

''تو نے ابھی تک اپنے اندر کے بت نہیں توڑے۔ جا پہلے مسلمانوں والا اپنا اصلی حلیہ بنا۔ پھر ہمارے پاس آ...... جا......''

میں اسی وقت باہر نکل آیا۔

سوچنے لگا دوسرے کپڑے کہاں سے حاصل کروں۔ میں نے باہر سڑک پر آ کر دوسری جیب میں سے پیسے نکال کر دیکھے۔ کل ساڑھے سات روپے تھے۔ اتنی رقم پاکستان بننے کے ایک سال بعد تک بہت ہوا کرتی تھی۔ میں لوگوں سے پوچھتا ہوا دلی کے ایک بازار میں آ گیا۔ جہاں ریڈی میڈ سستی قسم کے کرتے پاجامے وغیرہ بکتے تھے۔ سردیوں کا موسم جا رہا تھا۔ دن کے وقت اتنی سردی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے ایک پاجامہ ایک کرتہ اور ایک واسکٹ خریدی۔ اور دکان کے اندر ہی جوگیوں والا لباس اتار کر کرتہ پاجامہ واسکٹ پہن لی۔ دکاندار بڑا حیران ہوا۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''سادھو مہاراج! کیا آپ سی آئی ڈی کے جاسوس ہیں؟''

میں نے اسے رازداری سے کہا۔

''تم نے ٹھیک پہچانا۔ مگر اس کا ذکر کسی کے آگے مت کرنا۔ میں اسپیشل پولیس کا جاسوس اور مسلمان ہوں۔''

دکاندار خوش ہو کر بولا۔

''بھائی صاحب ہم گاہکوں کے راز کسی کو نہیں بتایا کرتے۔ ورنہ ہماری دکانداری دو دن نہ چلے۔''

اب میرا حلیہ مسلمانوں والا بن گیا تھا۔ سانپ کو میں نے واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہاں سے میں واپس بابا سدا رنگ کی خانقاہ پر آ گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں بابا جی نے مجھے اندر بلا لیا۔ مجھے مسلمانوں والے لباس میں دیکھ کر کہا۔

''اب کبھی بت پرستوں والا لباس نہ پہننا۔''

میں نے عرض کی۔

''انشاء اللہ آپ کے حکم پر پورا عمل کروں گا۔''

میں بابا جی کے آگے اپنا مدعا بیان کرنے کے واسطے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ بابا سدا رنگ نے فرمایا۔

''وہ سانپ نکالو جسے تم اپنے ساتھ لائے ہو۔''

میں نے جلدی سے رومال جیب سے نکال کر سامنے رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ پاروتی کا سانپ رومال کے اندر ہی رہا۔ وہ باہر نہ نکلا۔ بابا سدا رنگ نے سانپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''رومال میں کیوں چھپ کر بیٹھی ہو؟ باہر آ جاؤ۔''

نیلا سانپ بابا جی کا حکم سنتے ہی آہستہ آہستہ رومال سے نکل آیا اور بابا جی کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بابا سدا رنگ کچھ دیر سانپ پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ پھر میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور فرمایا۔

''اس کو خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر لے جاؤ اور وہاں اسے حوض کا پانی پلاؤ۔ خدا نے چاہا تو آدھی رات کے بعد یہ اپنی اصلی شکل میں واپس آ جائے گی اور سنو...... جس رات یہ اپنی اصلی شکل میں واپس آ جائے اس کے دوسرے دن تمہیں درگاہ شریف کی مسجد کے سامنے درخت کے نیچے بیٹھا ایک فقیر ملے گا۔ وہ اس لڑکی کو سیدھی راہ پر لے آئے گا۔

اب تم جا سکتے ہو۔''

میں سلام کر کے تعظیم بجا لا کر بابا سدا رنگ کی کوٹھری سے نکل آیا۔ پاروتی کو میں نے اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہاں سے میں تانگے میں بیٹھ کر شہر سے باہر حضرت خواجہ صاحبؒ کی درگاہ پر حاضری دینے گیا۔ میں سب سے پہلے مزار شریف پر جا کر فاتحہ خوانی کرنا اور سلام عرض کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس خیال سے رک گیا کہ ایک ہندو عورت سانپ کے روپ میں میری جیب میں ہے کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔ میں دوسری طرف والے دروازے سے ہو کر درگاہ شریف کے حوض پر آ گیا۔ درگاہ کے باہر ہی سے میں نے مٹی کا ایک چھوٹا سا کٹورا خرید لیا تھا۔ میں نے حوض میں سے تھوڑا سا پانی کٹورے میں ڈالا اور الٹے پاؤں وہاں سے واپس ہوا۔ حوض کا برکت والا پانی مجھے آدھی رات کے بعد پاروتی کو پلانا تھا۔ اس کے لیے کسی ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں میں رات بسر کر سکوں اور جہاں مکمل تنہائی ہو اور میرے سوا دوسرا کوئی نہ ہو۔

اب تو خواجہ صاحب کی درگاہ شریف کے آس پاس بہت آبادی ہو گئی ہے۔ اس زمانے میں اتنی آبادی نہیں تھی۔ میرے پاس صرف ڈھائی روپے باقی رہ گئے تھے۔ وہاں کوئی ایسا ہوٹل یا سرائے نہیں تھی جہاں میں اکیلے میں رات بسر کر سکتا۔ جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو میں نے یہی فیصلہ کیا کہ بستی سے دور کسی غیر آباد جگہ پر چل کر بیٹھ جانا چاہیے۔ ایک طرف مجھے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ میں اس طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ پندرہ بیس قبریں ادھر ادھر بنی ہوئی تھیں۔ کونے میں ایک بارہ دری میں آ کر بیٹھ گیا۔ حوض کے پانی والا کٹورا میرے پاس ہی

تھا۔ قبرستان میں آتے وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ اس حساب سے مجھے تین گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ رات جیسے جیسے گہری ہوتی گئی رات کی خاموشی زیادہ پراسرار ہو گئی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں مجھے قبرستان میں کبھی بھی ڈر نہیں لگا تھا۔ میں بڑے سکون کے ساتھ بارہ دری کے ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ اس دوران مجھے نیند بھی آنے لگی۔ مگر میں نے اپنے اوپر نیند طاری نہ ہونے دی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ آسمان پر ستارے نظر آ رہے تھے۔ جب مشرق کی طرف آسمان پر سات ستاروں کی ٹولی ایک طرف کو جھکی ہوئی دکھائی دی تو میں سمجھ گیا کہ آدھی رات گزر گئی ہے۔ میری خانہ بدوشی کے زمانے میں مجھے اس بات کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے مزید آدھا گھنٹہ انتظار کر لیا۔ جب آدھا گھنٹہ بھی گزر گیا تو میں تیار ہو گیا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر سامنے رکھ لیا۔ حوض کے پانی والا کٹورا اپنے قریب کر لیا۔ پھر رومال میں سے پاروتی کو آہستہ سے ہاتھ میں پکڑا اور اس کا منہ پانی کے کٹورے کے ساتھ لگا دیا۔ سانپ نے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا اظہار نہ کیا۔ اس نے فوراً کٹورے میں سے پانی پینا شروع کر دیا۔ اس وقت واقعی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ کیونکہ میرے سامنے ایک کرامت ہونے والی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ سانپ عورت کی شکل اختیار نہیں کرے گا۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں سانپ ضرور پاروتی کی شکل میں آ جائے گا۔ نیلے سانپ نے کٹورے میں سے آدھے سے زیادہ پانی پی لیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بارہ دری کے فرش پر لیٹ گیا۔ اس طرح سانپ کو لیٹتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

قبرستان میں چاروں طرف سناٹا اور رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بارہ دری کا فرش سفید سنگ مرمر کا تھا جس کی وجہ سے اندھیرے میں بھی نظر آ رہا تھا۔ میری نگاہیں نیلے سانپ پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک سانپ میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اپنی جگہ پر گول دائرے میں رینگنے لگا۔ کوئی ایک منٹ تک وہ اسی طرح اپنے دائرے میں رینگتا رہا۔ پھر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اپنا پھن کھول لیا اور دائیں بائیں جھومنے لگا۔ میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے سانپ میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ تک سنگ مرمر کا فرش بالکل خالی رہا۔ پھر جس جگہ سانپ بیٹھا ہوا تھا وہاں دھواں سا جمع ہونا شروع ہو گیا۔ اس دھوئیں نے آہستہ آہستہ انسانی جسم کی شکل اختیار کرنا شروع کر لی۔ پھر ہلکی سی روشنی دھوئیں میں ہوئی۔ جیسے بہت کمزور سی بجلی بادلوں میں چمک کر غائب ہو گئی ہو۔ اس روشنی کے بجھتے ہی پاروتی ظاہر ہو گئی۔ وہ میرے سامنے سانپ والی جگہ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھی۔ اندھیرے میں اس کی کیسری رنگ کی آنکھیں انگاروں کی طرح دمک رہی تھیں۔ میں نے اس کو آواز دی۔

''پاروتی پاروتی۔''

پاروتی کے چہرے پر مسکراہٹ سی نمودار ہوئی۔ پھر میں نے ایک طویل عرصے کے بعد اس کی آواز سنی۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ میں انسانی شکل میں آ کر تمہیں دیکھ رہی ہوں۔''

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ پاروتی نہ صرف انسانی شکل میں واپس آ گئی تھی بلکہ اس کی کھوئی ہوئی یادداشت بھی واپس آ گئی تھی۔ اس نے چاروں طرف بڑے غور سے دیکھا اور پوچھا۔

''میں کہاں ہوں؟ یہ کونسی جگہ ہے؟''

تب میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک

ساری کہانی بیان کردی۔ وہ حیرت سے سنتی رہی۔ جب میں نے کہانی ختم کی تو اس نے کہا۔
"مجھے کچھ یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے مجھ پر اس وقت حملہ کیا تھا جب میں سانپ کے روپ میں تھی اور میرے جسم کے ٹکڑے کردیئے تھے۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ایک پجاری نے مجھ پر منتر پھونکا تھا اور میں انسانی شکل سے سانپ کی شکل میں آگئی تھی۔ پھر میں نے تمہیں دیکھا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا تھا مگر تم سے بات نہیں کرسکتی تھی۔ جس طرح پہلے جب میں سانپ کے روپ میں ہوتی تھی تو انسانی آواز میں تم سے بات کرلیا کرتی تھی۔ اس حالت میں میں کسی کسی وقت بالکل مدہوش ہوجاتی تھی لیکن مجھے یاد ہے کہ تم مجھے لے کر ایک مسلمان بزرگ کے پاس گئے تھے میں نے ان کے چہرے کے گرد نور کی روشنی دیکھی تھی اور میں نے ان کی بے حد تعظیم وتکریم کی تھی۔"
میں نے پاروتی سے کہا۔
"پاروتی میں صبح بھی تمہیں ایک بزرگ کے پاس لے کر جارہا ہوں۔ بابا سدارنگ جس نے تم پر کیے گئے منتر کے طلسم کو توڑنے کا طریقہ بتایا تھا۔ انہوں نے ہی مجھے حکم دیا ہے کہ میں درگاہ شریف خواجہ خواجگان کے حوض کا پانی تمہیں پلاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور تم انسانی شکل میں واپس آگئیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ صبح پاروتی کو لے کر درگاہ شریف کی مسجد کے سامنے درخت کے نیچے ایک فقیر بیٹھا ملے گا۔ اس کے پاس جانا۔ کیا تم اس فقیر کے پاس جانا چاہتی ہو؟"
پاروتی نے کہا۔ "کیوں نہیں۔ میں ضرور جاؤں گی۔ مجھے تو اب معلوم ہوا ہے کہ تم مسلمانوں کا دین اسلام نورانی مذہب ہے اور تمہارا دین ہی سچا ہے۔ میں تو شروع ہی سے اسلام کو دل سے مانتی تھی مگر کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس فقیر کے پاس ضرور لے چلو۔ میں چاہتی ہوں کہ اس فقیر کے ہاتھ پر مسلمان ہوجاؤں۔"
یہ بات میں چاہتا تھا کہ پاروتی خود کہے اور اپنی مرضی سے اسلام کا دین اختیار کرلے۔ اب جبکہ اس نے اس خواہش کا حرف حرف اظہار کردیا تو میں نے اسے کہا۔
"ٹھیک ہے صبح مسجد والے فقیر کے پاس چلیں گے۔ ان کے آگے تم خود اس خواہش کا اظہار کرنا۔ وہ تمہیں کلمہ پڑھا کر مسلمان کردیں گے۔"
پاروتی بڑی خوش ہوئی۔ ہم نے قبرستان کی بارہ دری میں اسی طرح پرانے دنوں کو یاد کرکے ان کی باتیں کرکے باقی کی رات گزاردی۔ جب صبح کا اجالا پھیلا تو میں اسے ساتھ لے کر درگاہ شریف والی مسجد کے پاس آگیا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کے سامنے نیم کا سایہ دار درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ایک فقیر بوریے پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا تھا۔ میں نے اور پاروتی نے قریب جاکر سلام کیا اور خاموشی اور ادب سے ایک طرف ہوکر بیٹھ گئے۔ فقیر کی آنکھیں بند تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور پاروتی کی طرف دیکھ کر کہا۔
"بچی تم بڑی خوش قسمت ہو کہ اللہ نے تمہیں سیدھی راہ دکھادی۔"
میں نے پاروتی کو اشارہ کیا۔ اس نے فقیر سے کہا۔
"باباجی میں ہندو عورت ہوں لیکن میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ مجھے مسلمان کردیں۔"
فقیر کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔
"تم پر خدا کی رحمت ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ فقیر ہمیں مسجد میں لے گیا۔ یہاں اس نے اپنی نگرانی میں پاروتی کو وضو کرایا۔ اپنے سامنے بٹھایا اور کلمہ شریف پڑھا کر مسلمان کیا اور کہا۔
"بچی ہم نے تمہارا نام پاروتی سے پروین رکھ دیا ہے۔ اب تم مسلمان ہو اور خداوند کریم نے تمہیں اپنی رحمتوں کے سائے میں لے لیا ہے۔"
پاروتی نے دعا مانگ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور فقیر سے پوچھا۔
"باباجی میرے پاس ایک طاقت تھی کہ میں انسان سے ناگن اور ناگن سے پھر انسان بن جاتی تھی۔ کیا یہ طاقت اب بھی میرے پاس رہے گی؟"
فقیر نے کہا۔ "وہ طاقت تم نے اپنی جان پر سخت مصیبتیں اٹھا کر دن رات کی چلہ کشی اور محنت سے حاصل کی ہے۔ وہ طاقت تمہارے پاس ہی رہے گی لیکن اس طاقت کو تم انسانوں کی بھلائی کے لیے استعمال کروگی۔ اپنی اس طاقت سے کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔"
پاروتی یعنی پروین نے کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں بابا کہ ایسا ہی کروں گی۔"
فقیر نے اسے دعا دی اور کہا۔ "جاؤ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔"
ہم نے فقیر کو سلام کیا اور مسجد سے نکل آئے۔ باہر آکر پروین (اب میں بھی پاروتی کو پروین ہی لکھوں گا) نے مجھ سے کہا۔
"میں کلکتہ جاکر ایک بار اپنا پرانا مکان دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"
میں کیسے انکار کرسکتا تھا لیکن دل میں ایک خیال ضرور آیا کہ کہیں اس علاقے میں گرو پجاری سے آمنا سامنا نہ ہوجائے۔ ہم پر کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔
میں نے پروین سے کہا۔
"ہمارے پاس ریل کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ ہم نے ریل میں بغیر ٹکٹ سفر کیا تو پکڑے جائیں گے۔"
پاروتی یعنی پروین سوچ میں پڑگئی۔ تھوڑی دیر غور کرتی رہی پھر بولی۔
"میرے کپڑے بھی بڑے پرانے ہوگئے ہیں اور یہ ہندوؤں کا لباس ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ مسلمان عورتوں کی طرح شلوار قمیص اور دوپٹہ اوڑھوں۔ میں اب ساڑھی کبھی نہیں پہنوں گی۔"
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"لیکن اس کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ایک بات ہوسکتی ہے۔"
"وہ کیا؟" پروین نے پوچھا۔
میں نے کہا۔
"میں دلی میں کسی دکان یا کارخانے میں نوکری کرلیتا ہوں۔ ہم پیسے جمع کرکے کلکتے کا کرایہ بھی اکٹھا کرلیں گے اور تم اپنا نیا لباس بھی بنوالینا۔"
پروین کہنے لگی۔
"تمہاری بیوقوفوں والی باتیں نہ گئیں اس طرح تو ہمیں نہ جانے کتنے دن دلی شہر میں رہنا پڑے۔ نہیں...... میں اتنی دیر انتظار نہیں کرسکتی۔"
"تو پھر ہم کیا کرسکتے ہیں؟ میرے پاس جتنے پیسے تھے وہ تو ختم ہوچکے ہیں۔ اب تو صرف اتنے پیسے ہیں کہ جس سے ہم دوپہر کا کھانا ہی کھاسکتے ہیں۔"
پروین کہنے لگی۔
"میرے ساتھ آؤ۔"
پروین نے کہا۔ "میں تمہیں اسی قبرستان میں لے جانا چاہتی ہوں جہاں ہم نے رات بسر کی تھی۔ آؤ میرے ساتھ۔"
ہم درگاہ شریف کی بستی کے پیچھے سے ہوتے

ہوئے اس قبرستان میں آگئے جو درختوں کے جھنڈ میں تھا اور جہاں ایک پرانی بارہ دری میں ہم نے رات گزاری تھی اور پروین سانپ سے انسانی شکل میں واپس آئی تھی۔ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ قبرستان میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس قبرستان میں کچھ نئی قبریں تھیں اور کچھ پرانی بھی تھیں۔ پروین نے کہا۔

''بارہ دری والی قبر پر چلو۔''

ہم بارہ دری میں آگئے۔ پروین نے قبر کے گرد ایک چکر لگا کر اس کا جائزہ لیا۔ پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس قبرستان میں کسی بادشاہ کا کوئی خزانہ دفن ہے۔''

میں اس کا منہ تکنے لگا۔

''خزانہ؟ بادشاہ کا خزانہ؟''

''ہاں۔'' پروین نے کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''لیکن اس خزانے کا سراغ کون لگائے گا؟''

پروین نے کہا۔ ''اس کا سراغ نہ تم لگا سکتے ہو نہ میں لگا سکتی ہوں۔ اس کا سراغ ایک سانپ لگائے گا۔''

''کون سا سانپ؟ مجھے تو یہاں کوئی سانپ دکھائی نہیں دیتا۔''

پروین کہنے لگی۔

''ایک سانپ اس قبرستان میں موجود ہے۔ مجھے اس کی بو آ رہی ہے۔ میں اس کو بلاتی ہوں اور خزانے کے بارے میں اس سے بات کرتی ہوں۔''

مجھے معلوم تھا کہ پروین ایسا کر سکتی ہے۔ وہ پہلے بھی سانپوں کو بلا کر ان سے اس کی زبان میں بات کیا کرتی تھی۔ میں نے کہا۔

''بھلا بلاؤ سانپ کو۔''

پروین نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہوا میں پھونک ماری اور منہ سے رک رک کر دو تین ایسی آوازیں نکالیں جیسے وہ سس سس کر رہی ہو۔ وہ کسی ان دیکھے سانپ سے اس کی زبان میں بات کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

''جو سانپ اس قبرستان میں رہتا ہے میں نے اسے بلایا ہے۔''

میں بھی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں بارہ دری کے نیچے سامنے کی جانب پرانی قبروں کے درمیان مجھے ایک کالا سانپ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ پروین نے بھی اس سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ کہنے لگی۔

''وہ دیکھو سانپ آ رہا ہے۔ اس نے میری آواز سن لی تھی۔ میں اس سے خزانے کی بابت پوچھتی ہوں۔ تم اپنی جگہ پر بالکل بے حس و حرکت ہو کر بیٹھے رہنا۔''

میں ساکت ہو کر بیٹھ گیا اتنے میں سانپ بارہ دری کے فرش پر نمودار ہوا۔ یہ کالے رنگ کا کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا سانپ تھا۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کی دھاریاں بھی تھیں۔ سانپ قبر کے اوپر سے ہو کر آیا اور پاروتی یعنی پروین کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے پھن کھولا اور تین بار سر جھکا کر پروین کو سلام کیا۔ پروین اب اس سے سانپوں کی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ وہ بات کر کے چپ ہو جاتی تو سانپ کے منہ سے بھی سس سس اور سسکار کی آوازیں نکلنے لگتیں۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا انسان اور سانپ کے درمیان یہ عجیب و غریب مکالمہ سن رہا تھا۔

جب ان کا مکالمہ ختم ہوا تو سانپ فرش پر بارہ دری کی سیڑھیوں کی طرف رینگنے لگا۔ پروین نے مجھ سے کہا۔

"سانپ ہمیں ایک مدفن شدہ خزانے کے پاس لے کر جا رہا ہے۔ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔"

سانپ سیڑھیاں اتر کر قبروں میں چلنے لگا۔ ہم دونوں بھی اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ جہاں قبرستان کی سرحد ختم ہوتی تھی وہاں ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ کھنڈر کیا تھا محض ایک موٹی دیوار تھی جس کی پرانی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں اور زمین پر ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ سانپ اس بوسیدہ دیوار کے پیچھے آ کر رک گیا۔ پروین اور میں بھی وہاں پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ پروین نے ایک بار پھر سانپ سے اس کی زبان میں باتیں شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد سانپ دیوار کے قریب اینٹوں کے ڈھیر میں گھس گیا۔ میں نے پروین سے پوچھا۔

"سانپ کہاں گیا ہے؟"

وہ بولی۔ "یہاں کسی مغل بادشاہ کا بڑا قیمتی خزانہ دفن ہے۔ یہ خزانہ زمین سے کئی گز نیچے دفن ہے۔ میں نے سانپ کو حکم دیا ہے کہ وہ بادشاہ کے مدفون خزانے میں سے کوئی قیمتی ہیرا موتی نکال کر لے آئے۔ کیونکہ ہم نے سارا خزانہ لے کر کیا کرنا ہے، جتنی ہمیں ضرورت ہے ہم اتنا ہی لے لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ یہ تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ اتنی زیادہ دولت لے کر ہم کیا کریں گے۔"

ہم وہیں اینٹوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھ کر سانپ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد سانپ اینٹوں میں سے باہر آتا نظر آیا۔ اس نے منہ میں ایک سرخ رنگ کا آلوچے جتنا بڑا موتی پکڑا ہوا تھا۔ سانپ نے وہ سرخ موتی پاروتی کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اگر میں اپنی داستان بیان کرتے کرتے پروین کی جگہ پاروتی کا نام بول جاؤں تو کوئی خیال نہ کیجیے گا بلکہ اسے پروین ہی سمجھیے گا۔ کیونکہ پاروتی کے اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام فقیر بابا نے پروین رکھ دیا تھا۔ پروین نے موتی اٹھا کر غور سے دیکھا پھر مجھے دکھایا اور کہنے لگی۔

"مجھے ہیرے موتیوں کی زیادہ پہچان نہیں ہے کیا تمہیں پہچان ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں بھی اس معاملے میں تمہاری طرح اناڑی ہوں۔ یہ تو کوئی جوہری ہی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ موتی کتنا قیمتی ہے۔"

پروین نے سانپ کو اس کی زبان میں واپس جانے کا حکم دیا۔ سانپ سر جھکا کر پروین کو سلام کر کے قبروں کی طرف چلا گیا اور غائب ہو گیا۔ پروین کہنے لگی۔

"چلو اب دلی کے صرافہ بازار میں چل کر اس موتی کو کسی جوہری کے پاس فروخت کرتے ہیں۔ اس کو بیچ کر جو روپے ملیں گے ان سے ہم کلکتے چلے جائیں گے۔"

ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ موتی کس قدر قیمتی ہے۔ یہ راز تو دلی کے صرافہ بازار میں پہنچنے کے بعد کھلا۔ ہم دونوں قبرستان سے نکلے اور بستی درگاہ شریف میں سے ایک تانگے میں بیٹھ کر شہر آ گئے۔ شہر پہنچ کر پوچھتے پوچھتے صرافہ بازار میں آئے تو وہاں دکانوں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ دن کے وقت بھی دکانوں میں بڑے بڑے بلب روشن تھے۔ شیشے کی الماریوں میں سونے کے زیورات چمک دمک رہے تھے۔ جوہری اپنی دکانوں پر بیٹھے کاروبار میں مصروف تھے۔

پروین نے پوچھا۔

"کس جوہری کے پاس چلیں گے؟"

میں نے کہا۔ "کسی کے پاس بھی چلے چلتے ہیں۔

ہمیں تو یہ موتی بیچنا ہے۔ ہمیں اس سے کیا کہ جوہری کیسا ہے؟"

میں پروین کو ساتھ لے کر ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ جوہری ہندو سیٹھ تھا۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ توند نکلی ہوئی تھی۔ پیچھے دیوار پر لکشمی دیوی کی تصویر لگی تھی جس پر گیندے کے پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ میں اور پروین لباس ہی سے مسلمان لگتے تھے۔ جوہری نے ہمیں ایک نظر دیکھا اور ہمیں بے حیثیت سمجھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی ٹانکا وغیرہ لگوانا ہے تو دوسرے بازار میں جاؤ۔ یہاں زیوروں کو ٹانکا لگانے کا کام نہیں ہوتا۔"

اس حقیقت کا شروع ہی سے مجھے تجربہ ہو چکا تھا کہ بھارت کے ہندو اپنے آپ کو مسلمانوں سے برتر سمجھتے ہیں اور دل میں مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ انہیں مزدور کی حیثیت دیتے ہیں۔ مجھے ہندو سیٹھ کا یہ توہین آمیز رویہ سخت برا لگا۔ اسے پروین نے بھی محسوس کیا۔ خزانے کا موتی میری جیب میں تھا۔ میں نے کہا۔

"ہم کسی زیور کو ٹانکا لگوانے نہیں آئے۔"

ہندو سیٹھ نے چڑ کر کہا۔

"تو پھر منہ اٹھائے اندر کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ایک خاندانی موتی ہے۔ ہمارے حالات ٹھیک نہیں رہے۔ ہم اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

ہندو سیٹھ نے بے اعتنائی سے کہا۔

"دکھاؤ دکھاؤ میاں کونسا موتی ہے نکالو۔ ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔"

میں نے مدفون خزانے کا سرخ موتی نکال کر سیٹھ کے سامنے شیشے کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ میری نگاہیں سیٹھ کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ موتی کو دیکھتے ہی سیٹھ کے چہرے پر ایک نمایاں تبدیلی ظاہر ہو گئی تھی۔ اس نے آلوچے کے سائز کا سرخ موتی اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس سے زیادہ قیمتی موتی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا مگر ہندو سیٹھ بڑا کائیاں اور مکار آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ یہ انمول موتی ہمیں کہیں سے ہاتھ لگ گیا ہے۔ فوراً ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ بے نیازی سے موتی ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ نقلی موتی ہے میاں صاحب اس کو لے جاؤ۔"

پروین نے کہا۔

"لالہ جی! یہ موتی نقلی نہیں ہے۔ اصلی ہے، آپ اسے غور سے دیکھیں۔"

ہندو سیٹھ نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

"بی بی! یہ نقلی ہے۔ میں نے غور سے دیکھ لیا ہے۔"

میں نے موتی اٹھا لیا۔ سیٹھ کے پاس اس کا ایک ملازم شیشے کے شوکیس کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ وہ اپنے لباس سے مسلمان لگتا تھا۔ اس نے بھی موتی کو دیکھا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے جس بادشاہ کے خزانے کا یہ موتی ہے اس کو کسی نے نقلی موتی دے دیا ہو۔ اتنے میں ہندو سیٹھ کو اندر سے کسی نے آواز دی۔ وہ کرسی پر سے اٹھ کر دکان کے اندر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ملازم نے ہماری طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ موتی اصل ہے اور بڑا قیمتی ہے۔ ہندو لالے کی باتوں میں نہ آنا۔"

یہ کہہ کر مسلمان ملازم شوکیس کی جھاڑ پونچھ کرتا دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے پروین سے کہا۔

"لگتا ہے یہ ہندو سیٹھ ہم سے یہ قیمتی موتی اونے پونے ہتھیانا چاہتا ہے۔"

پروین نے کہا۔
''جو دیتا ہے لے لو۔ ہمیں اتنے پیسے لے کر کیا کرنا ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''مگر ہم بیوقوف بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سیٹھ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔''
اس دوران ہندو سیٹھ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ہماری طرف متوجہ ہو کر بولا۔
''میاں! ایک بات کروں گا۔ میں اس موتی کے تمہیں پانچ روپے دے دوں گا۔ ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں دوں گا۔ منظور ہے تو موتی دے جاؤ۔''
میں نے کہا۔ ''مگر سیٹھ صاحب! یہ بڑا قیمتی موتی ہے۔''
''تو تم اس کا کیا لو گے؟ تم ہی بتا دو۔''
ہندو سیٹھ نے ترش لہجے میں کہا۔ میں نے کہا۔
''ہم تو اس کے کم از کم پانچ ہزار روپے لیں گے۔''
ہندو سیٹھ بولا۔
''میرا بڑا بھائی اندر کمرے میں بیٹھا ہے میں اس سے بات کرتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔''
ہمیں معلوم نہیں تھا کہ سیٹھ اندر پہلے ہی سے اپنے بڑے بھائی سے بات کر آیا تھا کہ مغلیہ دور کا ایک نایاب موتی بکنے کو آیا ہے جو اتنا قیمتی ہے کہ ہم ساری دکان بیچ کر بھی اسے نہیں خرید سکتے۔ میں نے موتی جیب میں رکھ لیا اور ہندو سیٹھ کے ساتھ دکان کے اندر جو چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا وہاں آ گئے۔ کمرے میں میز کرسیاں لگی تھیں۔ ایک بڑی مکار شکل والا ہندو لالہ کرسی پر بیٹھا ترازو میں چھوٹے چھوٹے سفید موتی تول رہا تھا یہ سیٹھ کا بڑا بھائی تھا۔ سیٹھ بھی ہمارے ساتھ ہی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔
''یہ نقلی موتی کے پانچ ہزار مانگتے ہیں۔ مکند لال جی!''
مکند لال نے ہماری طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ترازو ایک طرف رکھا اور بولا۔ ''لاؤ دکھاؤ کونسا موتی ہے؟''
میں نے سرخ موتی اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے موتی کو الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔
''یہ موتی تو چوری کا ہے۔ تم لوگوں نے کہاں سے چرایا ہے؟ سچ سچ بتا دو نہیں تو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''
مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا۔
''یہ چوری کا نہیں ہے۔ یہ ہمارا خاندانی موتی ہے۔ ہمارے حالات خراب ہو گئے ہیں۔ اس لیے اس خاندانی موتی کو فروخت کرنا چاہتے ہیں۔''
ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس دوران مکند لال پولیس کو اطلاع کر چکا تھا۔ ہم ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک دم سے ایک سکھ تھانیدار اور تین سپاہی کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی مجھے اور پروین کو حراست میں لے لیا۔ سکھ تھانیدار نے اسی وقت مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ میں نے سخت احتجاج کیا مگر میری کسی نے نہ سنی۔ سپاہی مجھے اور پروین کو پکڑ کر دکان کے باہر لے آئے۔ باہر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ہمیں زبردستی گاڑی میں دھکیل دیا گیا اور گاڑی تھانے کی طرف روانہ ہو گئی۔
تھانے پہنچ کر مجھے اور پروین کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ میں نے پروین سے کہا۔
''تم دیکھ رہی ہو کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے پھر تم اپنی طاقت سے کام کیوں نہیں لیتیں؟''
پروین کہنے لگی۔
''میں ایک خاص وقت کا انتظار کر رہی ہوں۔''
اتنے میں سکھ تھانیدار حوالات کی سلاخوں والے

دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بڑی رعونت سے بولا۔
''سچ سچ بتا دو تم نے موتی کہاں سے چرایا ہے۔ نہیں تو عدالت کی طرف سے تم دونوں کو پانچ پانچ سال کی سزا ہو جائے گی۔''
میں نے سکھ تھانیدار کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم چور نہیں ہیں۔ یہ ہمارا خاندانی موتی ہے مگر وہ نہ مانا اور چلا گیا۔ اس حوالات میں پہلے سے ایک ملزم کمبل اوڑھے کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب تھانیدار چلا گیا تو ملزم نے ہم سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ بولا۔
''یہ تھانیدار صرافہ بازار کے ہندو سیٹھوں سے ملا ہوا ہے۔ جب بھی کوئی کم حیثیت کا آدمی کوئی قیمتی زیور یا ہیرا موتی لے کر آتا ہے تو سیٹھ سکھ تھانیدار کی مدد سے اسے حوالات میں پہنچا دیتا ہے اور اس کا مال خود ہضم کر جاتا ہے۔ تھانیدار کو ہندو سیٹھ ہر ماہ ایک خاص رقم رشوت کے طور پر دیتا ہے۔''
میرے ساتھ پروین بھی اس ملزم کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔
''بتاؤ۔ کیا اب بھی تم خاموش رہو گی؟''
پروین کہنے لگی۔
''اب میرا فرض بن گیا ہے کہ میں سادہ لوح لوگوں کو ان ٹھگوں سے نجات دلاؤں۔''
پھر اس نے ملزم کی طرف دیکھا جس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی مگر مجرمانہ زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ کمزور اور زیادہ عمر کا لگ رہا تھا۔ پروین نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
''کیا اس آدمی کے سامنے طاقت کا مظاہرہ کروں؟''
میں نے کہا۔ ''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''
پروین کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگی۔
''تم حوالات میں میرا انتظار کرو۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گی۔''
ملزم نے حیران ہو کر پوچھا۔
''بی بی! حوالات کو تو باہر سے تالا لگا ہے باہر سنتری بھی پہرہ دے رہا ہے۔ تم کیسے باہر جاؤ گی؟''
پروین نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ دیوار کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ زور سے لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ملزم تعجب سے پروین کو تک رہا تھا کہ یہ عورت لمبے لمبے سانس کیوں لے رہی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔
''بھائی! کیا تمہاری گھر والی کو کوئی بیماری لگی ہوئی ہے؟''
میں نے اسے جھڑک دیا۔
''خاموش رہو۔''
ملزم چپ ہو گیا۔ اس دوران پروین اچانک ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ یک بالشت بھر کا نیلا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ حوالاتی ملزم کا رنگ اڑ گیا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سانپ کو دیکھنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس کی زبان سے صرف اتنا نکلا۔
''س س سانپ۔''
اور وہ وہیں دہشت کے مارے بے ہوش ہو کر لڑھک گیا۔ مجھے پروین کی آواز آئی۔
''میں ابھی آتی ہوں۔''
حوالات کے دروازے پر جو سنتری پہرہ دے رہا تھا وہ اسٹول پر بیٹھا تھا اور اس کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ پروین سانپ کے روپ میں حوالات کی سلاخوں میں سے رینگ کر باہر نکل گئی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ سانپ سنتری کی ٹانگوں کے قریب گیا اور میرے دیکھتے دیکھتے اس نے سنتری کو ڈس دیا۔

سنتری ذرا سا اچھلا اس نے اپنی ٹانگ کو جھک کر دیکھا اور وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حوالات تھانے کی عمارت کے کونے میں واقع تھی۔ یہاں سے تھانے کے دفتر پر نظر نہیں پڑتی تھی۔ سنتری کے بے ہوش ہوتے ہی پروین سانپ سے انسانی شکل میں واپس آ گئی۔ سنتری کی بیلٹ کے ساتھ چابیوں کا گول رنگ لٹکا ہوا تھا۔ پروین نے رنگ نکالا۔ اس میں سے ایک چابی حوالات کے تالے کو لگتی تھی۔ پروین نے دو تین چابیاں لگائیں۔ چوتھی چابی لگ گئی۔ وہ دروازہ کھول کر بولی۔

"باہر آ جاؤ۔"

میں جلدی سے حوالات سے باہر آ گیا۔ ہم دونوں حوالات کے پیچھے سے تیز تیز چلتے سڑک پر آ گئے۔

سڑک پر آتے ہی میں نے پروین سے کہا۔

"ہمارا موتی اس کمینے ہندو سیٹھ کے قبضے میں ہے۔ ہمیں اس سے اپنا موتی واپس لینا ہے۔"

پروین بولی۔ "ہم وہیں جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تھانیدار کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ ہم حوالات سے فرار ہو گئے ہیں۔ وہ ضرور ہماری تلاش میں پولیس لے کر ہندو سیٹھ کی دکان پر آئے گا۔"

پروین نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ اب میں ان سب ٹھگوں سے سمجھ لوں گی۔"

میں نے پروین سے پوچھا کہ کیا اس نے سنتری کو ہلاک کر دیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔

"نہیں، میں اب کسی بھی انسان کو ناحق ہلاک نہیں کر سکتی۔ مجھے میرا دین اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میری طاقت صرف انسانیت اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف استعمال ہونے کے لیے وقف ہے۔"

ہم جتنی جلدی نکل سکتے تھے پولیس اسٹیشن کے علاقے سے نکل گئے۔ ہمارے پاس اب اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ تانگے یا رکشے میں بیٹھ کر صرافہ بازار پہنچتے۔ ہمیں صرافہ بازار کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ پوچھتے پوچھتے جب ہم صرافہ بازار میں آئے تو شام ہو چکی تھی اور بازار کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔

میں نے پروین سے کہا۔

"مجھے خطرہ ہے کہ پولیس سیٹھ کی دکان پر ہمارا انتظار نہ کر رہی ہو۔ پولیس ہماری تلاش میں یہاں ضرور آئی ہوئی ہوگی۔"

پروین بازار میں ایک طرف رک گئی۔ ہندو سیٹھ کی دکان ہم نے پہچان لی تھی۔ وہ ہم سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ بازار میں لوگوں کی کافی آمدورفت تھی۔ سونے چاندی کے زیورات سے بھری ہوئی دکانیں دن کے مقابلے میں شام کے وقت زیادہ جگمگا رہی تھیں۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہندو سیٹھ سے ہمیں اپنا قیمتی موتی بھی واپس لینا ہے۔"

پروین کہنے لگی۔

"ایک کام کرتے ہیں۔ میں سانپ کا روپ بدلتی ہوں۔ تم مجھے اپنی جیب میں چھپا لینا۔ اس کے بعد سیٹھ کے پاس جا کر اس سے اپنا موتی واپس مانگنا۔ اگر اس نے سیدھے سبھاؤ دے دیا تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ ہم سیٹھ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ اگر اس نے موتی دینے سے انکار کیا تو پھر میں معاملہ خود ہی ٹھیک کر لوں گی۔"

بازار میں لوگ آ جا رہے تھے۔ وہاں پروین سانپ کا روپ اختیار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔

"وہ ایک گاڑی کھڑی ہے۔ اسکے پیچھے آ جاؤ۔"

بازار میں ایک دکان کے قریب بند گاڑی کھڑی

تھی میں اور پروین اس کے پیچھے چلے گئے۔ اب ہم لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ پروین نے آنکھیں بند کر کے دو تین گہرے سانس لیے۔ دوسرے لمحے میرے سامنے زمین پر ایک نیلے رنگ کا سانپ موجود تھا۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور تیز تیز قدموں سے ہندو سیٹھ کی دکان کی طرف چل پڑا۔

مجھے باہر کوئی پولیس کا سپاہی دکھائی نہ دیا۔ ہندو سیٹھ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا بہی کھاتہ کھول کر اس پر کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

"لالہ جی! ہمارا موتی واپس کر دو۔ میں اپنا موتی واپس لینے آیا ہوں۔"

ہندو سیٹھ نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک دم غصے میں آ کر بولا۔

"تم چور ہو۔ تم حوالات توڑ کر بھاگے ہو۔ پولیس تمہارے پیچھے لگی ہے۔ میں ابھی تھانیدار صاحب کو فون کرتا ہوں۔"

وہ ٹیلی فون کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے اس بازو کھینچ لیا اور کہا۔

"ہم فساد نہیں کرنا چاہتے ہم کسی کو کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ تم نے ہمارا قیمتی موتی پولیس کی ملی بھگت سے ہم سے ہتھیا لیا ہے۔ وہ ہمیں واپس کر دو۔"

دکان کے دو ملازم ایک دم وہاں آ گئے۔ سیٹھ نے چلا کر کہا۔

"اس کو پکڑ لو۔ یہ جیل سے بھاگا ہوا چور ہے۔"

جیسے ہی سیٹھ کے نوکر میری طرف بڑھے میں نے جیب سے سانپ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور چلا کر بولا۔

"خبردار! اگر کوئی میرے قریب آیا تو زندہ نہیں بچے گا۔"

میں نے سیٹھ سے ایک بار پھر کہا۔

"سیٹھ میری امانت واپس کر دو۔ یہ ہماری شرافت ہے کہ ہم نے ابھی تک تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"

ایک ملازم نے مجھے پیچھے سے ایسا دھکا دیا کہ سانپ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر کاؤنٹر پر جا گرا۔ ملازموں نے مجھے قابو کر لیا اور نوکر سانپ کو مارنے کے لیے بڑھے اچانک سانپ نے ایک خوفناک پھنکار ماری۔ میں نے دیکھا کہ پھنکار کے ساتھ سانپ کے منہ سے چنگاریوں کی پھل جھڑیاں سی نکل کر شراروں کی طرح دکان کے اندر اڑنے لگیں۔ سب خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دبک گئے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں دکان کے اندر جو چھوٹا سا کمرہ تھا شور سن کر اس کے اندر سے ہندو سیٹھ کا مکار بھائی بھی باہر آ گیا۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ سانپ کو کسی شے سے مار نہ دیں۔ مگر پروین اتنی ناسمجھ نہیں تھی کہ اپنے آپ کو سانپ کے روپ میں ان کے آگے زیادہ دیر تک رہنے دیتی۔

دوسری پھنکار کے ساتھ ہی اس نے انسانی شکل اختیار کر لی۔ اس کرامت کی وہاں اشد ضرورت تھی۔ صرف یہی ایک طریقہ ان ضعیف الاعتقاد توہم پرست ہندوؤں کو مطیع کرنے کا رہ گیا تھا۔ ذرا تصور کریں کہ آپ کے سامنے ایک سانپ بیٹھے بیٹھے اچانک عورت بن جائے تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ آپ تو ششدر رہ جائیں گے۔ یہی حال وہاں دکان کے اندر ملازموں اور دکان کے دونوں ہندو سیٹھوں کا ہوا۔ پروین کو ان لوگوں نے پہچان لیا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو میرے ساتھ موتی بیچنے دکان پر آئی تھی مگر یہ بات وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ عورت حقیقت میں ایک ناگن ہے جو عورت کی شکل

میں چل پھر رہی تھی۔ ان لوگوں پر ایک دہشت طاری ہوگئی تھی۔ پروین کاؤنٹر سے نیچے اتر آئی۔ اس نے سیٹھ سے کہا۔

''جو موتی ہم تمہارے پاس لائے تھے وہ ہمیں واپس کردو۔''

ہندو سیٹھ سے مارے دہشت کے بات نہیں ہو رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ ہاتھ سوائے مسلمان نوکر کے سب نے جوڑے ہوئے تھے۔ وہ پروین کو کوئی آسمانی دیوی سمجھ رہے تھے۔ ہندو سیٹھ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے شما کردو دیوی جی۔''

پروین نے کہا۔

''زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہمارا موتی نکالو۔''

سیٹھ نے اس وقت ایک دراز کھولا۔ اس میں سے ہمارا آلوچے کے سائز کا سرخ موتی نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر رحم طلب انداز میں بولا۔

''دیوی میا! میری غلطی معاف کردو۔ ہم سے بھول ہوگئی تھی۔ ہمیں شما کردو۔''

پروین نے موتی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''یہی موتی ہے نا؟''

میں نے موتی کو غور سے دیکھا۔ وہ خزانے والا موتی ہی تھا۔ میں نے کہا۔

''موتی تو وہی ہے مگر ان دھوکے بازوں اور لٹیروں کو بھی کچھ سزا ملنی چاہیے۔ نہ جانے انہوں نے کتنے ضرورت مند غریب لوگوں کو لوٹا ہوگا۔''

دونوں سیٹھ ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگے۔ دکان کے ملازموں پر تو سانپ کے اچانک انسان بن جانے کے شعبدے کا اس قدر شدید اثر ہوا تھا کہ وہ جیسے سکتے کے عالم میں تھے اور ایک طرف دبکے ہمیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہے تھے کہ یہ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔

پروین نے کہا۔

''میں اگر چاہوں تو صرف ایک پھنکار مار کر تمہاری ساری دکان کو جلا کر راکھ کرسکتی ہوں۔ مگر میرا دین اسلام مجھے حکم دیتا ہے کہ اگر ایک آدمی اپنے گناہوں سے توبہ کرلے اور آئندہ وہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کرے تو اسے معاف کردو۔ اگر تم مجھ سے سچا وعدہ کرو کہ تم آئندہ کسی کے ساتھ دھوکہ نہیں کروگے۔ کسی مصیبت زدہ کی مصیبت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو میں تمہیں معاف کرسکتی ہوں۔ ورنہ میرے صرف ایک بار پھنکارنے کی دیر ہوگی اور ساری دکان شعلوں سے بھڑکنے لگے گی۔''

دونوں سیٹھ پروین کے آگے سجدے میں گر گئے۔ پروین نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''دیکھو یہ فرق ہوتا ہے ایک مسلمان اور ہندو میں۔ مسلمان خدا کے سوا کبھی کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ مگر ان دونوں ہندوؤں کی جب جان پر بنی تو میرے آگے سجدے کرنے لگے ہیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد پروین میں ایک زبردست اور تعمیری تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے دونوں ہندو سیٹھوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں معاف کرتی ہوں لیکن یاد رکھنا۔ اگر اب تم نے کسی کو دھوکا دے کر اس کا مال لوٹا تو میں جہاں بھی ہوں گی اسی وقت یہاں پہنچ جاؤں گی اور تمہاری دکان کو آگ لگادوں گی۔''

دونوں بھائی سجدے سے سر اٹھا کر روتے ہوئے بولے۔

''دیوی! ہم کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیں گے۔''

پروین نے کہا۔

''ٹھیک ہے اب آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

پروین کاؤنٹر سے نیچے اتر آئی۔ اس نے دکان کے ملازموں سے کہا۔

''تم لوگ بھی اپنے اپنے کام میں مصروف ہوجاؤ۔ سمجھو کہ یہاں کچھ نہیں ہوا۔''

پھر اس نے سیٹھ سے کہا۔

''لالہ جی! اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر دکان کے پچھلے کمرے میں چلو۔''

دونوں سیٹھ فوراً دکان کے پچھلے کمرے میں آگئے۔ پروین نے میری طرف گردن موڑ کر کہا۔

''آخر ہمیں موتی بھی فروخت کرنا ہے۔''

دکان کے عقبی کمرے میں آکر پروین نے دروازہ بند کردیا اور مجھ سے کہا۔

''موتی نکال کر مجھے دو۔''

میں نے جیب سے موتی نکال کر پروین کے حوالے کردیا۔ اس وقت دونوں سیٹھ میز کے قریب کرسیوں پر سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ پروین نے سرخ موتی ان کے سامنے میز پر رکھ دیا اور کہا۔

''اب دیانت داری سے بتاؤ کہ اس موتی کی اصل قیمت کتنی ہے؟''

ہندو سیٹھ نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

''دیوی جی! اگر آپ اس کی اصل قیمت پوچھتی ہیں تو وہ اتنی زیادہ ہے کہ میں اپنی ساری دکان زیوروں اور ہیرے جواہرات کے ساتھ فروخت کردوں تو اس موتی کی آدھی قیمت بھی ادا نہیں ہوگی۔ یہ سرخ موتی نایاب ہے۔ اس ملک کا امیر سے امیر آدمی بلکہ راجہ مہاراجہ بھی اس موتی کی قیمت ادا نہیں کرسکتا۔''

پروین کہنے لگی۔

''ٹھیک ہے ہم یہ موتی تمہارے پاس فروخت نہیں کریں گے کیونکہ تم اس کی اصل قیمت ادا نہیں کرسکتے مگر تم نے ہم دونوں کی بے عزتی کی ہے تمہاری وجہ سے ہمیں پولیس چوروں کی طرح ہتھکڑی لگا کر لے گئی اور حوالات میں بند کردیا۔ تمہیں اس کا ہرجانہ دینا ہوگا۔''

لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''میں ہرجانہ بھرنے کو تیار ہوں۔ آپ حکم کریں دیوی جی!''

میں دل میں پروین کی ذہانت کی تعریف کرنے لگا۔ اس نے اچھا کیا جو اونے پونے موتی ان دھوکے بازوں کے پاس فروخت نہیں کیا۔ یہ اس لائق نہیں تھے کہ اربوں روپے کی مالیت کا قدیم انمول موتی ان کو چند ہزار روپوں کے عوض دے دیا جاتا۔ پروین نے کہا۔

''تمہاری تجوری میں جتنے کرنسی نوٹ ہیں سب یہاں منگواؤ۔''

''جو حکم دیوی جی۔''

لالہ جی نے اپنے چھوٹے بھائی کو چابی دے کر کہا۔

''مکندلال جی! تجوری کا سارا مال لے آؤ۔''

مکندلال باہر چلا گیا۔ پروین کہنے لگی۔

''تم لوگ دیوی دیوتاؤں کی پوجا بھی کرتے ہو اور لوگوں سے دھوکے بھی کرتے ہو۔ ان کی دولت لوٹتے ہو۔ یقین کرو، اگر میں مسلمان نہ ہوتی تو تم دونوں بھائیوں کو کبھی زندہ نہ چھوڑتی۔''

سیٹھ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''دیوی جی! کیا آپ مسلمان ہیں؟''

پروین نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"خاموش ہو کر بیٹھے رہو۔"

سیٹھ وہیں سہم کر دبک گیا۔ اتنے میں اس کا بھائی تھیلے میں تجوری کی ساری دولت ڈال کر آ گیا۔ اس نے سارے نوٹوں کی گڈیاں میز پر الٹ دیں۔

پروین نے مجھ سے پوچھا۔

"ہمیں کتنی رقم کی ضرورت ہوگی؟"

میں نے کہا۔"میرا خیال ہے پانچ دس ہزار روپے کافی ہوں گے۔"

میں نے دیکھا کہ دونوں ہندو سیٹھوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی کہ صرف پانچ دس ہزار روپے میں ان کی جان چھوٹ رہی تھی۔ پروین نے دس ہزار روپے کے نوٹ جو کہ سو سو کی شکل میں تھے گن کر نکال لیے انہیں رومال میں باندھ کر میرے حوالے کیا اور ہندو سیٹھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"اس دولت میں سے تمہاری جائز کمائی کتنی ہے؟"

سیٹھ آئیں بائیں کرنے لگا۔ پروین نے سخت لہجے میں چلا کر کہا۔

"بکواس بند کرو۔ یہ بتاؤ اس میں سے تمہاری جائز کمائی کتنی ہے۔ خبردار جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں سب کچھ جانتی ہوں صرف تمہاری زبان سے سچ سننا چاہتی ہوں۔"

سیٹھ نے ہاتھ باندھ کر کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ابھی بتاتا ہوں دیوی جی!"

اس نے میز پر رکھی کرنسی نوٹوں کی گڈیوں کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصہ اپنی طرف کر کے باقی دو حصوں کے نوٹ الگ کر کے بولا۔

"دیوی جی! یہ دو حصے میری جائز کمائی کے نہیں ہیں۔ جتنی میری جائز کمائی تھی وہ میں نے اپنی طرف کر لی ہے۔"

تب پروین نے کہا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔"

دونوں سیٹھ کرسیوں پر سے اٹھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ پروین نے میرے دیکھتے دیکھتے پھنکار ماری۔ اس کے منہ سے چنگاریاں نکل کر نوٹوں کی گڈیوں پر پڑیں اور انہیں آگ لگ گئی۔ مجھ سے کہا۔

"چلو۔ اب یہاں ہمارا کوئی کام نہیں۔ میں نے اس سیٹھ کی حرام کی کمائی کو آگ لگا دی ہے۔"

دونوں سیٹھ گھبرا کر آگ بجھانے کی کوشش میں لگ گئے اور ہم دونوں کمرے سے نکل کر دکان سے باہر آ گئے۔ میں نے پروین سے کہا۔

"وہ کم بخت تو آگ بجھا کر نوٹوں کو بچا لیں گے۔"

پروین نے مسکرا کر کہا۔

"ان کا باپ بھی اس آگ کو نہیں بجھا سکتا وہ آگ جہنم کی آگ ہے۔"

ہم صرافہ بازار میں سے گزرتے ہوئے چوک میں آئے تو رکشا ٹیکسی دیکھنے لگے۔ میں نے پروین سے کہا۔

"یہاں سے سیدھا اسٹیشن پر چلتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ کلکتے کی گاڑی کس وقت چلتی ہے۔"

وہ بولی۔"ہمارے پاس اتنے پیسے ہیں۔ آخر ان کو بھی تو ٹھکانے لگانا ہوگا۔ میرا دل تاج محل دیکھنے کو چاہتا ہے۔ چلو یہاں سے آگرہ چلتے ہیں۔ آج کل چاندنی راتیں ہیں۔ سنا ہے چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ بڑا دلکش ہوتا ہے۔"

مجھے خود بھی تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے پاس روپے بھی کافی تھے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو آگرے چلتے ہیں۔ چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ دیکھیں گے۔"

ہم نے چوک میں سے ایک خالی ٹیکسی پکڑی اور

سیدھا دلی کے ریلوے اسٹیشن پر آ گئے۔ میرے پاس دس ہزار روپے کی رقم سو سو کے نوٹوں میں موجود تھی جسے میں نے رومال میں لپیٹ کر اپنی قمیص کے اندر کمر کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ صرف سو سو کے دس نوٹ نکال کر واسکٹ کی جیب میں رکھ لیے تھے۔ اس زمانے میں سو روپے کے نوٹ کی بڑی قیمت ہوتی تھی۔ تڑوا لو تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کرنے کے لیے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا تو وہ بولا

"صاحب جی میرے پاس چھٹا نہیں ہے۔"

پروین نے پوچھا۔"تمہارا کیا نام ہے بھائی؟"

ٹیکسی والا بولا۔"محمد حنیف۔"

پروین نے میرے ہاتھ سے سو روپے کا نوٹ لے کر اسے دیا اور کہا۔

"یہ تم رکھ لو۔ یہ تمہارا ہے۔"

اور وہ ٹیکسی والے کو حیران و پریشان چھوڑ کر مجھے ساتھ لیے اسٹیشن کی لابی کی طرف چلنے لگی۔ میں نے پروین کے اس فراخ دلانہ عمل پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

آگرہ جانے والی گاڑی ہمیں رات کے نو بجے ملی۔ اس گاڑی نے ہمیں رات کے پچھلے پہر آگرہ پہنچا دیا۔ اسٹیشن سے باہر آ کر میں نے پروین سے کہا۔

"پروین! ہمارے پاس خرچ کرنے کے لیے بہت پیسے ہیں۔ ہم کسی اچھے ہوٹل میں کمرہ لے لیتے ہیں۔"

پروین مسکرا رہی تھی کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے چلو کسی اعلیٰ ہوٹل میں چلتے ہیں۔"

اسٹیشن کے باہر ہم نے ٹیکسی لی اور اسے کہا کہ شہر کے سب سے اچھے ہوٹل میں لے چلو۔ اس زمانے میں ابھی فائیو اسٹار ہوٹلوں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ انگریزوں کی سہولیات کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑے بڑے شہروں میں دو تین اعلیٰ ہوٹل ضرور بنے ہوتے تھے۔ ٹیکسی والا ہمیں آگرہ شہر کے مضافات میں اسی قسم کے ایک اعلیٰ ہوٹل میں لے آیا۔ یہ ہوٹل ایک بہت عالی شان کوٹھی کی شکل کا تھا۔ اردگرد باغیچہ تھا جس میں درخت اور پھولوں کے قطعے تھے۔ دوسری منزل کی ٹیرس پر بتیاں روشن تھیں۔ ہوٹل کے پورچ میں ایک جانب تین چار موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سارے ہوٹل پر ایک بڑی سنجیدہ قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اور پروین ہوٹل کی لابی میں اس جگہ آ گئے جہاں کاؤنٹر کے پیچھے ایک خوش پوش نوجوان موجود تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"ہمیں ایک کمرہ چاہیے۔"

اس نے ہم دونوں کو اوپر سے نیچے تک ایک سرسری سی نظر سے دیکھا اور رجسٹر کھول کر بولا۔

"سر! آپ کو سنگل بیڈ والا کمرہ چاہیے کہ ڈبل بیڈ والا؟"

میں نے کہا۔"ڈبل بیڈ والا۔"

اس نے کاروباری خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ڈبل بیڈ والے کمرے کا چوبیس گھنٹے کا کرایہ سو روپے ہوگا۔"

اس زمانے کا سو روپیہ آج کے دو ہزار روپے کے برابر ہوتا تھا۔

میں نے واسکٹ کی جیب سے سو سو کے تین نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم تاج محل کی سیر کرنے آئے ہیں ہو سکتا ہے زیادہ دن ٹھہریں۔ فی الحال آپ تین دن کا کرایہ جمع کر لیں۔"

کاؤنٹر کلرک نے میرا اور پروین کا نام رجسٹر میں درج کیا اور ہمارا ایڈریس پوچھا۔ میں نے دلی شہر کا ایک جعلی ایڈریس لکھوا دیا۔ ہوٹل کا ملازم ہمیں ساتھ

لے کر دوسری منزل میں آیا اور کمرہ کھول دیا۔ یہ تین کمرے تھے۔ دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم۔ کچن باتھ ساتھ ہی تھا۔ ہم نے سب سے پہلے باری باری نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے بیڈ روم میں جا کر لیٹ گئے۔

دوسرے دن ہم نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ آگرہ کے بڑے بازار میں جا کر اپنے لیے نئے کپڑے نئے جوتے اور جرسیاں وغیرہ خریدیں۔ پروین نے اپنے لیے معمولی سنگھار کا کچھ سامان خریدا۔ ہوٹل میں واپس آ کر ہم نے ناشتہ کیا اور نئے کپڑے پہن کر ٹیکسی لی اور تاج محل کی سیر کو نکل گئے۔

چاندنی رات کو تو ہمیں تاج محل دیکھنا ہی تھا مگر میں دن کے وقت بھی اس تاریخی عمارت اور محبت کی غیر فانی یادگار کو دیکھنا چاہتا تھا۔ دور سے دریا کے کنارے تاج محل کی سفید عمارت ایسے لگ رہی تھی جیسے کسی نے ہیرا تراش کر دریا کنارے رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلے ہم نے ممتاز محل کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ پھر تاج محل کی روشوں پر ٹہلتے رہے غیر ملکی سیاح اور مقامی لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ گرمیاں شروع ہونے والی تھیں۔ دوپہر کے وقت دھوپ میں کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ رات کو معمولی سی خنکی ہو جاتی تھی۔ ہم ایک سرسبز قطعے میں گلاب کے پھولوں کی کیاری کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پروین کہنے لگی۔

"جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے میرے دل کو ایک عجیب سکون محسوس ہو رہا ہے میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی۔"

میں نے کہا۔ "اللہ نے تم پر خاص فضل کیا ہے۔ واقعی تم خوش نصیب ہو کہ دین اسلام کے نورانی حلقے میں آ گئی ہو۔"

پروین نے نئی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر جالی دار دوپٹہ تھا۔ اس لباس میں وہ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس کا رنگ اب بھی جامنی تھا۔ مگر سانپوں کے ڈسوانے اور سانپوں کو کھانے سے اسے نجات مل چکی تھی۔ اس کی صحت پہلے سے کافی بہتر ہو رہی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"ہمارے پاس بہت سارے روپے جمع ہو گئے ہیں۔ ان کا ہم کیا کریں گے؟"

پروین کہنے لگی۔

"ہمیں تو اتنے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ اپنی ضرورت کے کچھ روپے ضرور رکھ لیں گے۔"

پھر اس نے اچانک میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کیا تم واقعی پاکستان چلے جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "خیال تو یہی ہے کہ تمہیں کلکتے کی سیر کروانے کے بعد پاکستان چلا جاؤں گا لیکن چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے تمہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دوں۔"

"وہ محفوظ جگہ کونسی ہو سکتی ہے؟" پروین نے سوال کیا۔

میں سوچنے لگا کہ اس کے سوال کا کیا جواب دوں۔ جواب تو یہی ہو سکتا تھا کہ پروین کسی شریف آدمی سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لے اور میں اطمینان کے ساتھ اپنے وطن چلا جاؤں مگر میں اس بارے میں اسے کوئی رائے یا مشورہ دیتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسی جگہ جہاں تم باقی زندگی سکون سے بسر کر سکو۔ تم پڑھی لکھی ہو کلکتہ تمہارا اپنا شہر ہے۔ تم وہاں کسی اسکول میں ٹیچر کیوں نہیں لگ جاتیں۔ اس طرح تم لیڈیز ہوسٹل میں بھی رہ سکو گی۔"

پروین نے سر نیچے کر لیا اور انگلی سے زمین پر اگی ہوئی گھاس اکھیڑتے ہوئے بولی۔

"ہو سکتا ہے کبھی مجھے ایسا ہی کرنا پڑے۔"

میں نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"پروین! سچ کہتا ہوں جب میں نے سانپ کے روپ میں تمہارے جسم کے ٹکڑے اٹھائے تھے تو مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ تم دوبارہ زندہ ہو جاؤ گی۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں اب میں انسانی شکل میں کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔"

پروین مسکرائی۔

"بس یہ سانپوں کی دنیا کی باتیں ہیں پہلے مجھے بھی کچھ معلوم نہیں تھا مگر سنتھالی کے سپیروں میں رہ کر میں نے سب کچھ سیکھ لیا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اگر خدا نہ کرے اب تم کسی وقت مجھ سے اچانک جدا ہو گئیں تو میں تمہیں کیسے اور کہاں تلاش کروں گا؟ مجھے کوئی ایسی نشانی بتا دو کہ جس کی مدد سے مجھے تمہارا سراغ مل جائے۔"

پروین ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"انسان کے جسم سے ہر وقت حرارت کی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ ان لہروں کی ایک خاص خوشبو ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے جسم سے نکلنے والی لہروں کی خوشبو الگ ہوتی ہے۔ اس خوشبو کو عام انسان محسوس نہیں کر سکتا جب کہ یہ خوشبو دنیا کی فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ سانپ اس خوشبو کو بڑی جلدی محسوس کر لیتا ہے۔ خاص طور پر میری خوشبو سانپ فوراً سونگھ لیتا ہے چاہے وہ مجھ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔ تمہیں بھی ایک سانپ ہی ناگ پور میں مجھ تک لایا تھا۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے کہ اگر تم مجھ سے جدا کر دی جاؤ تو میں تمہارا سراغ لگا سکوں؟"

پروین نے کہا۔ "میں تمہیں ایک خاص منتر بتاتی ہوں اگر ہم پر کسی وقت کوئی مصیبت پڑ گئی اور میں تم سے جدا ہو گئی تو جو منتر میں تمہیں بتانے والی ہوں اس منتر کو کسی ویران علاقے میں جا کر تین بار پڑھنا۔ پھر زمین پر تین بار ہاتھ مارنا اس علاقے میں جو کوئی سانپ بھی ہو گا وہ اپنے بل سے نکل کر تمہارے پاس آ جائے گا۔ تم اسے میرا رومال سنگھا دینا۔ پھر وہ تمہیں وہاں لے آئے گا جہاں میں ہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے وہ منتر یاد کرا دو۔"

پروین بولی۔ "منتر زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہے۔ صرف تین لفظ ہیں جن کو تمہیں تین بار دہرانا ہو گا۔ غور سے سنو۔ میں تمہیں وہ خاص منتر بتاتی ہوں۔"

اس کے بعد پروین نے مجھے وہ خاص منتر بتایا۔ یہ منتر مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں یہ منتر آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ اگر آپ نے یہ منتر تین بار پڑھ کر زمین پر تین مرتبہ ہاتھ مارا تو اس علاقے میں جہاں کہیں بھی کوئی سانپ ہو گا وہ نکل کر آپ کے سامنے آ جائے گا اور آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

میں نے وہ تین لفظ منتر کے جو پروین نے مجھے بتائے اچھی طرح سے یاد کر لیے۔ وہ کہنے لگی۔

"میرے رومال کو جس میں میرے جسم کی بو ہے سنبھال کر رکھنا۔ کیونکہ اس رومال کو سونگھ کر ہی سانپ میری تلاش میں نکلے گا۔"

میں نے کہا۔ "اگر خدانخواستہ رومال گم ہو گیا یا پھٹ پھٹا گیا تو اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟ پھر تو میں تمہیں کبھی نہیں تلاش کر سکوں گا۔"

پروین کچھ دیر چپ ہو کر غور کرتی رہی۔ اس کے بعد میری طرف چہرہ اٹھا کر بولی۔

"پھر تم ایسا کر سکتے ہو کہ جب سانپ تمہارے

سامنے آجائے تو تم منتر کے وہی تین لفظ پڑھ کر سانپ کے منہ پر پھونک مار دینا۔ سانپ کو میری خوشبو آجائے گی۔"

"یہ تم نے بڑی اچھی بات مجھے بتادی۔ بس اب مجھے اطمینان ہوگیا ہے۔ چلو شہر چل کر کسی اچھے سے ریستوران میں کافی پیتے ہیں۔ ایک مدت ہوگئی ہے کسی اعلیٰ قسم کے ریستوران میں بیٹھ کر کافی پیے ہوئے۔"

"ہاں، یہ تم نے بالکل درست کہا۔ ہم تو بس جنگلی لوگوں کی طرح جنگلوں صحراؤں میں ہی دربدری کرتے رہے ہیں۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ آگرہ شہر کے کسی کلاس ون ریستوران میں بیٹھ کر کافی پی سکیں۔"

ہم نے تاج محل کے باہر جہاں ٹیکسی اسٹینڈ تھا وہاں سے ایک ٹیکسی لی اور اسے آگرہ شہر کے سب سے اعلیٰ ریستوران میں چلنے کو کہا۔ ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب ہی ایک آدمی اسٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے پرانی کانگریسی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہماری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے سوچا اس ملک کے لوگ عورتوں کی طرف غور سے دیکھا ہی کرتے ہیں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور ٹیکسی میں پروین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔

جب ٹیکسی آگرہ شہر کے بازاروں میں آئی تو ڈرائیور نے کہا۔

"صاحب! یہاں ایک کیلاش ریستوران ہے وہاں کی کافی اور رس گلے سارے شہر میں مشہور ہیں۔ آپ کو وہاں نہ لے چلوں؟"

پروین بنگالن تھی۔ رس گلوں کا سن کر بے تاب ہو کر بولی۔

"ہاں ہاں، وہیں لے چلو۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ایک مدت کے بعد رس گلوں کا نام سنا ہے۔ کافی کے ساتھ رس گلوں کا بڑا مزا آئے گا۔"

کیلاش ریستوران شہر کے فیشن ایبل علاقے میں واقع تھا۔ بڑا ماڈرن قسم کا ریستوران تھا۔ فرنیچر خوب چمک رہا تھا۔ میں اور پروین کونے والی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ اور لوگ بھی بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ فضا میں بڑی پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے رس گلوں اور کافی کا آرڈر دیا اور جیب سے بڑی اعلیٰ قسم کا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ پروین مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں بیرا کافی اور رس گلے لے کر آ گیا۔ رس گلے واقعی بڑے لذیذ تھے۔ پروین کہنے لگی۔

"مگر ہمارے بنگال میں جیسے رس گلے بنتے ہیں ویسے نہیں ہیں۔"

پروین میرے لیے کافی بنانے لگی۔ کافی بناتے بناتے اچانک وہ رک گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے پروین؟"

پروین ایسے سانس لے رہی تھی جیسے فضا میں کوئی خاص قسم کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

اور اس نے کافی بنا کر مجھے دی۔ پھر اپنے لیے کافی بنائی۔ ہم کافی پینے اور باتیں کرنے لگے۔ لیکن مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ پروین فضا میں کیا سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ یونہی ایسا نہیں کر رہی تھی۔ اس کو فضا میں ضرور کوئی خاص بو محسوس ہوئی ہوگی۔ میں نے کافی کا گھونٹ پینے کے بعد پیالی نیچے رکھی اور سگریٹ کا کش لگانے لگا تو اچانک میری

نظر ریستوران کے دروازے پر پڑی۔ وہاں مجھے وہی کھدر کی کانگریسی ٹوپی والا آدمی نظر آیا جس کو میں نے تاج محل کے ٹیکسی اسٹینڈ پر دیکھا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ یہ شخص یہاں کیسے پہنچ گیا؟ کہیں یہ ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا؟ میرا خیال دلی میں ہم پر لگائے گئے چوری کے الزام اور پھر حوالات میں ہمیں بند کر دینے کی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ سی آئی ڈی کا آدمی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے دلی پولیس نے آگرہ پولیس کو خبردار کر دیا ہو کہ ایک لڑکا اور لڑکی جن پر چوری کا الزام تھا حوالات سے فرار ہوگئے ہیں۔ اگر نظر آ جائیں تو انہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ پھر سوچا کہ دلی پولیس اسٹیشن کے پاس تو ہماری کوئی تصویر نہیں تھی۔ جو وہ آگرہ کی پولیس کو بھیجتے۔ پھر یہ آدمی ریستوران میں کیسے آ گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کاؤنٹر پر جا کر ریستوران کے منیجر سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے بیڑی سلگائی اور ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران پروین کافی پی رہی تھی۔ اس نے ایک دم سے ٹھٹک کر کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور دو تین گہرے سانس لیے۔

میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے پروین؟ تم کیا سونگھ رہی ہو؟"

پروین نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

"مجھے ایک غیر مانوس سی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

"کس قسم کی بو؟" میں نے پوچھا۔ "کیا یہ کسی سانپ کی بو ہے؟"

پروین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، سانپ کی بو نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی بو ہے لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ یہ خطرناک بو ہے۔ چلو، اٹھو چلتے ہیں۔ یہاں میرا جی گھبرانے لگا ہے۔"

میں نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ میری نظریں ریستوران کے کاؤنٹر کی طرف گئیں۔ وہ کانگریسی ٹوپی والا پراسرار آدمی اب وہاں نہیں تھا۔ ہم بل ادا کر کے ریستوران سے باہر آ گئے۔ باہر آ کر میں نے پروین سے پوچھا۔

"ایسا لگتا ہے تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو۔ آخر تمہیں کیا محسوس ہوا تھا؟" پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں ناگن بھی ہوں اور ہم ناگنوں کو فضا میں بعض اوقات عجیب عجیب بوئیں محسوس ہوتی ہیں۔ چلو اپنے ہوٹل میں چلتے ہیں۔"

ہم نے ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے خاص طور پر چاروں طرف نگاہ دوڑائی تھی مگر وہ پراسرار آدمی مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے پروین سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی کہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہوگی۔

میں نے ہوٹل کے کمرے میں آ کر پروین سے پوچھا۔

"چاندنی رات میں تاج محل کی سیر کا پروگرام ہے یا اسے ملتوی کر دیا ہے؟"

پروین نے فوراً جواب دیا۔

"کیوں نہیں۔ آج تو پورن ماشی کی رات ہے پورا چاند نکلے گا۔ ہم آج رات تاج محل دیکھنے ضرور جائیں گے۔"

دوپہر میں ہم کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ تیسرے پہر اٹھے۔ چائے پی اور اخبار رسالے پڑھنے اور باتیں کرنے میں مصروف ہوگئے۔ رات کا کھانا بھی ہم نے کمرے میں منگوا کر ہی کھایا۔ جب رات کے دس بج گئے اور آسمان پر پورا چاند نکلنے لگا تو ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر تاج

محل کی طرف چل دیے۔

تاج محل تو چاندنی رات میں نگینے کی طرح چمک رہا تھا۔ وہاں بہت لوگ چاندنی میں اس تاریخی عمارت کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے۔ ہم ایک روش پر کھڑے ہو کر تاج محل کی حسین عمارت کو دیکھنے لگے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم خواب کی دنیا میں آ گئے ہیں۔ پروین کہنے لگی۔

''کتنی خوش قسمت تھی ممتاز محل کہ اس کے خاوند نے اس کے لیے تاج محل بنوایا جس کو دیکھنے کے لیے دنیا کے کونے کونے سے لوگ آتے ہیں۔''

میں نے کہا

''ممتاز محل کا خاوند ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ وہ جو چاہے بنا سکتا تھا۔''

پروین بڑے جذباتی انداز میں کہنے لگی۔

''نہیں نہیں' اصل بات محبت کی ہوتی ہے۔ شاہجہاں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔''

ہم تاج محل کے پہلے چبوترے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک وردی پوش گائیڈ ہمارے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔

''صاحب جی! اگر آپ میاں بیوی ہیں تو باری باری تاج محل کے پہلے مینار کا ایک چکر لگائیں۔ آپ ساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔''

پروین پہلے ہی بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''ہم ضرور چکر لگائیں گے۔ پہلے میں چکر لگاؤں گی۔''

گائیڈ خوش ہو کر بولا۔

''آپ بڑی خوش قسمت ہیں۔ کہتے ہیں جو عورت اپنے خاوند سے پہلے چکر لگائے۔ وہ اپنے خاوند کا ساری زندگی بھرپور پیار حاصل کرتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

گائیڈ بولا۔

''نہیں بابو جی! بیگم صاحب کو اکیلے ہی چکر لگانے دیں۔ ورنہ مینار کی دعا کا اثر ختم ہو جائے گا۔''

پروین اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے کہا۔

''نہیں نہیں' تم میرے بعد چکر لگانا میں ابھی چکر لگا کر آتی ہوں۔''

پروین گائیڈ کے ساتھ تاج محل کے پہلے مینار کی طرف چل پڑی۔ یہ مینار کوئی سو قدم کے فاصلے پر تھا اور مجھے اس کا صرف سامنے والا حصہ ہی چاندنی میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے درختوں کے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے پروین سے کہا۔

''دیر نہ لگانا۔''

وہ بولی۔ ''ابھی آتی ہوں۔ تم یہیں بیٹھے رہنا۔''

میں نے کچھ اور لوگوں کو بھی دیکھا جو مینار کا چکر لگا رہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے۔ عورتیں بھی تھیں۔ میں اس قسم کے توہمات کا قائل نہیں ہوں مگر پروین کی ضد اور اس کے شوق کی وجہ سے خاموش رہا۔ میں پروین کو گائیڈ کے ساتھ جاتے دیکھتا رہا۔ مینار کے پاس جا کر پروین دوسری طرف مڑ گئی۔

میں نے سگریٹ سلگا لیا اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے پروین کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ واپس آ کر وہ مجھے بھی چکر لگانے پر مجبور کرے گی۔ میرا دل تو بالکل نہیں چاہتا تھا لیکن محض پروین کی خاطر میں نے سوچ لیا کہ مینار کا ایک چکر لگا لوں گا۔ چاندنی رات بڑی خوب صورت تھی۔ جو لوگ چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ کرنے آئے تھے وہ ادھر ادھر چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے خواب میں چل رہے ہوں۔ میرا سگریٹ ختم ہو گیا۔ میں نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر سنگ مرمر کے

کشادہ چبوترے پر ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

میرا دوسرا سگریٹ بھی ختم ہو گیا۔ پروین ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ گائیڈ کے کہنے کے مطابق اسے مینار کا صرف ایک ہی چکر لگانا تھا۔ اب تک اسے واپس آ جانا چاہیے تا۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے سگریٹ پھینکا اور مینار کی طرف چلنے لگا کہ جا کر دیکھوں پروین نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ مینار کے پاس جا کر میں نے ادھر ادھر دیکھا پھر مینار کا چکر لگایا۔ پروین مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ وہاں ایک عورت اور ایک مرد چکر لگا رہے تھے۔ جب وہ چکر لگا چکے تو میں نے ان سے پروین کے بارے میں پوچھا جس پر انہوں نے کہا کہ اس حلیے اور لباس کی عورت انہوں نے یہاں نہیں دیکھی۔ وہ گائیڈ بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ ایک طرف ایک آدمی پتھر کی سیڑھی پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''یہاں ایک گائیڈ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک عورت کے ساتھ آیا تھا وہ کہاں چلا گیا؟''

وہ آدمی کہنے لگا۔

''رات کو یہاں کسی گائیڈ کی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔''

میں نے کہا۔ ''اس نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ کہتا تھا میں گائیڈ ہوں۔ وہ میری بیوی کو مینار کا چکر لگانے کے لیے لے گیا تھا۔''

وہ آدمی بولا۔

''میں یہاں کا چوکیدار ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ رات کو کبھی کسی گائیڈ کی ڈیوٹی نہیں لگتی۔ آپ کو کسی نے دھوکا دیا ہے۔''

میں نے اسے گائیڈ اور پروین کا حلیہ بتایا۔ چوکیدار کہنے لگا۔

''میں بڑی دیر سے یہاں بیٹھا ہوں۔ میں نے اس حلیے کا کوئی گائیڈ اور کوئی عورت نہیں دیکھی۔''

میں سخت پریشان ہوا۔ ضرور وہ آدمی پروین کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ مگر پروین کو اتنے لوگوں کے درمیان سے اغوا کرنا آسان نہیں تھا اور پھر پروین زبردست طاقت رکھتی تھی۔ وہ ناگن بن کر اغوا کرنے والے کو ہلاک کر سکتی تھی۔ نہیں' نہیں' میں نے اپنے دل سے کہا۔ ایسا نہیں ہوا پروین ضرور یہیں کہیں ہو گی ممکن ہے وہ دوسرے مینار کا چکر لگانے چلی گئی ہو۔ میں تیز تیز قدموں سے دوسرے مینار کے پاس گیا۔ وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس قسم کے چکر صرف اسی مینار کے پاس لگائے جاتے تھے۔ جس طرف وہ گائیڈ پروین کو لے کر گیا لیکن میں نے دوسرے مینار کے آس پاس بھی پروین کو تلاش کیا۔ اس طرح میں تیسرے اور چوتھے مینار پر بھی گیا۔ میں نے سارے کا سارا تاج محل چھان مارا۔ جگہ جگہ دیکھا' جھاڑیوں اور باغیچوں میں تلاش کیا مگر پروین کو تو جیسے زمین کھا گئی تھی۔ سخت مایوسی اور پریشانی کی حالت میں واپس آ کر اسی چبوترے پر بیٹھ گیا جہاں پہلے بیٹھا تھا۔

ذہن انتہائی الجھ گیا تھا۔ دل میں طرح طرح کے خدشے اور وسوسے پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے پھر مجھے خیال آنے لگا کہ پروین نے دوبار کوئی خوشبو محسوس کی تھی جس کے بارے میں اس نے تشویش کا اظہار کیا تھا۔ کہیں کوئی دشمن تو اس کے پیچھے نہیں لگ گیا تھا؟ مگر ایسا دشمن کون ہو سکتا تھا؟ اچانک مجھے اس پراسرار آدمی کا خیال آ گیا جس کو میں نے پہلے دن کے وقت تاج محل کے ٹیکسی اسٹینڈ پر اور پھر کیلاش ریسٹوران میں دیکھا تھا۔ میں ان ہی پریشان کن خیالات میں الجھا وہاں بیٹھا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

پولیس کا ایک سپاہی میرے پیچھے کھڑا کہنے لگا۔

"بابو! تاج محل کا گیٹ بند ہونے والا ہے ٹائم ہوگیا ہے۔ اب جاؤ' کل رات آ کر دیکھنا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ تاج محل دیکھنے آیا تھا۔ وہ ایک گائیڈ کے ساتھ مینار کا چکر لگانے گئی تھی پھر واپس نہیں آئی۔ سپاہی بولا۔

"گائیڈ کے ساتھ تم نے اپنی بیوی کو کیوں بھیج دیا؟ عورتیں تو کونے والے مینار کا اکیلی ہی چکر لگاتی ہیں۔ کوئی گائیڈ انہیں ساتھ لے کر نہیں جاتا۔"

میں نے کہا۔ "میں دلی سے آیا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ گائیڈ میری بیوی کو غائب کر دے گا۔ کیا یہاں کوئی سرکاری دفتر نہیں ہے جہاں سے مجھے گائیڈ کے بارے میں پتہ چل سکے کہ وہ کون تھا اور کہاں رہتا ہے؟"

سپاہی نے کہا۔

"بھیا! پہلی بات تو یہ ہے کہ تاج محل پر رات کے وقت کسی سرکاری گائیڈ کی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔ کیا معلوم وہ کون بدمعاش تھا جو گائیڈ کی وردی پہن کر تمہارے پاس آیا اور تمہاری بیوی کو لے اڑا۔ ایسا کرو' تم میرے ساتھ تھانے چلو۔ تھانے میں رپٹ درج کرادو پولیس تمہاری بیوی اور گائیڈ کو خود ہی تلاش کر لے گی۔"

میں پولیس اسٹیشن نہیں جانا چاہتا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں الٹا پولیس مجھے ہی نہ پکڑ لے کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ دلی کی حوالات سے بھاگے ہوئے مجرم ہو۔ میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں جہاں ٹھہرا ہوا ہوں وہاں جا کر دیکھتا ہوں شاید میری بیوی وہاں پہنچ گئی ہو۔"

سپاہی چاندنی رات میں مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں وہاں سے تاج محل کے بڑے احاطے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ سب لوگ جو چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے واپس جا رہے تھے۔ میں شکستہ دل تھا۔ ذہن ایک خلفشار کا شکار تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پروین کہاں اور کیسے غائب ہوگئی۔ میں ٹیکسی اسٹینڈ پر آ کر کھڑا ہوگیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کہ سارے لوگ وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو نہیں چلے گئے۔ وہاں صرف ایک ٹیکسی خالی رہ گئی تھی۔ ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔

"بابو شہر چلنا ہے تو آ جاؤ۔ میں جا رہا ہوں پھر یہاں سے کوئی سواری تمہیں نہیں ملے گی۔"

میں بوجھل قدم اٹھاتا اور بار بار تاج محل کے مینار کی طرف دیکھتا ٹیکسی میں آ کر بیٹھ گیا۔

"کہاں چلیں گے بابو جی؟"

میں نے اپنے ہوٹل کا نام لیا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کب گاڑی وہاں سے چلی۔ کن کن بازاروں اور سڑکوں سے گزری اور کب ہوٹل کے پورچ میں آ کر رک گئی۔ سارا راستہ اسی خیال میں ڈوبا رہا کہ پروین کو کس نے اغوا کیا ہوگا۔ کیا وہ پراسرار آدمی جس نے کانگریسی کیپ پہنی ہوئی تھی اور جو میرے خیال کے مطابق ہمارا پیچھا کر رہا تھا کہیں یہ ساری مصیبت اسی کی وجہ سے تو نہیں پیدا ہوئی۔ مگر اس وقت تو وہ وہاں کہیں نہیں تھا۔ صرف گائیڈ میرے پاس آیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گائیڈ بھی اسی کا بھیجا ہوا آدمی ہو مگر سوال یہ ہے کہ پروین کو اتنی جلدی اغوا کیسے کر لیا گیا کہ وہ ایک آواز بھی بلند نہ کر سکی۔ وہ مجھے مدد کے لیے بھی نہ بلا سکی۔ وہ تو بڑی جلدی ناگن کا روپ بدل کر گائیڈ کو ہلاک کر سکتی تھی۔ اسے سانپ بننے کے لیے صرف تین سانس ہی کھینچنے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ پروین کو ضرور کلوروفارم بلکہ اس سے تیز کوئی بے ہوشی کی دوائی سنگھائی گئی تھی کہ جس کو سونگھتے ہی وہ بے ہوش ہوگئی۔

میں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا یہی کچھ سوچتا رہا۔ ساری رات میں نے جاگ کر گزار دی۔ آخر میں نے وہی فیصلہ کیا جس کے بارے میں مجھے خوش قسمتی سے آگرہ میں پہنچتے ہی پروین نے بتا دیا تھا۔ یعنی اب مجھے ایک سانپ کو منتر پڑھ کر بلانا اور اسے پروین کا رومال سنگھا کر پروین کی تلاش کے لیے روانہ کرنا تھا۔ دن نکلتے ہی میں تاج محل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس خیال سے کہ شاید وہاں پروین کا کوئی سراغ مل جائے۔ اگر سراغ نہ ملا تو وہیں سے کسی سانپ کو بلا لوں گا کیونکہ تاج محل دریا کے کنارے پر واقع تھا اور وہاں اکثر علاقہ ویران تھا اور ایسی جگہوں پر سانپ اکثر پائے جاتے ہیں۔

دن کی روشنی میں تاج محل چاندنی رات والے تاج محل سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ میں تیسرے مینار کے پاس آ گیا۔ میں زمین پر جھک کر دیکھنے لگا کہ شاید پروین کی کوئی چوڑی وغیرہ وہاں ٹوٹی ہوئی پڑی ہو مگر وہاں کوئی ایسی شے نہیں تھی۔ آخر میں تاج محل کی عمارت کے عقب میں ایک ویران جگہ پر چلا گیا۔ یہاں بنجر زمین تھی اور خشک جھاڑیاں کہیں کہیں اگی ہوئی تھیں۔ میں ایک جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ پروین کے بتائے ہوئے منتر کے تینوں لفظ مجھے زبانی یاد تھے۔ میں نے تینوں الفاظ تین بار قدرے اونچی آواز میں دہرائے اور پھر زمین پر تین بار ہاتھ مارا۔ اس کے بعد متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ سانپ آیا ہے یا نہیں۔ دس پندرہ سیکنڈ گزر گئے۔ کسی طرف سے کوئی سانپ نہ آیا۔ میں دوسری بار منتر پڑھ کر پھونکنے والا تھا کہ اچانک مجھے اپنے پیچھے سے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک نسواری رنگ کا بالشت بھر کا سانپ میرے پیچھے اپنا چھوٹا سا پھن اٹھائے میری طرف منہ کیے پھنکار رہا تھا۔ میں پروین کی ہدایت کے مطابق اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگ کر میرے قریب آ گیا۔ میں نے جیب سے پروین کا رومال نکال کر اس کی طرف پھینکا۔ سانپ نے رومال پر منہ رکھ دیا۔ پھر فوراً پیچھے ہٹ گیا تین بار رومال کے آگے سر جھکایا اور ایک طرف آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا۔

میں جلدی سے اٹھا۔ پروین کا رومال اٹھا کر جیب میں ڈالا اور سانپ کے پیچھے چلنے لگا۔ سانپ اس طرف جا رہا تھا جدھر دریا کا کنارا تھا۔ مجھے خیال آیا اگر سانپ دریا میں اتر گیا تو میں کیا کروں گا؟ یہاں تو کوئی کشتی بھی نہیں ملے گی۔ سانپ تو پانی پر تیر سکتا ہے۔ میں بھی تیر سکتا تھا مگر کپڑوں سمیت دریا میں نہیں کودنا چاہتا تھا۔ دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ سانپ دریا میں نہ اترے۔ نسواری سانپ دریا کے کنارے پہنچ کر رک گیا۔ اس نے گردن اوپر اٹھائی۔ دائیں بائیں گھمائی۔ زبان بار بار باہر نکال کر پروین کی بو کو محسوس کیا اور جدھر سے بو آ رہی تھی اس طرف چلنے لگا۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک چلتا گیا۔ پھر اس نے دریا کے کنارے سے ہٹنا شروع کر دیا اور بنجر زمین پر نکل آیا۔ یہ کلر زدہ زمین تھی۔ سانپ ایک خاص آہستہ رفتار کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

کلر زدہ میدان ختم ہوا تو سامنے ایک گاؤں آ گیا۔ بستی کے کچے مکان دھوپ میں صاف نظر آ رہے تھے۔ سانپ گاؤں میں داخل نہیں ہوا بلکہ گاؤں کے باہر ہی باہر سے گزر گیا۔ سامنے سے دو دیہاتی آ رہے تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں یہ سانپ کو دیکھ کر ہلاک نہ کر دیں۔ میں چوکس ہوگیا کہ

اگرانہوں نے سانپ کو مارنا چاہا تو میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ شاید سانپ نے بھی سامنے سے آتے آدمیوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک طرف جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میں وہاں کھڑا ہو گیا۔ دونوں دیہاتی باتیں کرتے مجھ پر ایک نظر ڈالتے گزر گئے۔ ان کے جانے کے بعد سانپ جھاڑیوں میں سے نکل آیا اور کچے راستے پر چل پڑا۔ میرا اور سانپ کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ قدموں کا ہوگا۔ چونکہ یہ آباد علاقہ تھا۔ کھیت بھی تھے اس لیے دیہاتی لوگوں کی آمد ورفت جاری تھی۔ جونہی سامنے سے کوئی آدمی آتا نظر آتا سانپ جلدی سے کسی طرف چھپ جاتا۔ اس طرح میں اور سانپ آبادی والے علاقے سے نکل کر غیر آباد علاقے میں آگئے۔

سانپ میرے آگے آگے زمین پر بل کھاتا رینگتا چلا جا رہا تھا۔ ہم ایک خشک نال کے پل پر سے گزر کر اس کی دوسری جانب آئے تو سامنے کچھ فاصلے پر چند ایک کچے مکان دکھائی دیئے۔ میرا خیال تھا سانپ ان مکانوں سے بچ کر دوسری طرف سے ہو کر نکل جائے گا مگر میں یہ دیکھ کر کچھ حیران ہوا کہ سانپ کا رخ ان مکانوں کی طرف ہی تھا۔ یہ ایک اونچے ٹیلے کے دامن میں ادھر ادھر بنے ہوئے چار پانچ جھونپڑی نما کچی دیواروں والے مکان تھے۔ آگے ایک چھوٹا سا جوہڑ تھا۔ ایک بوڑھا جوہڑ کے کنارے بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ میں اور سانپ اس سے کچھ فاصلے پر سے ہو کر گزر گئے۔ سانپ اب تیز تیز چل رہا تھا۔ وہ ایک مکان کے سامنے جا کر رک گیا اور پھن اٹھا کر زور زور سے پھنکارنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ پروین اسی مکان میں بند ہے۔ کچے مکان کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی کون ہو؟ میں نے کہا۔

''ذرا باہر آئیں۔''

دروازہ کھلا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ وہی کانگریسی ٹوپی والا آدمی تھا جو میرے خیال کے مطابق ہمارا پیچھا کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے اور کچھ گھبرا گیا ہے مگر وہ جلدی سنبھل گیا اور بولا۔

''کس سے ملنا ہے بھائی؟ کون ہو تم؟''

اس دوران سانپ میری ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر اس آدمی کی طرف حملہ کرنے کے لیے پھنکارتا ہوا بڑھا۔ وہ شخص چیخ مار کر کوٹھڑی میں گھس گیا اور سانپ سانپ کا شور مچا دیا۔ کوٹھری میں سے دو ہٹے آدمی نکل کر باہر آگئے۔ انہوں نے سانپ کو دیکھا تو ایک نے لاٹھی اٹھا کر پوری طاقت سے سانپ پر ماری۔ سانپ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اب وہاں تین آدمی تھے اور میں اکیلا تھا۔ کانگریسی ٹوپی والے آدمی نے غصے کے ساتھ پوچھا۔

''یہ سانپ تم اپنے ساتھ لائے تھے؟''

میں نے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم یہ کہاں سے آ گیا تھا مجھے تو پیاس لگ رہی تھی سوچا یہاں سے پینے کو پانی مل جائے گا۔ اس لیے دروازہ کھٹکھٹایا۔''

کانگریسی ٹوپی والے آدمی نے اپنے ساتھیوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔

''تم لوگ اندر جاؤ۔''

وہ دونوں اندر چلے گئے۔ کانگریسی ٹوپی والے نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا کہ یہاں پانی نہیں ہے۔ میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ سانپ کو دیکھا۔ اس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ سانپ مر چکا تھا۔ مجھے اس کی موت کا بڑا افسوس ہوا مرتے مرتے سانپ مجھے بتا گیا تھا کہ اسی گھر سے پروین کی بو آ رہی ہے۔ مجھے

یقین تھا کہ سانپ مجھے ٹھیک جگہ پر لایا ہے اور پروین یہیں کہیں ہے مگر میں اکیلا تھا اور وہ تین تھے۔ اگر میں ان سے الجھتا تو وہ بڑی آسانی سے مجھے بھی مار ڈالتے۔ دونوں ہٹے کٹے آدمی شکل سے ہی جرائم پیشہ قاتل لگتے تھے۔

میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے اگر میں ان لوگوں سے پروین کے بارے میں کچھ پوچھتا بھی تو یہ کبھی مجھے اس کے بارے میں نہیں بتائیں گے۔ سانپ نے مجھے اشارہ دے دیا تھا کہ پروین اگر ملے گی تو یہیں سے ملے گی۔ اگر خود اندر نہیں ہو گی تو یہاں سے اس کا سراغ ضرور مل جائے گا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے اس کانگریسی ٹوپی والے آدمی کا چھپ کر پیچھا کرنا چاہیے کہ یہ یہاں سے کہاں جاتا ہے۔ چنانچہ میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ جوہڑ کے پاس آیا تو بوڑھے کو حقہ پیتے دیکھ کر اس کے پاس آ گیا۔

اسے سلام کیا اس نے وعلیکم السلام کہہ کر حقہ منہ سے ہٹایا اور بولا۔

''کہو بھائی۔ مسافر ہو؟ کیسے آئے ہو؟''

میں اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور کہا۔

''ایک دوست کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ سامنے والے مکان میں رہتا تھا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ مکان چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اب وہاں کوئی اور ہی لوگ رہ رہے ہیں۔''

''کون سا مکان؟ وہ کونے والا؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

''جی ہاں وہی مکان۔''

بوڑھے نے ایک ہاتھ کان پر لگایا اور بولا۔

''بیٹا تم مسلمان ہو اس لیے تمہیں ضرور خبردار

کروں گا کہ آج کے بعد اس مکان کا رخ نہ کرنا۔"
میں نے پوچھا۔
"کیوں بابا؟ اس مکان میں کیا کوئی جن بھوت رہتے ہیں؟"
بوڑھا کہنے لگا۔
"بھائی یہ لوگ جن بھوتوں سے بھی بڑھ کر خطرناک ہیں۔ یہ جدی پشتی سپیرے ہیں۔ ان کے پاس کالے علم کا جادو بھی ہے۔ یہ ہندو ہیں اور راتوں کو مرگھٹوں میں جا کر جہاں تازہ تازہ ہندو مردہ جلایا گیا ہو وہاں بیٹھ کر چلے کاٹتے ہیں۔ چوریاں اور ڈاکے بھی ڈالتے ہیں۔ بستی کے لوگ تو ان کے قریب نہیں پھٹکتے۔"
میں نے مزید کریدتے ہوئے پوچھا۔
"بابا ان میں ایک آدمی سر پر کانگریس کی کھدر کی ٹوپی پہنے رکھتا ہے۔ وہ کون ہے؟"
بوڑھے نے کہا۔
"وہ ان کا سرغنہ ہے۔ اس کو تو سانپ بھی کاٹ لے تو کچھ نہیں ہوتا۔ سنا ہے ان کے پاس ایسے سانپ بھی ہیں جو زمین کے اندر چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ بتا دیتے ہیں۔"
میں نے کہا۔
"اگر یہ بات ہے تو پھر انہیں شاندار بنگلہ بنا کر رہنا چاہیے۔ اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں کیوں رہتے ہیں۔"
بوڑھا حقے کا کش لگا کر کہنے لگا۔
"بس ابھی کسی سانپ نے ٹھیک سے خزانے کا پتہ نہیں بتایا ہوگا۔ اور سنو ان کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اماوس کی اندھیری راتوں میں ہندو عورتوں کی بدروحیں ان سے ملاقات کرنے آتی ہیں۔ تم پھر اس مکان کے قریب نہ جانا۔ قسمت والے ہو کہ ان سے بچ کر آ گئے۔ ورنہ یہ لوگ تو نوجوان لڑکوں کو بھی جادو ٹونے سے اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔"
جتنی دیر میں بوڑھے کے پاس بیٹھا رہا میری نگاہیں برابر کونے والے مکان پر لگی رہیں۔ اس دوران مکان کا دروازہ بند رہا۔ نہ کوئی باہر نکلا اور نہ کوئی باہر سے اندر گیا۔ مجھے سانپ کے مرنے کا بہت افسوس تھا پھر سوچا کہ پروین نے مجھے دوسری ترکیب بھی بتا دی ہے۔ اس ترکیب پر عمل کر کے کسی دوسرے سانپ کی راہ نمائی حاصل کر لوں گا۔ میں تھوڑی دیر بوڑھے کے پاس بیٹھ کر سلام کر کے واپس چل دیا۔
پروگرام یہ بنایا کہ اوپر سے چکر کاٹ کر مکان کے پیچھے کی طرف آ کر کسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاؤں گا اور ان لوگوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کروں گا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ پروین اس مکان میں کسی جگہ بے ہوش پڑی ہے۔ میں سیدھا چلتا گیا پھر آگے سے چکر لگا کر کچے مکانوں کے عقب میں آ گیا۔ اس طرف کھیت تھے۔ جس مکان سے سانپ کو پروین کی بو آئی تھی اس کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک درخت اگا ہوا تھا جس کی شاخیں مکان کی چھت پر بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ میں کھیت کے کونے میں آ کر رک گیا اور مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ کھیتوں میں ایک آدمی ہل چلا رہا تھا مگر وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں آہستہ آہستہ چل کر مکان کے پچھواڑے والے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ آس پاس کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں درخت پر چڑھ گیا اور اس کی شاخوں کو پکڑتا ہوا مکان کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ چھت پر اترنے کے بعد میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ چھت کے کونے میں مرغیوں کا ڈربا بنا ہوا تھا مگر اندر کوئی مرغی نہیں تھی۔ میں جھک کر چلتا ڈربے کے پاس آیا اور گردن آگے کر کے نیچے دیکھا۔ اس طرف

مکان کا دروازہ تھا۔
دروازہ اسی طرح بند تھا۔ میں نے بڑے غور سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی کہ شاید اندر جو لوگ بیٹھے ہیں ان کی باتیں سن سکوں مگر وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی ہوگی کہ دور سے کسی موٹر گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ میں سمجھا سڑک پر سے کوئی جیپ یا موٹر گاڑی گزر رہی ہوگی۔ مگر آواز قریب آتی گئی۔ میں نے چھت کی منڈیر پر سے سر اوپر کر کے دیکھا۔ ایک جیپ مکان کی طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ مکان کے باہر آ کر کھڑی ہوگئی۔ جیپ میں ایک ہٹا کٹا ڈرائیور بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے دو تین بار ہارن دیا۔ مکان کا دروازہ کھلا اور مکان کے اندر سے وہ تینوں آدمی باہر نکل کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ ان میں ایک وہی پراسرار کانگریسی ٹوپی والا تھا اور دوسرے دونوں ہٹے کٹے آدمی تھے جنہوں نے سانپ کو مارا تھا۔ انہوں نے جیپ میں تین پٹاریاں بھی رکھیں۔ یہ ایسی پٹاریاں تھیں جن میں سپیرے سانپ رکھا کرتے ہیں۔
میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ اتنے میں جیپ چل پڑی اور بستی سے نکل کر بڑی سڑک کی طرف روانہ ہوگئی۔ میں اگر نیچے مکان کے باہر بھی ہوتا تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں جیپ کے پیچھے دوڑ کر اس کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ جیپ آہستہ آہستہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں جلدی جلدی درخت پر سے اتر کر نیچے آیا۔ سامنے کی طرف آ کر مکان کے دروازے کو دیکھا جو چوپٹ کھلا تھا۔ میں کوٹھڑی میں داخل ہوگیا۔ کوٹھڑی کے فرش پر چیتھڑے سے بکھرے ہوئے تھے۔ ساری کوٹھڑی خالی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے گہرے گہرے لمبے لمبے تین چار سانس لیے کہ شاید مجھے پروین کی بو آ جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مایوس ہو کر مکان سے باہر آ گیا اور واپس اپنے ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ تاج محل کے پاس آ کر خیال آیا کہ کسی دوسرے سانپ کو بلا کر اس کی مدد حاصل کرنی چاہیے۔ دیکھتا ہوں وہ مجھے پروین کی بو سونگھ کر کس طرف لے جاتا ہے۔
میں وہیں زمین پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ تین بار پروین کا بتایا ہوا منتر پڑھا۔ پھر تین بار زمین پر ہاتھ مارے اور سانپ کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر انتظار کیا مگر کوئی سانپ نہ آیا۔ دوسری بار پھر منتر پڑھ کر پھونکا۔ اس بار بھی کوئی سانپ نہ آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس علاقے میں وہی نسواری رنگ کا ایک سانپ تھا جو مارا گیا ہے۔ میں اٹھ کر تاج محل کی طرف چلنے لگا۔ وہاں ٹیکسی اسٹینڈ پر آ کر ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل میں آ کر بستر پر گر پڑا۔ سخت مایوس تھا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ بادل ناخواستہ دوپہر کا کھانا کھایا اور پروین کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا کہ وہ کہاں ہوگی کس حال میں ہوگی۔ جن لوگوں سے مجھے اس کا سراغ ملتا تھا کم بخت وہ فرار ہو چکے تھے۔
رات اسی پریشانی اور بے چینی کے عالم میں گزر گئی۔ اگلے روز ٹیکسی پکڑ کر دوبارہ وہاں گیا جہاں سانپ مجھے لے کر گیا تھا۔ مکان اسی طرح خالی پڑا تھا۔ میں جوہڑ کی طرف آ گیا۔ بوڑھا وہاں پر نہیں تھا۔ میں واپس جا رہا تھا کہ سامنے سے وہی بوڑھا آتا نظر آیا۔ میں نے سلام کیا تو وعلیکم السلام کہہ کر بولا۔
"میاں تم پھر کیسے آ گئے؟ تم کس کی تلاش میں ہو؟ مجھے کھل کر بتاؤ۔"
میں بوڑھے کو کھل کر نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن حالات ایسی صورت اختیار کر گئے تھے کہ مجھے بوڑھے کو بتانا ہی پڑا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ

تاج محل کے مینار سے میری بیوی چاندنی رات میں غائب ہوگئی ہے اور مجھے شک ہے کہ یہ کانگریسی ٹوپی والے کا کام ہے۔ کیونکہ جب سے ہم دونوں آگرے میں آئے تھے یہ آدمی ہمارا پیچھا کررہا تھا۔
بوڑھا مجھے لے کر وہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔
''بھائی تم ہارے گئے۔ اپنی بیوی سے ہاتھ دھولو اور اب وہ تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ ان لوگوں نے اس بے چاری کو جانے کہاں کا کہاں پہنچادیا ہوگا۔''
میں نے بوڑھے سے کہا۔
''بابا! میں اپنی بیوی کو تلاش کرلوں گا۔ تم مجھے صرف اتنا بتادو کہ یہ لوگ مکان چھوڑ کر کہاں گئے ہوں گے؟ ان کا یہاں کوئی دوسرا ٹھکانہ بھی ہے؟''
بوڑھا بولا۔
''میاں ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس مکان میں بھی سال میں ایک آدھ بار ہی آتے ہیں۔ ہاں تم ایسا کرو کہ یہاں سے سیدھا پھلواندی کے پل پر چلے جاؤ۔ پل کی دوسری طرف ایک ویران جگہ آئے گی وہاں ایک شمشان گھاٹ ہے۔ وہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی کبھی راتوں کو وہاں جاکر جادوٹونہ کرتے ہیں۔ چلہ بھی کاٹتے ہیں اور اپنے جادو ٹونے کے واسطے جلے ہوئے مردے کی ہڈیاں بھی تلاش کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے تمہیں یہ لوگ وہاں مل جائیں مگر رات کو جانا اور کوئی ہتھیار ساتھ لے کر جانا۔ کیونکہ یہ لوگ قتل بھی کردیتے ہیں۔''
میں بوڑھے کا شکریہ ادا کرکے اپنے ہوٹل میں آگیا۔ اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب رات کافی گہری ہوگئی تو میں ٹیکسی لے کر اس بستی کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ دن کے وقت بوڑھے نے مجھے جو راستہ پھلواندی کو جانے والا بتایا تھا اس طرف اندھیرے میں چلنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک ندی کا پل آگیا۔ بوڑھے نے کہا تھا کہ اس پل کی دوسری طرف شمشان گھاٹ ہے۔ میں پل کی دوسری طرف آگیا۔ یہ بڑی خوفناک جگہ تھی۔ ہر طرف موت کی خاموشی طاری تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک اونچی جگہ پر آگ دہکتی ہوئی نظر آئی۔ قریب جاکر دیکھا کہ یہی شمشان گھاٹ تھی۔ چبوترے پر کسی مردے کی لاش جل کر راکھ ہوچکی تھی۔ آگ کے شعلے غائب ہوگئے تھے۔ صرف انگارے دہک رہے تھے۔ میں نے گہری نگاہ سے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی انسان کیا جانور بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف جھونپڑی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چل کر جھونپڑی کے پاس آگیا۔ جھونپڑی کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ باہر مٹی کا ایک بڑا سا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ میں ٹاٹ کا پردہ اٹھاتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ خدا جانے پردہ اٹھانے پر اندر سے کیا چیز نکل کر مجھے چمٹ جائے۔
جھونپڑی میں سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے ہٹ گیا۔ جھونپڑی میں سے ایک جھکی ہوئی کمر والا بوڑھا آدمی کھانستا ہوا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں سلاخ تھی۔ وہ اس چبوترے کے پاس گیا جہاں مردے کو جلایا گیا تھا۔ وہ سلاخ سے آگ کریدنے لگا۔ میں دبے پاؤں چل کر اس کے قریب ایک طرف اندھیرے میں کھڑے ہوکر دیکھنے لگا۔ چتا پر انگارے دہک رہے تھے۔ اس نے انگاروں میں سے کسی چیز کو سلاخ سے نیچے گرادیا۔ پھر کندھے پر ڈالا ہوا کپڑا لے کر اس چیز کو اٹھالیا۔ وہ مردے کی کھوپڑی تھی۔ کھوپڑی کو کپڑے میں لپیٹ کر بوڑھا جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے چلنے

لگا تو میرے پاؤں تلے ایک پتھر پھسل گیا۔ آواز سن کر وہ وہیں رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس نے مجھے اندھیرے میں دیکھ لیا تھا۔ بڑی رعب دار آواز میں بولا۔
''کون ہو تم؟''
میں نے اس سے زیادہ رعب دار آواز میں کہا۔
''میں پولیس کا آدمی ہوں۔ تم مردے کی کھوپڑی نکال کر لے جارہے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں ایسا کرنا جرم ہے جس کی سزا سات سال قید ہے۔''
بوڑھے نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔
''مہاراج! مجھے شما کردیں۔ کسی نے کہا تھا کہ میرا بچہ بیمار ہے۔ تازہ جلے ہوئے مردے کی کھوپڑی لادو۔ اس میں پانی ڈال کر بیمار بچے کو پلاؤں گا تو وہ اچھا ہوجائے گا۔''
میں نے کہا۔
''تم جھوٹ بولتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ نہیں تو ابھی پکڑ کر تھانے لے جاؤں گا۔''
بوڑھا تو میرے قدموں پر گر پڑا۔
''حضور معاف کردیں۔ میں نے سچ بولا ہے میرا کوئی قصور نہیں۔ بیمار بچے کی خاطر کھوپڑی نکال کر لے جارہا تھا۔''
میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ اور بتاؤ یہاں اور کون کون لوگ جادو ٹونہ کرنے آتے ہیں۔''
بوڑھا بولا۔
''مہاراج! کبھی کبھی رات کو سپیرے لوگ یہاں آتے ہیں۔ وہ مردے کی دو تین ہڈیاں نکال کر چبوترے پر بیٹھ کر کچھ دیر منتر پڑھتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔''
''تمہیں معلوم ہے وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟''
''مہاراج بستی کی طرف سے آتے ہیں۔ میں نے منع کیا تو وہ کہنے لگے تجھے جان سے ماردیں گے۔ خبردار کسی کے آگے ذکر نہ کرنا۔''
بوڑھا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس سے مجھے مفید معلومات حاصل ہونے کی توقع بھی نہیں تھی۔ جو کچھ وہ بتاسکتا تھا اور جتنا کچھ اسے معلوم تھا اس نے مجھے بتادیا تھا۔ میں نے کہا۔
''ٹھیک ہے' آئندہ وہ لوگ یہاں آئیں تو تھانے میں آکر ہمیں خبردار کردینا۔''
''جو حکم مہاراج۔''
میں شمشان سے واپس چل پڑا۔
مجھے ایک سانپ کی ضرورت تھی جس کو پروین کا رومال سنگھا کر اسے اس کی تلاش میں روانہ کرسکوں۔ تاج محل کے ویران علاقے سے مجھے کوئی سانپ نہیں ملا تھا۔ آگرہ میں پرانے کھنڈروں کی کمی نہیں تھی۔ اگلے روز میں آگرہ کے پرانے قلعے کی طرف نکل گیا۔ قلعے کے آس پاس دو چار ٹوٹے پھوٹے کھنڈر تھے۔ میں ایک جگہ دیوار کی گری ہوئی پرانی اینٹوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھ گیا۔ وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے پروین کا سکھایا ہوا منتر تین بار پڑھا پھر زمین پر تین بار ہاتھ مارا اور سانپ کا انتظار کرنے لگا۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے ایک کالے رنگ کے سانپ کو دیکھا جو دوسرے کھنڈر کی طرف سے رینگتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ میں سانپ سے اس لیے نہیں ڈرتا تھا کہ میرے پاس پروین کا رومال تھا جس کی بو پاکر سانپ میرے سامنے ادب سے سر جھکا کر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کالا سانپ آہستہ آہستہ میرے قریب آکر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے پروین کا رومال

نکال کر اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ سانپ نے رومال میں آتی پروین کی تیز بو کو سونگھ کر زور سے پھنکار ماری اور پیچھے ہٹ کر ایک طرف دیکھنے لگا۔ وہ پرانے قلعے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ قلعے کی طرف چلنے لگا۔ میں نے پروین کا رومال جیب میں رکھا اور سانپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

کالا سانپ قلعے کے بہت بڑے محرابی دروازے کی دہلیز پر آ کر رک گیا۔ قلعے کا دروازہ آدھا زمین میں دھنس گیا تھا۔ سانپ نے منہ اوپر اٹھا کر پروین کی بو سونگھی اور قلعے کی ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا اندر ایک کھلے میدان میں آ گیا۔ یہ قلعے کا بہت بڑا اندرونی احاطہ تھا۔ تین طرف اونچی دیوار تھی۔ ایک جانب دو منزلہ ٹوٹی پھوٹی کوٹھریاں اور دالان نظر آ رہے تھے۔ کالا سانپ ایک طرف جا رہا تھا۔ یہاں ایک شکستہ زینہ قلعے کی دوسری منزل کو جاتا تھا۔ سانپ زینے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اوپر ایک دالان تھا۔ دالان کے فرش پر گرد جمی ہوئی تھی اور اینٹیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ دالان کی ایک جانب تین کوٹھریاں تھیں۔ کسی کوٹھری کا دروازہ سلامت نہیں تھا۔ سانپ ایک کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے کوٹھری میں آ گیا۔ یہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔

کالا سانپ کوٹھری کے کونے میں جا کر پھنکارنے لگا۔ میں اس کے قریب گیا تو دیکھا کہ وہاں ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ سانپ زینہ اترنے لگا۔ آگے پھر ایک دالان آ گیا اس دالان میں بھی ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ سانپ وہ زینہ بھی اتر گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی نیچے آ گیا۔ یہ زمین کے اندر ایک کشادہ جگہ تھی جہاں اونچی چھت کے دو بڑے سوراخوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ درمیان میں ایک پرانا تابوت پڑا ہے۔ سانپ اس تابوت کے سرہانے کی جانب فرش پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دھندلی روشنی میں تابوت کو غور سے دیکھا۔ لکڑی کے تابوت کی حالت بے حد شکستہ ہو رہی تھی۔ اس پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی اور مکڑیوں نے جگہ جگہ جالے بن رکھے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر سانپ مجھے یہاں لایا ہے تو اس تابوت کو کھول کر دیکھنا چاہیے۔ ممکن ہے اندر پروین بے ہوش پڑی ہو۔ وہ جرائم پیشہ قاتل سپیرے پروین کو بے ہوش کر کے اس تابوت میں ڈال گئے ہوں۔

تابوت کو تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کا ڈھکن اٹھایا تو ایسی چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوئی کہ میں خود بھی ڈر گیا۔ تابوت کا ڈھکن ذرا سا اوپر اٹھا اور پھر اچانک اپنے آپ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سانپ وہاں نہیں تھا۔ حیران ہوا کہ سانپ کہاں غائب ہو گیا۔ میں نے دوبارہ تابوت کو کھولنے کی کوشش کی مگر ڈھکن تابوت کیساتھ ایسا جڑ چکا تھا جیسے کسی نے کیل ٹھونک کر بند کر دیا ہو۔ میں وہاں سے واپس بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ سانپ یونہی مجھے وہاں نہیں لایا تھا۔ وہ یقیناً پروین کی بو کے پیچھے پیچھے چل کر یہاں آیا تھا۔ اس تابوت کے کھلنے سے پروین کی گمشدگی کا راز حل ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر پورا زور لگا کر تابوت کے ڈھکن کو کھولنا چاہا تو مجھے ایک عورت کی پرسکون مگر کمزور آواز سنائی دی۔

"میرے تابوت کو مت کھولو۔ تم اسے نہیں کھول سکو گے۔"

(باقی آئندہ ماہ)